مصنفہ
سیدہ حفیظۃ الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

سر است زیرِ تبر صادقاں مخلص را
کہ نازند سر قومے کہ در بلا باشد

یعنی سچّے مخلص لوگوں کا سر اس لئے تبر کے نیچے ہوتا ہے کہ تا قوم کا سر جو مشکلات میں مبتلا ہے رہائی پائے۔

(حضرت اقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیّہ)

مصنفہ

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

انتساب

وجۂ تخلیقِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام اپنی اس کاوش کو معنون کرتی ہوں جنہوں نے

اِنِّی لَقَدْ اُحْیِیْتُ مِنْ اِحْیَائِہٖ
وَاھًا لِاِعْجَازٍ فَمَا اَحْیَانِیْ (القصیدہ)

میں ہوں اُن لوگوں سے جن کو آپؐ نے زندہ کیا
واہ! کیا اعجاز ہے۔ زندہ کیا۔ اپنا لیا

جِسْمِیْ یَطِیْرُ اِلَیْکَ مِنْ شَوْقٍ عَلَا
یَا لَیْتَ کَانَتْ قُوَّۃُ الطَّیَرَانِ (القصیدہ)

میری روح تو ہر وقت تیرے آستانہ پر ہے اور میرا جسم محبت کے جوش میں تیری طرف اُڑ رہا ہے اے کاش! اس میں قوت پرواز ہوتی۔

اے میرے مولیٰ مجھے اب طاقتِ پرواز دے اور پر پرواز دے کر پیار سے آواز دے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

طالبۂ دعا

سیّدہ حفیظۃ الرحمٰن
بیگم میر مبارک احمد تالپور

”اسی طرح خداوندِ کریم نے بار ہا مجھے سمجھایا
کہ ہنسی ہو گی اور ٹھٹھا ہو گا اور لعنتیں کریں
گے اور بہت ستائیں گے لیکن آخر نصرتِ
الٰہی تیرے شاملِ حال ہو گی اور خدا دشمنوں
کو مغلوب اور شرمندہ کرے گا ......“

(روحانی خزائن جلد نہم صفحہ ۵۳، ۵۴)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ   نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

هُوَ النَّـــــــاصِر

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ○

(۲۰۸/البقرہ)

"یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے۔ اور اُس کے عوض خدا تعالیٰ کی مرضی خرید لیتا ہے یہ وہی لوگ ہیں جو خدا کی خاص رحمت کے مورد ہیں اور وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے اس کی روح بھی یہی ہے۔"

فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ

کیا ہی پیارے الفاظ ہیں جو شہادت کے وقت...... صحابیؓ کی دل کی گہرائیوں سے نکل کر آسمان کی رفعتوں کو جا چھوئے۔

حبیبِ کبریاء کی ایک دُعا

اے اللہ! ہمیں اپنی ایسی خشیت نصیب کر جو ہمارے گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے وہ اطاعت عطا فرما جو ہمیں تیری جنّت میں پہنچا دے اور وہ یقین دے جو دُنیا کے مصائب کو آسان کر دے۔ پروردگار ہمیں ہماری شنوائی، بینائی اور عطا کردہ قوتوں سے متمتع فرما اور ہمارے ورثاء کو بھی ان سے متمتع فرما۔ اور جو ہم پر تعدی کرے اس کے بالمقابل تو ہی مدد فرما اور ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال۔ دُنیا ہمارا بڑا فکر ہو نہ مبلغِ علم۔ اور ہم پر اُسے نہ مسلّط کیجیو جو ہم پر رحم نہ کرے۔

(ترمذی ابواب الدعوات)

فرمان حضرت اقدس بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ

مجھے اس کی عزت اور جلال کی قسم ہے کہ مجھے دنیا و آخرت میں اس سے زیادہ کوئی چیز پیاری نہیں کہ اس کے دین کی عظمت ظاہر ہو۔ اس کا جلال چمکے اور اس کا بول بالا ہو۔ کسی ابتلاء سے اس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں۔ اگرچہ ایک ابتلاء نہیں کروڑ ابتلاء ہوں۔ ابتلاؤں کے میدان میں اور دکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے۔

پس اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہو جائے۔ مجھے کیا معلوم کہ ابھی کون کون سے ہولناک جنگل اور پُر خار بادیہ درپیش ہیں جن کو میں نے طے کرنا ہے پس جن لوگوں کے نازک پیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ مصیبت اٹھاتے ہیں جو میرے ہیں وہ مجھ سے جُدا نہیں ہو سکتے نہ مصیبتوں سے نہ لوگوں کے سبّ و شتم سے نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے اور جو میرے نہیں وہ عبث دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ وہ عنقریب الگ کئے جائیں گے۔ اور ان کا پچھلا حال ان کے پہلے حال سے بدتر ہو گا۔

(انوار الاسلام صـ۲۲)

برتر گمان و وہم سے احمدؐ کی شان ہے
جس کا غلام دیکھو مسیح الزمان ہے

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ

قربانی کی جزاء

"خدا کی خاطر قربانیاں کرنے والوں کی جزاء محدود نہیں ہوتی کیونکہ خدا وہ ذات ہے جو لامحدود ہے۔ اور اس پر کوئی فنا نہیں۔ اس لئے آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ کی قربانیوں کی جزا آپ کی ذات تک محدود نہیں بلکہ تاقیامت آپ کی نسلیں ان قربانیوں کا پھل کھاتی رہیں گی۔

خونِ شہیدانِ اُمّت کا اے کم نظر، رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا
ہر شہادت ترے دیکھتے دیکھتے، پھُول پھَل لائے گی پھُول پھَل جائے گی

امام جماعت الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز
(خطبہ جمعہ ۱۶ر اگست ۱۹۸۶ء)

زندگی بخش رس

"ہم خدا کے بندے ہیں اور خدا کے مومن بندے ہیں۔ ہم ہلاکتوں سے زندگیاں نچوڑنا جانتے ہیں اس لئے یہ جتنی ہلاکتیں ہمارے لئے تجویز کریں گے اتنی ہی زیادہ ہم زندگی کا رس ان ہلاکتوں سے نچوڑ لیں گے۔ وہ رس ہمیں مزید زندہ کرتا چلا جائے گا۔"

(خطبہ جمعہ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۶ء)

ساری دُنیا میں مُشک پھینکیں گے
میرے بھی کچھ غزال ہیں ایسے

حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

فہرست

نہ بجھا سکیں اُنہیں آندھیاں جو چراغ ہم نے جلائے تھے
کبھی لَو ذرا سی جو کم ہوئی۔ تو لہو سے ہم نے اُبھار دی

بھلا کیوں بقائے دوام کو، نہ ہو ناز ان کے وجود پر
وہ جنہوں نے جان سی عزیز شے ترے حبیبؐ پہ وار دی

(ثاقب)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارف

فضائلِ شُہداء

شہنشاہِ نبوت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں

زیرِ نظر تالیف چند خوش نصیب شہدائے احمدیت کے ایمان افروز حالات پر مشتمل ہے اور محترمہ حفیظہ الرحمٰن صاحبہ کی رقم کردہ ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مقامِ شہادت کی عظمت و جلالت کیا ہے اور شہدائے حق کے فضائل و مناقب خدائے عزّ و جل کی عالی بارگاہ میں کس قدر ہیں۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مبارک حدیث سے واضح روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کی صورت میں خصوصی اعزاز بخشا ہے۔

اوّل :- تمام نبیوں کی ارواح کو ملک الموت نے قبض کیا مگر شہداء کی روحیں اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی منشاء مبارک کے مطابق خود قبض کرتا ہے۔

دوم :- جملہ انبیاء کو موت کے بعد غسل دیا گیا مگر شہید نہلائے نہیں جاتے۔

سوم :۔ سارے نبیوں کو کفن پہنایا گیا لیکن شہداء کو انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے۔

چہارم :۔ انبیاء فوت ہو گئے اور انہیں اموات کہا گیا مگر شہداء کو مُردہ نہیں کہا جاتا۔

پنجم :۔ نبیوں کو قیامت کے دن حقِ شفاعت عطا ہو گا مگر شہید ہر روز جن کی نسبت چاہیں شفا کرتے ہیں۔

(تفسیر الجامع الاحکام القرآن جلد چہارم صفحہ ۲۷۶ مولفہ حضرت ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی متوفی ۲۹ ر اپریل ۱۲۷۳ء
ناشر :۔ مطبقہ دار الکتب المصریہ ۱۹۳۷ء)

خدا تعالیٰ اُن سب پاک روحوں کو جنہوں نے حق و صداقت کے گلشن کی آبیاری کے لئے اپنا خون کا نذرانہ پیش کیا۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک قدموں میں رکھے اور اُن کی دعاؤں کے خزانہ سے ان کی ازواج و اولاد قیامت تک فیضیاب ہوتے رہیں۔ اور ہم سب کو بھی محض اپنے فضل و کرم سے یہ توفیق بخشے کہ ہم آسمانِ روحانیت کے اِن ستاروں کی روشنی سے نور حاصل کر کے دینِ حق کے پرچم کو ہمیشہ بلند سے بلند تر رکھیں۔ آمین ثم آمین وما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم

کھڑے ہوں روزِ محشر راستبازوں کی قطاروں میں
ہمارا نام بھی شامل ہو تیرے جاں نثاروں میں

یکم مئی ۱۹۹۲ء

دوست محمد شاہد
ربوہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ھو الناصر

"میرے پیارو! خدا کے پیاروں پر دائماً بھیجتے سلام چلو"

عرضِ حال

خدا تعالیٰ جن لوگوں سے راضی ہو گیا اور اُن کی زندگی و پائندگی کی خود گواہی دے دی۔ تو ان کی حیات کے کسی بھی پہلو کو بیان کرنا انتہائی مشکل امر ہے۔ میری کیا ہستی کہ میں اپنی بساط پر ایسی عظیم المرتبت ہستیوں کو یکجا کر سکوں۔ تاہم میں نے سوچا چونکہ آج کا مردِ معاشی ذمہ داری کے تلے اتنا دب چکا ہے کہ ان ستاروں کی روشنی کا بروقت احاطہ کرنے میں اُس کی ذمہ داریاں اور بڑھ جائیں گی اور اِس طرح آئندہ آنے والی نسلیں جن قدموں پر چلیں گی وہ تشنگی کا شکار ہوں گے۔ مبادا میرے زمانے کا مردِ معاشی دوڑ میں ان نگینوں کو سجانے میں دیر کر دے۔ لہٰذا میں نے اپنی کم مائیگی کے باوجود قلم اٹھالیا۔ مگر اِس میدان میں داخل ہونے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں نے بہت بلند چوٹی کو منتخب کیا ہے۔ خدا تعالیٰ مجھے اِس چوٹی کی رفعت کو سر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

میں گنہگار، کمزور اور کم علم جب ان تراشیدہ ہیروں کو قرطاس پر سجانے لگی تو اپنی بساط پر شرمندہ ہوئی۔ کیونکہ ہر ایک خدا کے فضل و کرم سے ہر جہت سے مکمل

خدا تعالیٰ کا نقشہ لیئے ہوئے۔ خدا تعالیٰ کی محبت سے رنگین۔ محمد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار اور حضرت مسیح موعود (خدا تعالیٰ ان سے راضی ہو) کے عشق میں دیوانہ نظر آیا۔ اور اِن عشق کے تمام پہلوؤں نے اُسے خدا سے جا ملایا۔ سچ پوچھو وہ دیوانہ تھا۔ فنا فی اللہ تھا۔ مجنوں تھا۔ خدا سے جا ملا۔ عاشق تھا سر کی بازی لگا گیا اور تعجب یہ ہے کہ اچانک کچھ نہیں ہوا۔ بتدریج اس کی کمانِ محبت جھکتی چلی گئی۔

اور

ایک دن وہ منصب شہادت پر جا پہنچا۔ جہاں خدا تعالیٰ خود آگے بڑھا اور مقام کر اُسے اپنے رفیقوں کے زمرے میں لے گیا۔

سبحان اللہ علی ذالک فضل اللہ یوتیہ من الیشاءُ واللہ ذوالفضل العظیم۔ جہاں تک فضل الٰہی کا تعلق ہے وہ اُس کے اندر ہی جذب تھا۔ اُس کی سرشت کا حصّہ تھا۔ مگر ماحول و تربیت، تعلیم اور مواقع ایسے میسر آتے چلے گئے کہ وہ ان شاہراہوں پہ گامزن ہو گیا کہ جن کی منزل ہی شہادت تھی۔ سو وہ خدا کا جا ہوا اور خدا اس کا ہو گیا۔ ثم الحمد اللہ علی ذالک

پس جو مر گیا وہ تو حقیقی چاند کو جا دیکھے گا۔ لیکن ہم جو پیچھے رہ گئے متقاضی ہیں کہ حقیقی چاند کو دیکھنے کے مختلف راستے تلاش کریں۔ سو میں نے اپنی طاقت کے مطابق کوشش کی ہے کہ اخیار و ابرار کے نمایاں زاویئے زندگی آپ کے سامنے بیان کروں۔ باقی ان کے شب و روز ضمناً آتے جائیں۔ مجھے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی یہ تو قارئین کی نظر ذوق ہی بتا سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ قارئین کے دل میں محبت پیدا کرے کہ وہ ان روشن راہوں کو پہچان سکیں اور ان پہ چلنے کی کوشش کریں تو یہی میرا ماحصل ہے۔ کیونکہ زندگی آنے اور چلے جانے کا نام نہیں ہے

بلکہ کچھ کر جانے کا نام ہے اور کچھ کرنے کے لئے قربانی کا ہونا ضروری ہے اور
قربانی کو زندہ رکھنے کے لئے ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے تاکہ کل آنے والے
لوگ آج کے نگینہ لوگوں سے چمک پاکر خود کو منور کرلیں اور اس مشعل قربانی
سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی ہم میں زندہ رہے اور اس قربانی میں میری
بھی ایک بوند شامل ہو جائے اور خداتعالیٰ قبول فرمائے ۔ امین اللھم آمین

طالبہ دعا

سیدہ حفیظۃ الرحمٰن

مقدمہ

یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ ابتلاء میں انعامات پنہاں ہوتے ہیں اور خداوند عالم اور اس کے محبوب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی فرمان ہے کہ ابتلاء ثمرات شیریں کا ہی پیش خیمہ ہوتے ہیں اور دینی ترقیات بھی اس میں مضمر ہوتی ہیں بلکہ ایمان کی پرکھ اور کسوٹی بھی یہی ہے۔ یہ سب کچھ برحق اور سچ ہے مگر جو اس کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے صرف وہی اس کمک کو بتا سکتا ہے کہ اس کی ہستی کتنی ہل گئی تھی۔ گو مومن کے لئے ابتلاء عذاب نہیں ہوتا مگر جو وقفہ ابتلاء اور انعام کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ انسان ایک بلا میں مبتلا ہو کر پہلے تو مر جاتا ہے۔ پھر وہ انعام کے لئے زندگی پاتا ہے۔ اور اس زندگی کے پانے تک وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور اس کے تمام نکل جاتے ہیں۔ نفس امارہ یعنی تکبر، لالچ، بدی اور برائی ختم ہو کر گر جاتے ہیں۔ ابتلاء اس کو ایسے ہلا جاتی ہیں جیسے بیری ہلا دی گئی ہو۔ انجام کار انعامات اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور اس کی جھولی کی وسعت دیکھتے ہیں۔ پھر اس کی ایمانی طاقتیں اس کی ڈھارس بندھاتی ہیں اور کھڑا کر دیتی ہیں۔ وگرنہ اس کی حالت تو یہی ہوتی ہے کہ پہاڑ سے گر کر خود کو ختم کر لے۔ کیونکہ وہ لمحہ جو دکھ اور انعام کے مابین ہوتا ہے بلا کا ہوتا ہے۔ صرف خدا کے بندے ہی سرخرو ہوتے ہیں۔ اور پیشانیٔ دین پر نگینوں کی طرح وہ جگمگاتے ہیں۔ آج میرا موضوع یہی نگینے لوگ ہیں۔ جو تراشے جانے کے ادوار میں سے نکلے ہیں۔ اور کچھ ثمرات شہادت پا کر ابد تک آویزاں ہو گئے ہیں۔ چونکہ قربانی کا آخری اور عظیم ترین معیار "جان دینا" ہے اس لئے جو لوگ بھی جان دے کر اپنی قوم کو زندہ رکھتے ہیں وہ لازوال زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی قربانی کا یہی معراج ہوتا ہے۔

؎ کس مٹی سے تخلیق ہوئی ان کی ہے سیرت
ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں سر اپنا اٹھا کے

آج میں ان کا ذکر چھیڑنے کی ہمت کر رہی ہوں جو قربانی کے معراج تک جا پہنچے۔ جو بازاروں اور شہروں میں اپنا سر ہتھیلی پر لے کر پھرتے رہے۔ اور دل کو ایمان کے نور سے روشن کر کے گھر گھر دعوتِ حق کے چراغ جلاتے رہے۔ عموماً دعوتِ حق کے جواب میں ہر گھر سے انہیں پتھر ملے اور وہ بڑھتے ہی گئے۔ اور آگے ہی آگے اُن کا قدم اُٹھتا رہا۔ ادھر خدا تعالیٰ کی تقدیر ان کو آزمائشوں اور تکلیفوں کے دور میں کھینچتی رہی ہے۔ بالآخر وہ آزمائش کے ہر میدان میں اُترے ہیں اور سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔

سو آج اس بہتر موت نے بہتر زندگی عطا کی ہے نہ صرف قوم کو۔ اور شہدا کو بلکہ زندہ رہنے والوں کو بھی جاوید کر دیا ہے اور قربانی کرنے والی قوم کی یہی تقدیر ہوا کرتی ہے۔

خونِ شہیدانِ امت کا اے کم نظر! رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا
ہر شہادت تیرے دیکھتے دیکھتے پھول پھل لائے گی پھول پھل جائے گی

پس ہر شہادت پھلی اور چادرِ احمدیت کو اتنی وسعت عطا ہوئی کہ پہاڑوں، دریاؤں، کونوں، میدانوں، شہروں، جنگلوں اور سمندروں کے پار تک جا پہنچی۔

اور آج اِس پُر درد مجموعۂ الفاظ میں مَیں اُن خوش نصیبوں کا ذکر کرتی ہوں جنہوں نے قوم کو زندہ کر دیا۔ مصائب و شدائد میں پورے اترے اور جوانمردی کا ثبوت دیا۔ بیشک یہ میری قوم کے نگینے جواں مرد ہیں جنہوں نے قوم کی پیشانی پر آویزاں ہو کر روشنی و چمک پیدا کی اور جنہوں نے احمدیت کی عزت و ناموس کا سر

جھکنے نہیں دیا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے علَم کو بلند رکھا۔ ان کے لئے دعا کرتی ہوں کہ قربانی کی یہ مشعل جس نے قلوب کو جلا دی۔ ان کی نسل کو تابندہ تر رکھے وہ آگے بڑھیں اور خدا کی رضا کے حصول کے لئے اپنے تئیں پیش کریں آمین

یا رب العالمین۔

اے شہیدو! آپ کو خوشخبری ہو کہ کشتیٔ احمدیت کے نگہبان حضرت مصلح الموعود (اللہ آپ سے راضی ہو) نے آپ کی قدر دانی فرماتے ہوئے رائے دی تھی کہ "جس قدر سلسلہ کے شہید ہوں ان کے نام کتبہ پر لکھوائیں اور اس کو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے سرہانے کی طرف لگوایا جائے تاکہ وہ ہر ایک کی دعاؤں میں شامل ہوتے رہیں۔ اور ہر ایک کی نظر ان کے ناموں پر پڑتی رہے"[1] سبحان اللہ آپ کو کتنا عالی مقام عطا ہوا۔

بیشک شہادت کا بدلہ خدا خود دے[2]

اگر معاندینِ احمدیت کی "خدماتِ دینیہ" کا کچھ تذکرہ کرتی چلوں تو آئندہ آنے والے واقعات و حالات کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ ایک جائزہ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۰ء تک پیش کرتی ہوں جو مستند ہے۔ باقی چند سالوں میں ان ابواب رقابت میں اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ سردست یہی نقشہ کافی ہے۔ جس سے میری قوم کا جوڑ جوڑ دکھ گیا ہے۔

۱۔ السلامُ علیکم کہنے پر چھ ماہ قید اور پندرہ سو روپے جرمانہ۔

۲۔ کلمہ طیبہ پڑھنے پر ۵۲ سال قید اور اٹھتر ہزار روپے جرمانہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ۱۲۵ احمدیوں کو مسلمان کہنے پر قید کیا گیا ہے۔

۴۔ ۱۷۸ احمدیوں کو تبلیغ و تقسیم لٹریچر کے جرم پر قید کیا گیا ہے۔

---

[1] الفضل ۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء [2] خطبات محمود ص ۱۱۹

۵۔ ۵۸۸ احمدیوں کو کلمہ کا بیج لگانے پر قید کیا گیا ہے۔

۶۔ ۳۲۱ احمدیوں کو بیوت الذکر پر کلمہ طیبہ لکھنے پر قید کیا گیا ہے۔

۷۔ ۲۰۴ احمدیوں کو اذان کہنے کے جرم میں قید کیا گیا ہے۔

۸۔ ۲۱۴ احمدیوں کو مختلف مقدمات میں ملوث کر کے گرفتار کیا گیا ہے۔

۹ اور اس وقت تک ۱۴۲۱ احمدیوں کو مختلف نوعیت کے مقدمات میں ملوث کر کے جیلوں میں گھسیٹا گیا ہے[1]

یہ عرصہ چھ سال ہے اور خدمات دینیہ کے نقشے کا نمایاں پہلو وہ شہادتیں ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے قلم بھی روتا ہے اور الفاظ بھی آہ وزاری کرتے ہیں یہ آنسوؤں سے لکھی ہوں آپ آہوں سے پڑھیں شکریہ۔

اسلئے کہ

آج وہ خون جو کبھی زمین نے چوس لیا تھا بچے بچے کے سر پہ چڑھ کر بول رہا ہے۔ کہ یہ رنگ تو احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے متوالو کا ہی ہے۔ یاد رہے کہ جو قربانی خلوص، محبت اور پیار سے نکلتی ہے اُسے لازماً پَر پرواز عطا ہوتے ہیں۔ وہ لازماً آسمان کی بلندیوں پر پہنچ کر خدا کے حضور قبولیت پاتی ہے[2] اور شہادت کا بدلہ تو خدا خود ہے[3] آئیے ان نگینوں کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں اور دعائے شکرانہ کی وادی میں اُتر جاتے ہیں کہ ہر نگینہ کتنا دلفریب و حسین ہے جو ہمیں رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کے ڈھنگ سکھلا گیا۔ وما توفیقی الا باللّٰہ

---

[1] تقریر جلسہ سالانہ ۱۹۸۸ء [2] خطبہ جمعہ یکم نومبر ۱۹۹۱ء [3] خطبات محمود صفحہ ۱۳۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

هُوَ النّـــــــــــــاصِر

ابتلاء کے ثمرات

حکم خداوندی اور فضل ایزدی سے دس جون ۱۹۸۲ء کو جب قدرت ثانیہ کے چوتھے دور کا آغاز ہوا تو ایک وحشت کے ساتھ طاغوتی طاقتوں نے جگہ جگہ سر اٹھایا مگر اس طاغوتی سر کو کچلنے کیلئے بھی کئی دیوانوں نے اپنے سر پیش کر دیئے اور خون کا غسل کر کے باغ احمدیت کی آبیاری کی اور وسعت دین کے لئے ایسی چمک پیدا کی کہ بستی بستی، قریہ قریہ پوری شدت کے ساتھ جا پھیلی۔ حتیٰ کہ دشتِ مہران کو جا روشن کیا۔ مگر سرزمین سندھ سرفروشی اور شہادت کے میدان میں دیوانہ وار آگے بڑھا لیکن کہیں تو یہ سفر آتشی اور ٹھنڈک سے چلتا رہا۔ اور کہیں کہیں جنگل کے باسیوں نے سہاگ اُجاڑے اور سر کاٹ دیئے۔ مگر یہ روشنی ایک نور تھا جو بڑھتا چلا گیا اور سمندر پار کر گیا۔ سمندر کے آر اور پار ہزاروں بلکہ لاکھوں جانیں آگے بڑھیں اور ان فدائین کی صفوں میں کھڑی ہوگئیں۔ خون کے ایک ایک قطرہ نے قیمت وصول کی۔ اور یہ روشنی کا ہالہ دراز تر ہوتا چلا گیا۔ اور آج کل ایک لاکھ آٹھ ہزار درخشندہ ستاروں کا احمدیت کے آسمان پر اضافہ ہونا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ وہ خون جو کبھی سندھ اور اس کے گرد و نواح میں بہا تھا بالآخر رنگ لایا اور اس کے ایک ایک قطرہ کی پکار گونجی اور دنیا کے مسیحیت میں جا سنائی دی۔ وہ خون رائیگاں نہیں گیا اور نہ جائے گا۔ کیونکہ یہ تقدیر

الٰہی ہے کہ ہمیں کوئی مٹا نہیں سکتا ۔ امام جماعت احمدیہ بالکل بجا فرماتے ہیں

"ہم تو وہ ہیں جن کے نقوش جریدہ قرآن پر نقش ہیں ۔ پس قرآن کے نقوش کون مٹا سکتا ہے پس آج یہ نقش قرآن لاکھوں پر جا منڈ ہوا جبکہ ایک دن وہ تھا کہ ایک دل گیر وافسردہ آواز نے کہا تھا ۔" یہ درست ہے کہ ہم ایک کمزور اور چھوٹی سی جماعت ہیں جو دنیا کی نظر میں التفات کے لائق بھی نہیں ۔ لیکن میں جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں کہ ہم اپنے رب کے ادنیٰ غلام ہیں اور استحقاق کے بغیر ہمیشہ اس کی رحمت اور فضلوں کے ہم مورد رہے ہیں اور وہ ہماری گریہ زاری کو قبول فرماتا ہے ۔ پس میں تمام مرد و زن ، بوڑھوں اور بچوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ بڑے درد و کرب سے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک شور مچا دیں کہ تا وہ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والے ہر فرد و بشر پر رحمت اور کرم کی نظر فرمائے اور اپنے آنسوؤں سے سجدہ گاہوں کو تر کر دیں اور اپنے رب کی رحمت سے قدم قدم پہ عرض کریں کہ اے آقا ! ہمارے سینے اس غم سے پھٹ رہے ہیں ۔ اُمتِ محمدیہ سے درگزر اور عفو کا سلوک فرما اور اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی برکت سے ان کے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کر دے . . . . اے خدا تو ہمارے سخت زخمی دلوں کے اندمال اور سکینت کا سامان پیدا فرما ۔ اے خدا ایسا ہی کر ۔ دیکھ ہم تیرے حضور ذبح ہونے والی قربانیوں کی طرح تڑپ رہے ہیں ۔"

آپ کے محبوب خدا نے ذبح ہونے والی قربانیوں کی تڑپ دیکھی ۔ آپ کی دعاؤں کو قبولیت عطا کی ہر دل میں تڑپ پیدا ہوئی ۔ اور ہر تڑپ نے قربانی کا رنگ

دھار لیا۔ آج ہر قربانی سر پیش کرتے ہوئے یہ پیغام چھوڑ جاتی ہے جو سینہ بہ سینہ رواں دواں ہے۔ اور آنے والے کے لئے نوید زندگی ہے

"اے احمدی اُٹھ اپنوں سے بھی اسلام کی خاطر لڑ اور محمد مصطفےٰ کی خاطر ہر تیر جو تیری طرف چلایا جاتا ہے۔ اُسے خوشی سے قبول کر کہ اس سے بہتر کوئی موت نہیں ہے۔ جو میرے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ میں آئے۔"

ایک وضاحت

تھوڑی دیر کے لئے کوئی سطحی نظر یہ کہہ سکتی ہے کہ یہ شہادتیں عذاب کے نام سے موسوم کیوں نہیں کی جارہی ہیں؟ بار بار ابتلاء کا پرچار ہوتا ہے تو واضح ہو کہ ابتلاء اور عذاب میں نمایاں فرق ہے۔ بظاہر تکلیفیں دونوں صورتوں میں ہیں مگر نتائج کے لحاظ سے دونوں میں فرق آجاتا ہے مثلاً (۱) عذاب کا نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوتی ہے مگر ابتلاء کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ بچا لیتا ہے۔

۲ عذاب کے نتیجے میں نقصان کی زیادتی ہوتی ہے اور ابتلاء میں نفع کی زیادتی ہوتی ہے۔ ابتلاء کی مثال تو ایسی ہوتی ہے کہ جیسے ربڑ کے گیند کو جتنے زور سے پھینکا جائے وہ اتنا ہی اچھلتا ہے۔ مگر عذاب میں گر کر انسان اوپر نہیں اُٹھ سکتا۔

۳۔ عذاب جس انسان پر نازل ہوتا ہے۔ اس کے دل میں مایوسی اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مگر جس پر ابتلا نازل ہوتا ہے اس کے دل میں اطمینان اور تسلی ہوتی ہے۔

۴۔ عذاب کو دُور کرنے کی جب انسان کوشش کرتا ہے تو ٹھوکریں کھاتا ہے۔ مگر جس پر ابتلا آتا ہے۔ اس کا فہم رسا ہو جاتا ہے۔ اور وہ بات کو خوب سمجھنے لگ

جاتا ہے ۔

۵۔ ابتلاء میں انسان کو احساس بلا نہیں ہوتا ۔ اور تکالیف کو حقیر جاننے لگتا ہے ۔ اور لذت محسوس کرتا ہے مگر عذاب میں ایسا نہیں ہوتا ۔

۶۔ عذاب میں روحانیت کم ہو جاتی ہے ۔ مگر ابتلاء میں روحانیت زیادہ ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ عذاب میں خدا تعالیٰ کی طرف اور زیادہ توجہ ہو جاتی ہے [1]

پس عذاب اور ابتلاء میں تفریق جاننے کے بعد یہ کہاں گنجائش رہتی ہے کہ انسان شہادت کو بھی عذاب سے موسوم کرے ۔ شہادت تو ایک انعام ہے جو اعمالِ صالح اور فضل ربی کے نتیجہ میں نصیب ہوتا ہے ۔ اور یہ سچ ہے کہ وہ انعام صرف اور صرف ہاتھوں میں سر اٹھائے پھرنے والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے ۔ اور یہ بالکل سچ ہے ۔ اور روز روشن کی طرح سچ ہے کہ الٰہی جماعتوں کی ترقی ابتلاء سے متاثر نہیں ہوا کرتی ۔

جس طرح

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس وقت آگ میں ڈالا گیا تو ایک سیکنڈ کے لئے بھی ان کے دل میں خوف پیدا نہیں ہوا ۔ وہ مسکراتے ہوئے آگ میں چلے گئے ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میرے احمق دشمن یہ سمجھتے ہیں کہ آگ ان کے کہنے پر یا ان کی خواہش کے مطابق جلا سکتی ہے ۔ آگ تو جلاتی ہی اس وقت ہے جب میرا رب آگ کو کہتا ہے کہ جلا ۔ لیکن جب اس کو حکم ہو کہ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا تو آگ کیوں جلائے گی ۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام مسکراتے ہوئے بشاشت کے ساتھ آگ میں چلے گئے وہ تو چھوٹا سا حادثہ خدا تعالیٰ کے ایک

---

[1] سورۃ العنکبوت تفسیر کبیر صفحہ ۲۸۸ از مُصلح موعود

مقرب بندہ پر گزرا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تو دشمنوں نے ایک آگ نہیں ہزاروں آگیں جلائیں لیکن آپ ہنستے مسکراتے کامیابی اور کامرانی کے ساتھ فتح ونصرت کی شاہراہوں پر چلتے گئے اور دنیا نے یہ نظارہ دیکھا کہ آگ نے منکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک دھواں تو پیدا کر دیا یعنی ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ آگ کامیاب ہو جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ آپ نے جنگیں کیں۔ اور ایسے حالات میں کیں کہ دنیا کا کوئی ہوش مند نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے ساتھی ان جنگوں میں کامیاب ہوں گے۔

لیکن

آپؐ اور وہ جو علی وجہ البصیرت آپؐ پر ایمان لائے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کی معرفت انہوں نے حاصل کر لی تھی۔ وہ ہنستے کودتے میدانِ جنگ میں چلے جاتے تھے اور کہتے تھے دو بہترین باتوں میں سے ایک بات ہمیں مل جائے گی انعام شہادت یا دین و دنیا کی نعمتیں۔ [1]

(تعلیم القرآن کلاس سے خطاب ۲۴ جولائی ۱۹۶۸ء)

---

[1] الفضل ۳۰ دسمبر ۱۹۹۰ء

ایک حقیقت

حضرت خواجہ غلام فریدؒ صاحب چاچڑاں شریف کو یہ حقیقت اکثر کبیدہ خاطر کر دیتی تھی اور وہ دکھی ہو کر کہتے تھے کہ

" علماء کو دیکھو مذاہب باطلہ کے گروہ کو چھوڑ کر صرف ایک شخص کے درپے ہو گئے ہیں۔ جو اہل سنّت و جماعت میں سے اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔ اور راہِ ہدایت دکھلاتا ہے۔ اور اس پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اس کا عربی کلام کہ طاقتِ بشری سے باہر ہے اور اس کا تمام کلام معارف وحقائق و ہدایت سے پُر ہے۔

اشاراتِ فریدیہ ص ۱۷۹/۳

مگر

جنہوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات پر گونگے۔ بہرے ہو کر گزرنا سیکھا ہے وہ حقیقتوں کو کیا جانیں ؟ حضرت غلام فریدؒ کی کافی تو بڑی خوش الحانی سے گا گا کر سن اور سنا سکتے ہیں مگر صراط مستقیم پہ چلنے کے لئے ان کی آنکھوں پہ پردے ہیں۔ کتنا واضح اور بیّن ارشادِ نبوی ہے۔

" اے مسلمانو! جب تمہیں اس کا علم ہو جائے تو فوراً اس کی بیعت کرو۔ خواہ تمہیں برف پر سے گھٹنوں کے بل جانا پڑے کیونکہ وہ خدا کا خلیفہ مہدی ہو گا۔"

(بحار الانوار، ابنِ ماجہ، ابوداؤد)

اور آج ببانگ دہل ہر آواز پکار رہی ہے

کہ

ایک سو چھبیس ملکوں میں جماعت کا قیام ہے
۵۰ زبانوں میں مکمل ترجمہ قرآن کی اشاعت کا ایک اعلیٰ سبب ہے
۱۱۶ زبانوں میں منتخب آیاتِ قرآنیہ اور حدیثِ نبوی کے تراجم ہو چکے ہیں
احمدیہ مشن ۲۰۱ بیرونی ممالک میں قائم ہیں (علاوہ پاکستان و بنگلہ دیش)
بیرونی ممالک میں ۱۲۴۵ بیوت الذکر موجود ہیں

اور

افریقہ کے ۲۸ احمدیہ ہسپتالوں سے لاکھوں مریض شفایاب ہو رہے ہیں۔
۲۰۵ پرائمری اسکول اور ۲۸ ہائر سیکنڈری اسکول دنیا میں جماعت کی کاوشوں سے کھولے گئے ہیں جو لاکھوں بچوں کو علم کے زیور سے مزین کر رہے ہیں۔

پھر

امام مہدی کی عظیم ترین پیش خبری ” کہ یہ سلسلہ زور سے بڑھے گا اور پھولے گا یہاں تک کہ زمین پر محیط ہو جائے گا۔“
اور کیسے پوری ہو سکتی ہے ؟ اس سے زیادہ نمایاں اور واضح نقشہ صداقت و حقیقت کا کیا پیش کروں ؟؟؟

”بڑے ہی مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں
خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم
کی قربانیوں کا مظہر بنانے کے لئے
چن لیا۔“

(خطبہ جمعہ ۱۶؍اگست ۱۹۸۶ء)

شہزادہ عبداللطیف شہید

"پشاور سے انہی راہوں پہ سنگستانِ کابل کو
میرا شہزادہ لے کر جان کا نذرانہ آتا ہے

جہاں اہلِ جفا، اہل وفا پر وار کرتے ہیں
سرِ دار ان کو ہر منصور کو لٹکانا آتا ہے

جہاں شیطان مومن پر رمی کرتے ہیں وہ راہیں
جہاں پتھر سے مردِ حق کو سر ٹکرانا آتا ہے"

شہزادہ عبداللطیف شہید

انبیاء کی جماعتوں پر یہ اوقات ہمیشہ آئے اور درحقیقت یہی اوقات اُن کے دعویٰ ایمان کے صدق اور کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو بھی سالہاسال تک ایسی تکالیف میں سے گزرنا پڑا جو انتہائی درد انگیز تھیں۔ ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس صحابہ کی ایک جماعت بھیجی مگر اُن لوگوں نے جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے دھوکہ دے کر ان پر حملہ کردیا ..... غرض یکے بعد دیگرے ان لوگوں نے موت کو قبول کیا اور موت میں ہی اپنی ساری کامیابی سمجھی۔ پس قومی ترقی کا ایک ہی گُر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دینا اور اِس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔"

(تفسیر کبیر العنکبوت ۲۷۴ تا ۹۶۹)

پس ہر قربانی کرنے والے کو دیکھتے ہیں کہ اُس نے اس راہ پر چلنے سے دریغ ہرگز نہیں کیا بلکہ ہر اینٹ + پتھر + بھالہ + نیزہ اور گولی کو سینے پر سجایا اور ادھر اللہ تعالیٰ کو اپنے اِن بندوں کے لئے بڑی غیرت ہوتی ہے۔" وہ اِن پتوں کو محترم بنا دیا کرتا ہے جو قربانی والے جانوروں کے گلے میں ڈالے جاتے ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ اِن سرمستیوں کے لئے اُس کی غیرت جوش میں نہ آئے۔ جنہوں نے دنیاوی جاہ وحشمت کو ترجیح کر کے محمل عشق کی تلاش میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔" (انصاراللہ ستمبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۲)

پس

اُن مِٹ نقوش چھوڑنے والے حضرت شاہ عبداللطیف صاحب اور حضرت عبدالرحمٰن صاحب کے مقدس خون سے کابل کی سنگ لاخ زمین سرخ ہوئی۔ انہوں نے اپنے خون سے قندیلوں کو جلایا اور روشنی کو محفوظ کیا۔ یہ روشنی پھیلی اور آئندہ آنے والی نسلوں تک ممتد ہوتی چلی گئی اور آج اس روشنی کے ہالہ میں سرفروشوں کی ایک قطار نظر آتی ہے جو کوچۂ یار کا طواف کرنے کے لئے سرگرداں عمل ہیں۔ کبھی اُن میں کوئی دیوانہ جنوب کی طرف سے اور کوئی عاشقِ صادق مغرب کی طرف سے

"یاربّ تُحیینی فاقتل فیك ثانیہ"

کہتا ہوا آگے قربان گاہ میں کود پڑتا ہے۔

باقی رہا غیر!

"غیر توان کوچوں کا واقف نہیں وہ رموزِ عشق کو کیا جانے۔ یہ جذبہ یہ جلیل القدر جذبہ، یہ وصلِ الٰہی کے جام لنڈھانے والا جذبہ کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہ جذبہ بڑھے گا اور خدا تعالیٰ کی غیرت کے سانچے میں ڈھلے گا اور ذوانتقام کے ابر کھینچ لائے گا۔ جو کسی کے لئے تو بارانِ رحمت کا باعث بنتے ہیں۔ اور کسی کے لئے طوفان و سیلاب کا ....."

(الفضل انٹرنیشنل، ستمبر ۱۹۸۶ء)

پس اے شمال و جنوب مغرب و مشرق کے سرفروش دیوانو! یاد رہے کہ آپ ایک عظیم امانت کی حفاظت کا عہد کرچکے ہیں۔ اور "بحیثیت جماعت جتنے بھی خطرات درپیش ہیں ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو ہماری ذات سے تعلق رکھتا ہو۔ تمام خطرات کا تعلق حضرت اقدس محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی حفاظت اور اس کی اشاعت

کی کوشش سے ہے۔ حضرت اقدس بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی آمد کی غرض و غایت دین حق کو از سرِ نو زندہ کرنا ہے اور پوری شان اور کامل حُسن کے ساتھ اُسے دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ دین حق پر جتنے بھی دُکھ نازل ہوئے انہیں دور کرنے کا کام بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے سپرد کیا گیا فرمایا "ہر احمدی کی زندگی کا بجز اس کے اور کوئی مقصد نہیں آپ کو جو خدشات لاحق ہیں وہ خالصتاً دین حق کی حفاظت کے لئے درپیش ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ وعدہ کرتا ہے۔ اگر تم میرے دین کی حفاظت میں مستعد رہے تو میں تمہاری حفاظت کروں گا۔"

(خطبہ جمعہ یکم اگست ۱۹۸۶ء)

یہ حفاظت کا وعدہ الٰہی وعدہ ہے۔ اللہ صادق القول ہے اور اُس کا وعدہ سچا ہے۔ مگر یاد رہے حفاظت سے مراد فقط زندگی دنیوی نہیں بلکہ ہمیشہ کی زندگی مراد ہے

کیونکہ

یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس پر موت کا لفظ لاگو نہیں ہوتا۔ مرتا صرف وہ ہے جس کی روح مر جائے۔ اور رُوح اسی کی مرتی ہے جو نا عاقبت اندیش ہو۔ اور نا عاقبت اندیشی روحانیت کا خاتمہ کر دیتی ہے اور روحانیت کا خاتمہ ہی تو اصل موت ہے۔ جس سے محفوظ رکھنے کا وعدہ خدا تعالیٰ نے کیا ہے۔ اور اپنے ذمے لیا ہے۔

راہ مولیٰ میں جو مرتے ہیں وہی جیتے ہیں

موت کے آنے سے پہلے ہی فنا ہو جاؤ

(کلام محمودؔ)

شہزادہ استقامت

استقامت کے متعلق صحابہ کرامؓ نے جو عظیم الشان نمونے دکھائے. حضور اکرم کے غلاموں اور ساتھیوں کے اِن واقعات سے تاریخ اسلام روشن ہے اور ہمیشہ روشن رہے گی. وہ واقعات ایسی روشنی سے لکھے گئے ہیں کہ جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔

اللہ تعالیٰ کا بڑا عظیم احسان ہے کہ اُس نے جماعت احمدیہ کو بھی درخشندہ مثالوں کی توفیق بخشی اور بخشتا چلا جا رہا ہے. اور ہم ایک ایسی تاریخ بنا رہے ہیں۔ جو اس دور میں دین حق کی استقامت کی تاریخ ہے۔ اور یہ تاریخ اتنی روشن اور درخشندہ ہے کہ ہزاروں سال کے بعد بھی مستقبل کے پردے پھاڑتے ہوئے اس کی روشنی چمکا کرے گی. اور آنے والی نسلیں مڑ کر دیکھیں گی. اپنی آنکھوں کو خیرہ کیا کریں گی ان نظاروں کے ساتھ......

حضرت شہزادہ عبداللطیف شہید (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) بھی اُنہی لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " ان الذین قالو ربنا اللہ ثم استقاموا یعنی اللہ ہمارا رب ہے یہ دعویٰ کیا اور پھر اس پر استقامت دکھائی. ایک سرِ مو بھی انحراف نہیں کیا اس دعویٰ سے جب کہ آپ کو شہادت کے لئے اُس مقام کی طرف لے جایا جا رہا تھا جہاں آپ کو سنگسار کر کے شہید کرنا تھا تو بادشاہ وقت نے یا امیرِ کابل نے کہا کہ یہ کافی نہیں اس کے ناک میں سوراخ کر دو جس طرح بیل کو ناک میں رسی ڈال کر کھینچ کر لے جایا جاتا ہے. اس قربانی کے بیل کو اس طرح لے کر جاؤ. چنانچہ آپ کے ناک میں سوراخ کیا گیا اور رسی ڈالی گئی اور ہجوم تھا ایک جو ہنستا شور مچاتا طعنے تشنیع کرتا ہوا آپ کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور ان کے درمیان

کابل کی گلیوں میں سے استقامت کا شہزادہ سر اٹھائے گزر رہا تھا اور کوئی خوف اور کوئی بلا اس سر کو سرنگوں نہیں کر سکی۔ اس عظمت اور شان کے ساتھ ان گلیوں سے گزرا ہے کہ اس کی یادیں قیامت تک وہ گلیاں بھلا نہیں سکیں گی۔ یہاں تک کہ جب شہزادہ صاحب شہید کو زمین میں چھاتی تک گاڑ دیا گیا۔ تو بادشاہ وقت نے ان سے کہا جو اُن سے ہمدردی رکھتا تھا کہ اب بھی آپ انکار کر دیں اپنی جان کا خیال کریں۔ اپنی اموال اور جائیدادوں کا خیال کریں اور اپنے بچوں کا خیال کریں۔ شہزادہ صاحب نے سر اُٹھا کر کہا کہ اے بادشاہ ایمان کے مقابل میں میری جان کیا چیز ہے۔ میرا مال کیا حیثیت رکھتا ہے اور میرے بچوں کی کیا قیمت ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس لئے تم وہی کرو جس کا تم ارادہ کر چکے ہو۔ اس پر بادشاہ وقت نے کہا کہ تو مجھے اجازت دو اگر تم انکار نہیں کرنا چاہتے میں اعلان کر دوں۔ آپ نے کہا نہیں۔ میں اس کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ بادشاہ نے قاضیٔ وقت سے کہا کہ پہلا پتھر تم مارو۔ قاضیٔ وقت نے جواب دیا کہ آپ بادشاہ ہیں آپ پہلا پتھر چلائیں۔ بادشاہ نے کہا کہ نہیں شریعت کے بادشاہ تو تم بنے ہوئے ہو تمہارا حکم چل رہا ہے میرا نہیں اس لئے پہلا پتھر بھی تم مارو چنانچہ قاضی نے پہلا پتھر مارا اس کے بعد اس طرح پتھروں کی بوچھاڑ ہوئی کہ ان کے سر کے اوپر پتھروں کی ڈھیری بن گئی کہ تمام وجود غائب ہو گیا یہ وہ واقعہ ہے جس کو بعض غیروں نے بھی دیکھا اور مدتوں اس کی کسک ان کے دل میں رہی۔ چنانچہ ایک انجنیئر جو انگلستان سے وہاں آیا ہوا تھا اور چیف انجنیئر تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے اس مردِ مجاہد کے چہرے پر کوئی خوف نہیں تھا اور مرنے سے پہلے اس نے کہا کہ اے قوم! تم ایک معصوم انسان کو مار رہے ہو لیکن خدا اس کا خون تمہیں نہیں بخشے گا۔ بلائیں اور مصیبتیں تمہیں گھیر لیں گی۔ یہ آخری اعلان تھا جو شہزادہ صاحب شہید نے اس انگریز مصنف

کے قول کے مطابق کیا پھر اس کے بعد خطرہ شروع ہوگیا ....
تاریخ احمدیت اس دور سے گزر رہی ہے اور بن رہی ہے اور بنتی رہے گی اور ہمیشہ انشاءاللہ تعالیٰ احمدی اپنے ایمان کی صداقت پر حرف نہیں آنے دیں گے اُن کی آواز ہمیشہ یہی رہے گی اور شہزادہ عبداللطیف صاحب شہید کی ایک آواز نہیں ہوگی بلکہ ہزاروں، لاکھوں کروڑوں آوازیں بنتے ہوئے آواز گونجتی رہے گی کہ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ یہ اموال کیا چیز ہیں ؟ ان اولادوں کی کیا قیمت ہے ؟ تم نے جو چاہنا ہے کرو۔ بلکہ کر گزرو ہم اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں گے۔

ایسے اولیاء اللہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں گزرے ہیں جنہوں نے دعائیں کروائی ہیں کہ ہم شہید ہو جائیں۔ پیچھے پڑ کر یا رسول اللہ دعا کریں کہ ہم شہید ہو جائیں چنانچہ جنگِ احد میں ایک صحابی کے متعلق آتا ہے کہ بار بار وہ دشمن پر حملے کرتے تھے پھر واپس آجاتے تھے انہوں نے عرض کی یارسولؐ اللہ میرے لئے دعا کریں میں واپس نہ آؤں اور شہید ہو جاؤں۔ چنانچہ وہ گئے اور واپس نہیں لوٹے۔ ان لوگوں کی جنتیں ہو جاتی ہیں خدا کی رہ میں قربانیاں دے کر یہ نہیں کہ فرشتے اُن سے دھوکہ کر رہے ہوتے ہیں طفل تسلیاں دے کر جیسے مائیں بعض دفعہ چاہتی تو ہیں کہ بچے کی خواہش پوری کریں مگر نہیں کر سکتیں۔ طفل تسلیاں دیتی ہیں کہ بچے کوئی بات نہیں پیسے آجائیں ابو گھر آجائیں لیکن خدا تو اس قسم کا نہیں ہے۔ خدا کے فرشتے خالی ہاتھ نہیں ہوا کرتے۔ ہاں اللہ ان کے دلوں میں نظر ڈالتا ہے اور جانتا ہے کہ ان کے دل کی اصل تمنا ہے کیا۔ اور فرشتے یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ یہی تو جنت تھی جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ یہ جنت لے کر ہم آرہے ہیں۔

شہداء کے چہروں کو دیکھیں گے۔ ایسی جنت کی خوشخبری لے کر آئے ہیں
(خطبہ جمعہ فرمودہ ۴ر فروری ۱۹۸۳ء بمقام ربوہ)

شہدائے احمدیّت ـــــ ۱۹۰۱ئہ تا ۱۹۹۱ئہ
تعداد شہداء
۳۰
۲۰
۱۰
۱۹۰۱ء
۱۹۱۶ء
۱۹۳۱ء
۱۹۴۶ء
۱۹۶۱ء
۱۹۷۶ء
۱۹۹۱ء
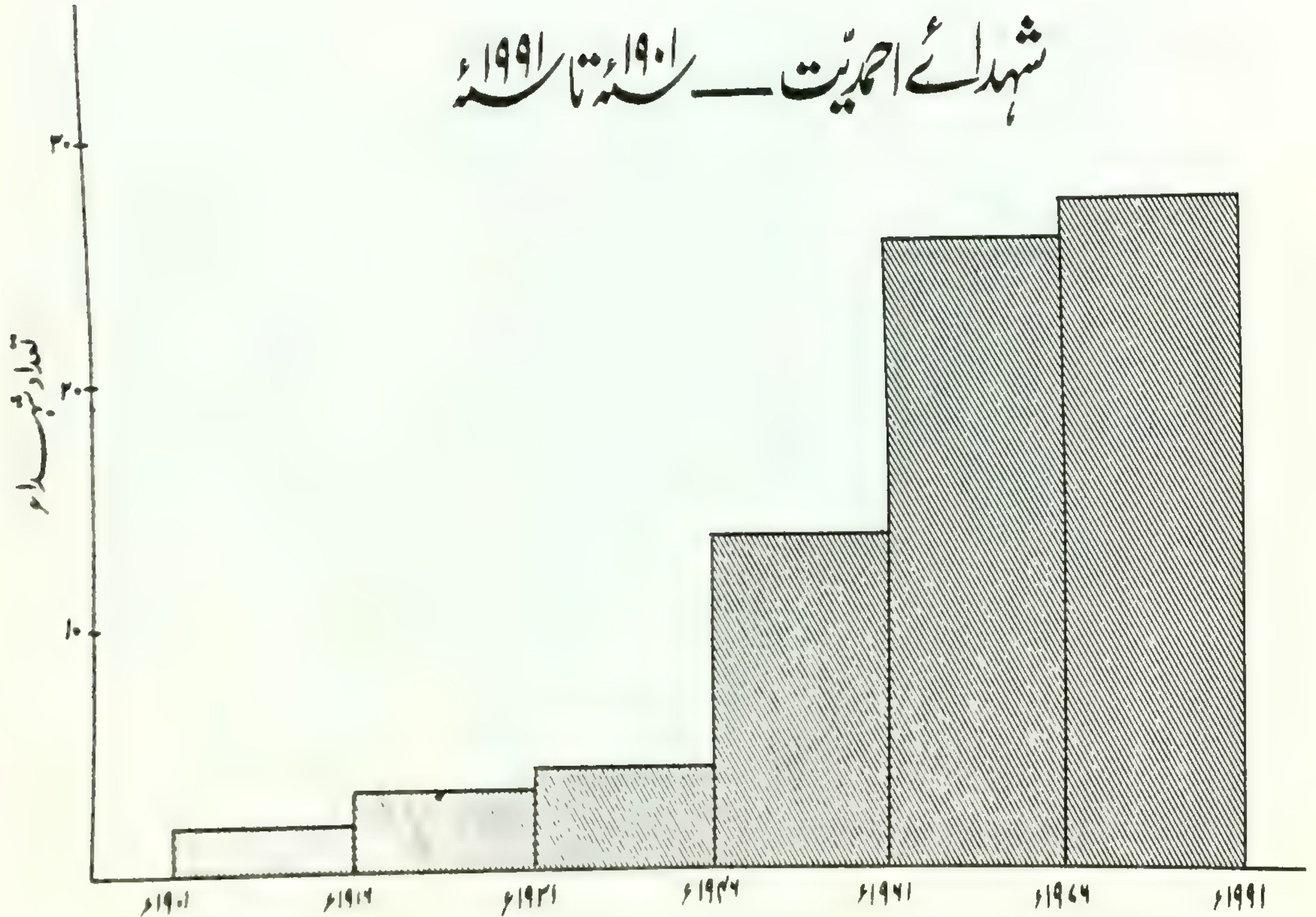
نقشہ شہداء ۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۱ء

پاکستان
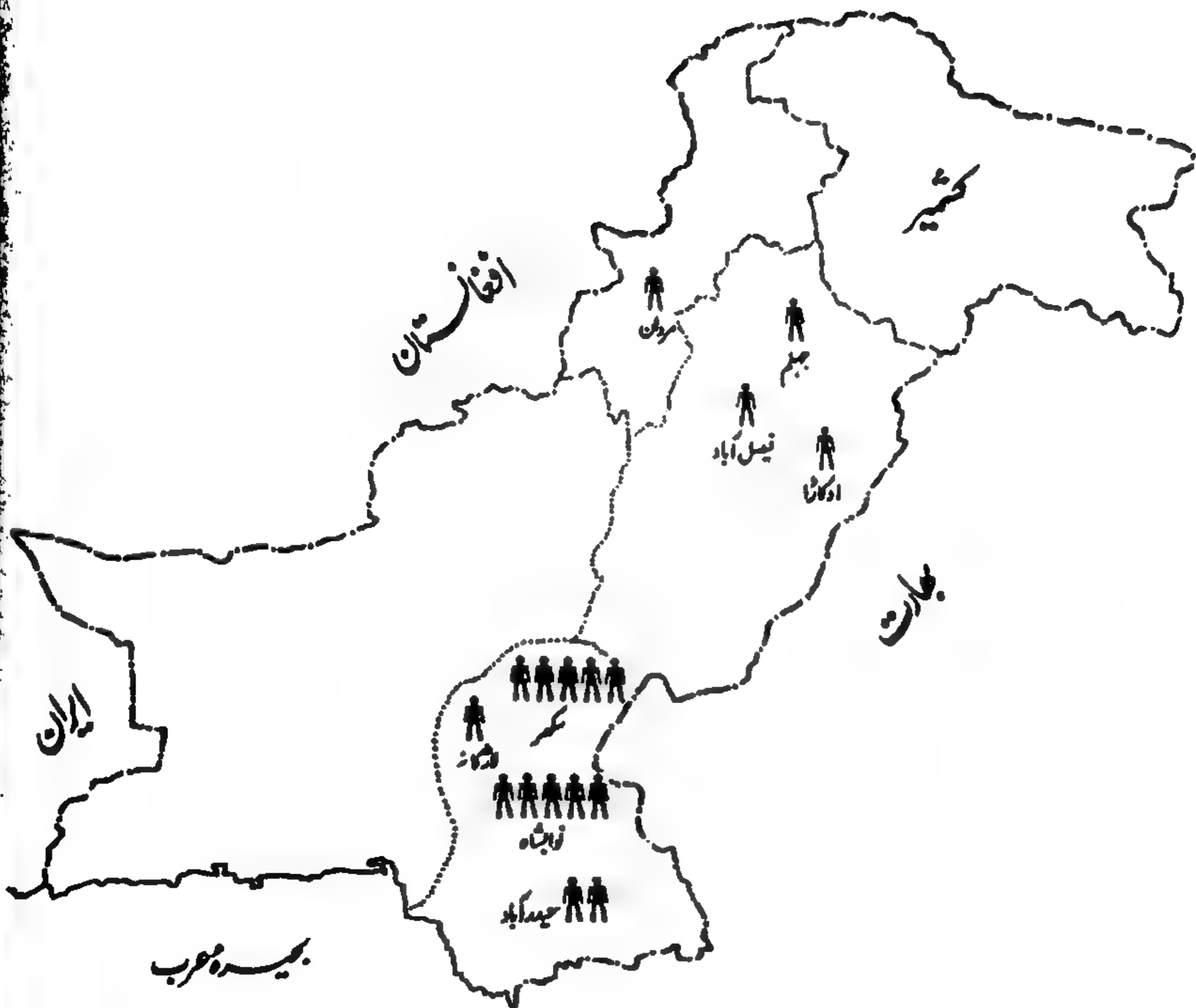
مقاماتِ شہداء ۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۱ء

سندھ

سکھر

لاڑکانہ

نوابشاہ

حیدرآباد

فہرست شہدائے احمدیت

۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۱ء

۱۔ محترم عبدالحکیم صاحب ایڈو صدر جماعت احمدیہ دارہ ضلع لاڑکانہ
تاریخ شہادت ۱۶ر اپریل ۱۹۸۳ء

۲۔ محترم ڈاکٹر مظفر احمد صاحب نیشنل سیکرٹری جنرل ڈیٹرائٹ امریکہ
تاریخ شہادت ۸ر اگست ۱۹۸۳ء

۳۔ محترم شیخ ناصر احمد صاحب ۔ اوکاڑہ
تاریخ شہادت ۱۸ر ستمبر ۱۹۸۳ء

۴۔ محترم چوہدری عبدالحمید صاحب صدر جماعت احمدیہ محراب پور ضلع نوابشاہ سندھ
تاریخ شہادت ۱۰ر اپریل ۱۹۸۴ء

۵۔ محترم قریشی عبدالرحمٰن صاحب امیر جماعت احمدیہ سکھر
تاریخ شہادت ۲ر مئی ۱۹۸۴ء

۶۔ محترم ڈاکٹر عبدالقادر صاحب چینی فیصل آباد
تاریخ شہادت ۱۵ر جون ۱۹۸۴ء

۷۔ محترم ڈاکٹر انعام الرحمٰن صاحب ناظم انصار اللہ سکھر
تاریخ شہادت ۱۵ر مارچ ۱۹۸۵ء

شہدائے احمدیت
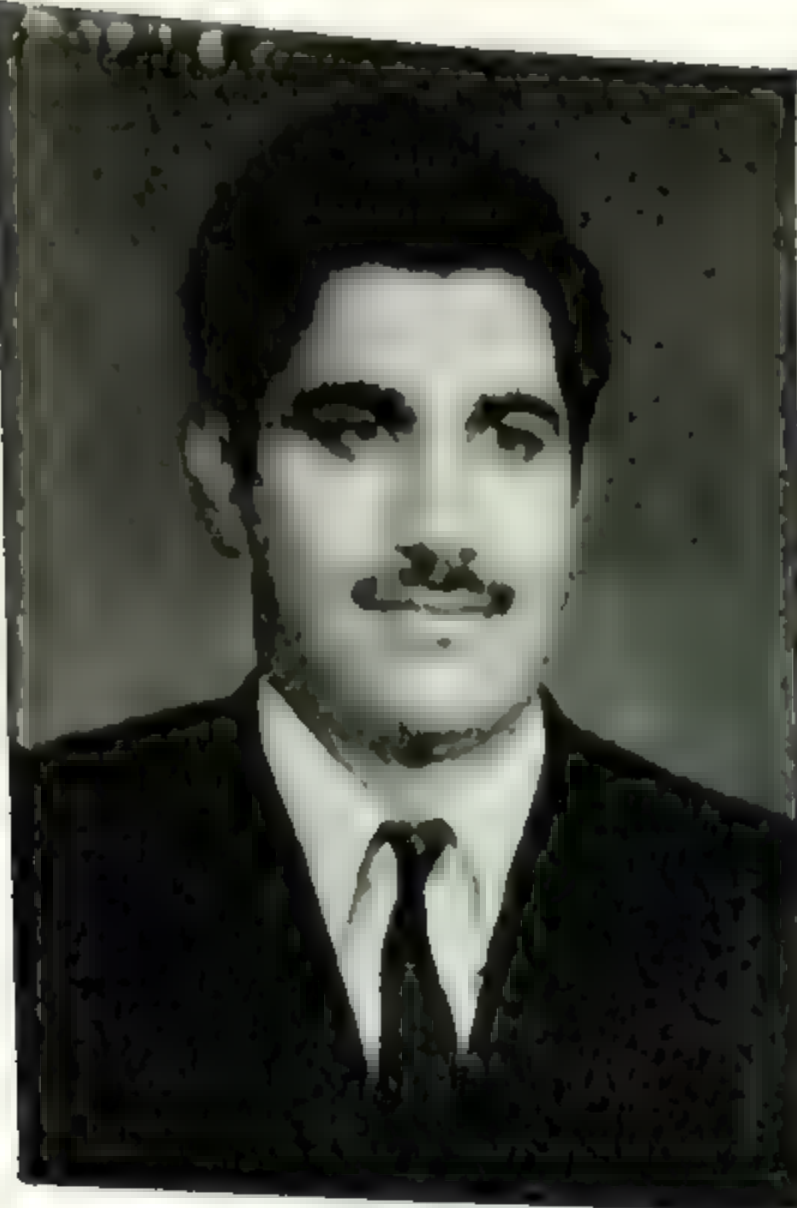
چوہدری عبدالحمید

ڈاکٹر مظفر احمد

شیخ ناصر احمد

انعام الرحمٰن

ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر

سید قمر الحق

رخسانہ طارق

ڈاکٹر عبدالقدیر

نصیر احمد علوی

۸۔ محترم چوہدری عبدالرزاق صاحب امیر ضلع نواب شاہ
تاریخ شہادت ۷ر اپریل ۱۹۸۵ء

۹۔ محترم ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب حیدر آباد
تاریخ شہادت ۹ر جون ۱۹۸۵ء

۱۰۔ محترم چوہدری محمود احمد صاحب پنوں عاقل ۔ ضلع سکھر
تاریخ شہادت ۲۹ر جولائی ۱۹۸۵ء

۱۱۔ محترم قریشی محمد اسلم صاحب مبلغ ٹرینی ڈاڈ امریکہ
تاریخ شہادت ۱۰ر اگست ۱۹۸۵ء

۱۲۔ محترم سید قمر الحق صاحب سکھر
تاریخ شہادت ۱۱ر مئی ۱۹۸۶ء

۱۳۔ محترم خالد سلیمان صاحب سکھر
تاریخ شہادت ۱۱ر مئی ۱۹۸۶ء

۱۴۔ محترمہ رخسانہ خان ۔ مردان
تاریخ شہادت جون ۱۹۸۶ء

۱۵۔ محترم بابو عبدالغفار صاحب حیدر آباد
تاریخ شہادت ۹ر جولائی ۱۹۸۶ء

۱۶ محترم ظہیر احمد صاحب ۔ سوہادہ ضلع جہلم
تاریخ شہادت فروری ۱۹۸۷ء

۱۷۔ نصیر احمد علوی صاحب ۔ نواب شاہ
تاریخ شہادت

یہیں راہیں کبھی سکھر کبھی سکرنڈ جاتی ہیں
انہیں پر پنو عاقل۔ وارہ اور لاڑکانہ آتا ہے

ماسٹر عبدالحکیم ابڑو شہید

۱۹۳۲ء تا ۱۹۸۳ء

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بعثت حضرت مسیح موعود بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی پہلی دہائی میں شہادتیں زیادہ تر ایک ہی زمین کی آبیاری کرتی رہی ہیں۔ پھر ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک ایک زمانہ ایسا آیا تھا کہ پنجاب کی زمین کا روپ افغانستان کی زمین نے دھار لیا۔ افغانستان نے تو حضرت اقدس مسیح الموعود کی اتباع اور معرفت قبول کرنے والوں کو کسی تیز دھار آلے سے آزمانے کی بجائے پتھروں کی بارش ان کا مقدر کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اب دوبارہ سہ بارہ وہی واقعات دہرائے گئے کہ خلیفۃ المسیح الرابع کی پہلی دہائی میں ہی سرزمین سندھ نے افغانستان کا روپ دھار لیا۔ اور اس کا روپ سنگھار بیس معصوم لوگوں کے غسلِ خون سے کیا گیا۔ اس زمین کو کیا ہوا؟ کس کی نظر کھا گئی؟ افغانستان کا لبادہ کیوں اوڑھا؟ یہ کچھ سوال ہیں جن کا جواب ہر دماغ مانگتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے کیا ہی اچھا ہو کہ سندھ کے دورِ اوّل میں آپ کو لے چلوں تاکہ آپ خود دیکھ لیں کہ مذہبی لحاظ سے سندھ کا یہ شیوہ تو کبھی نہیں تھا کہ "جبر" کو ہاتھ میں لیتے۔ اور ناحق معصوم لوگوں کو غسلِ خون دیتے۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟

آیئے دیکھتے ہیں

سندھ کی زمین میں اسلام تو شروعات میں ہی آگیا تھا۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی ایک وفد مسلمان ہو کر داخلِ سندھ ہو گیا تھا۔ اور یہیں آباد ہو رہا تھا۔ عقائد کے لحاظ سے مسلمانوں نے ہمیشہ اعلیٰ کردار اور اخلاقِ حسنہ پیش کئے ہیں۔ بہر طور ارکانِ اسلام کی پابندی رہی۔ صوفیوں کی بستی کہلاتی رہی۔ کوئی قبیلہ فتنہ فساد کی طرف مائل نہ تھا۔ ہاں ایک قبیلہ "حُر" خونریزی اور دست درازی کا عادی تھا۔ حُر کی روٹس (ROOTS) غالباً حضرت امام حسینؓ کے واقعہ کربلا کے میدان میں ایک حُر نامی انسان سے وابستہ ہیں۔

تاہم

وقت کے ساتھ امن و آشتی سندھ کی دھرتی سے مفقود ہونے لگی۔ زمانے گزرتے چلے گئے۔ تمدنی لحاظ سے ہندو مسلم روایات کچھ مل جل گئیں۔ ثقافت میں بھی ہندووانہ رواج زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ مسلمان عموماً امن پسند اور سہل پسند طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے مذہبی کاوشوں میں نمایاں طور پر آگے نہیں بڑھے۔ عرس، خیرات نیاز وغیرہ کو مذہبی تقدس کی شکل دے کر مذہبی فریضہ جان لیا گیا۔ اگرچہ ملاؤں اور مذہبی ٹھیکیداروں سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھا۔ تاہم مذہب میں منافرت قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے مگر آہستہ آہستہ موجودہ دور میں مذہبی قدریں پامال ہوئیں تو کچھ مذہبی جنون سندھی روایات سے ہٹ کر دوسری اقوام میں دیکھا گیا۔ گو دھرتی سندھ کو منتخب کیا گیا۔ مگر جبر کو ہاتھ میں لینے والے نہ تو حُر ہیں نہ وڈیرے۔ یہ کوئی دوسرے جبہ پوش مقررا ور علماء سو ہیں۔ جو وادیٔ سندھ میں رہائش پذیر ہیں اور اس سفید سادہ خشک گرم زمین کو رنگین کر دیتے ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ

کس کس خوش نصیب کا خون ریگستانی سندھ کی آبیاری کرتا رہا. تو واضح ہو کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی بابرکت خلافت کے پہلے ہی سال سب سے پہلا شہید احمدیت سندھ کی زمین کا اپنا ہی بیٹا تھا۔ اور یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ ایک سندھی نے جان کی قربانی پیش کر دی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں کہ سندھی عموماً مذہبی کاوشوں میں نمایاں قربانیاں نہیں کرتے " مگر آج ایک سندھی " خلافت فورتھ کے پہلے شہید کا نام ماں باپ نے عبدالحکیم رکھا تھا۔ اور وہ بیشک حکمت والے خدا تعالیٰ کے سچے بندے تھے وہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک اڑو گھرانے میں بمقام کھنڈوں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے نہایت غریبی اور تنگدستی کی حالت میں پرورش پائی۔ ایام طفولیت میں ہی آپ والدِ محترم کی شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ کی والدہ کی بدولت ہوئی۔ میٹرک کرنے سے قبل ہی آپ نے سروس شروع کر دی۔ اور دوران سروس ہی آپ نے میٹرک پاس کی اور یہ میٹرک ہی آپ کے لئے صراطِ مستقیم کا نشان بن گیا۔

ہوا ایسے ؟

کہ آپ متعدد بار میٹرک کے امتحان میں فیل ہوئے۔ امتحان میں باربار فیل ہونے کی وجہ سے آپ دل شکستہ ہو چکے تھے۔ اتفاقاً آپ کے ایک عزیز نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ ایک حق کی آواز کو پہچان لیں۔ خدا تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے کسی تجربے کی بناء پر انہوں نے ایک مبشرات سامنے رکھ دی۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا کہ جماعت کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور بالآخر احمدیت خدا تعالیٰ کا نام لے کر قبول کر لی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا۔ کہ خدا نے اُس عزیز کی لاج رکھ لی اور عبدالحکیم صاحب کو معجزانہ طور پر میٹرک میں پاس کر دیا۔ علم کی تلاش میں نکلنے والے اڑو صاحب نے مہدی موعود کے سائے تلے پناہ لی اور ۱۹۵۴ء میں تقریباً ۲۲ سال کی عمر میں

بیعت کرلی ۔ آپ کو حق کی شناخت میں مدد دینے والا وجود محترم سید احمد علی شاہ صاحب کی شکل میں عطا کر دیا ۔ چونکہ آپ شروع شروع میں احمدیت سے کم واقفیت رکھتے تھے ۔ لیکن سید احمد علی شاہ صاحب کی صحبت میں آپ نے جذبہ، شوق اور دعا دونوں کو بر سر پیکار کیا ۔ اور اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بیعت کر کے نہ صرف واقفیت حاصل کی ۔ بلکہ شوق تبلیغ بھی دامن سے وابستہ کر لیا ۔ بحیثیت ایک استاد اور مبلغ شب و روز علم کے حصول میں صرف کرنے شروع کر دیئے ۔ ساتھ ساتھ اپنی تعلیم دوران سروس جاری رکھی اور سندھ یونیورسٹی سے بی اے، بی ایڈ اور ایم اے ایم ایڈ کے امتحانات پاس کر لئے اور اپنے آبائی گاؤں وارم کے بچوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا ۔ یہ حق انہیں بچوں کا تھا ۔ جو عبدالحکیم صاحب نے انہیں دینا شروع کر دیا ۔ لیکن ساتھ ہی ایک تڑپ تھی کہ میرے گاؤں کے بڑے لوگ اور وڈیرے روحانی علم سے بے بہرہ ہیں ۔ میں ان جوانوں اور بوڑھوں کو کس طرح دین حق کے قریب لاؤں ۔ یہ دین کی پیاس بجھانے کے لئے آپ صبح و شام تبلیغ کے مواقع ڈھونڈتے رہتے اور حوالہ جات اکٹھے کر کے کسی نہ کسی مقام پر تبلیغ کی محفل گرم کر لیتے ۔ حتیٰ کہ سفر کے دوران بھی آپ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے ۔ آپ کو خطبات خلفائے کرام کے علاوہ عمیق مطالعہ روحانی خزائن نے وہ بصارت عطا کی جو آپ کا حقیقی ورثہ بن گئی ۔ آپ نے اس روحانی کھیتی میں زراع کا کام کیا اور بیج ڈال دیئے ۔ روحانی اولاد خدا تعالیٰ پیدا کرے گا مگر جیسا کہ خلیفۃ المسیح الرابع فرماتے ہیں کہ جب آپ ایسا کریں گے تو قرآن کہتا ہے کہ یَغِیظَ بِہِمُ الْکُفَّار کہ دشمن اس پر لازماً غصہ کھائے گا ۔ دشمن غصہ کھاتا چلا گیا ۔ لیکن ابڑو صاحب بھی اپنی کھیتی میں جگہ جگہ بیج ڈالتے چلے گئے ۔ گاڑی میں بیٹھتے تو ریل گاڑی چل رہی ہوتی تو ابڑو صاحب ساتھی مسافر سے محو گفتگو ہوتے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر روحانیت کے پودے بو رہے ہوتے ۔ محفل میں جاتے تو اسلامی رنگ

سے محفل کو رنگین وگرم کر دیتے ۔

اصل

میں استاد اور مربی دونوں شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے دماغ میں تنظیم و تربیت کا پہلو اجاگر ہوتا ہے ۔ اور جس شخص کو چاٹ اسلام کی پڑ جائے اس کو بغیر اصلاح کے جینا مشکل ہوتا ہے ۔ وہ تختی کی اصلاح کرتا کرتا ۔ دماغ کی اصلاح کرتا ۔ اور دل کی اصلاح کرتا ہے اور روح کی اصلاح کرتا ہے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کی ہر بات میں تربیت کا رنگ مترشح ہوتا ہے ۔ اور ہر بات میں علمی نقطے کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ یہ ایک سانحہ ہو گا کہ اس کے گھر میں دینی ماحول نہ ہو اور اس کا گھر دینی مدرسہ نہ ہو اور اُس کا خاندان علم وعمل سے بے بہرہ ہو ۔

عبدالحکیم صاحب خوش نصیب مجاہدوں میں سے تھے کہ انہوں نے ہر گوشۂ میدان میں جہاد کیا ۔ اپنے سندھیوں کو اپنی زندگی میں یہ نُور خود بانٹتے رہے ۔ اور اپنی حیات کے بعد اپنے بیٹے کو سندھیوں کے سپرد کر گئے کہ وہ مجاہد اور مربی کے وجود میں ان کا گائیڈ بنے ۔ یہ بڑی بات ہے کہ باپ اور بیٹا دونوں ہی نورِ ہدایت اور شمع احمدیت کو سندھ کے جنگلوں میں روشن کرتے پھریں ۔ کبھی باپ بحیثیت استاد اور داعی الی اللہ اور کبھی بیٹا بحیثیت مربی اور داعی الی اللہ وڈیروں کے، بچوں کے، بڑوں کے، بوڑھوں کے اور عورتوں کے دروازوں پر اصلاح وارشاد کی دستک دیتا ہے ۔ یہ ایک تربیتی CHAIN ہے جو ارد گھرانے سے شروع ہوئی ہے ۔ خدا کرے کہ یہ CHAIN کبھی نہ ٹوٹے اور ہر آنے والا وجود زراع ہو اور روحانی اولاد پیدا کرتا رہے

خوش نصیب باپ نے شہادت کے وقت کوئی خواہش نہیں کی بلکہ اپنے بیٹے کو صداقتِ احمدیت کا زندہ ثبوت پیش کیا اور تاکید کی کہ میرے سندھ کو بے نور نہ رہنے دینا ۔ اس کی گلیاں، اس کے کوچے اور اس کے بازار احمدیت کے چراغ سے

روشن رکھنا۔ یہ مشعلِ احمدیت میرے ہاتھ سے تھام لو خدا تمہارا حافظ و ناصر ہو۔
آمین۔ ثم آمین۔

یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا (سورۃ مریم)

اے مومنوں اپنے اہل کو اور اپنی جانوں کو بھی دوزخ سے بچانا۔ یعنی اے مومنوں تمہارا فرض ہے کہ نہ صرف خود نیک بنو بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی بے دینی اور بد اخلاقی کی آگ سے بچاؤ۔ مومن مردوں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر وقت چوکس ہو کر رہیں اور نہ صرف خود نیکی اختیار کریں بلکہ اپنی بیویوں، اپنی لڑکیوں، اپنے لڑکوں اور گھر میں رہنے والے دیگر عزیزوں کی بھی نگرانی رکھیں۔ اور دینی اور دنیوی امور میں ان کی اچھی تربیت کرکے انہیں دوزخ کی آگ سے بچالیں۔ اس آیت کریمہ کی روشنی میں اگر دیکھیں تو وہ مرد مومن خود بھی چوکس رہتا۔ اور اپنے اہل و عیال کو بھی چوکس رکھتا۔ جیسا کہ شہید ماسٹر صاحب کا معمول تھا کہ تین نمازیں گھر پر ہی باجماعت ادا کرتے۔ فجر، مغرب اور عشاء تینوں نمازوں میں بچوں اور بیوی کو لے کر نماز باجماعت پڑھتے اور امامت کرتے۔ اگرچہ طبیعت میں حلم تھا۔ مگر نمازوں کے معاملہ میں خاص پابندی کرواتے تھے۔ اس کے بعد صبح کی تلاوت قرآن مجید پر خاص توجہ دیتے۔ اور قرآن مجید کی تلاوت ہر بچہ کو لازمی کرنی پڑتی یہاں تک کہ جب تک تمام بچے تلاوت قرآن الحکیم نہ کر لیتے۔ ناشتہ نہیں دیا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ باپ اپنی اولاد کا شفیق ترین "بابا" تھا۔ مگر اس کی شفقت و مہربانی ہمیشہ دین کے ساتھ جا کھڑی ہوتی۔ اور بچوں کو ایسے وقت میں ایک پابند مربی نما بابا کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگرچہ مارنے سے عبدالحکیم صاحب ہمیشہ احتراز کرتے تھے۔

قرآن مجید کی تلاوت کے علاوہ قرآنی دعائیں ازبر یاد کرواتے اور سنتے تھے۔ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے بیٹھتے قرآنِ مجید اور صد سالہ جوبلی کی دعائیں کثرت سے خود

بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اور اپنے اہل سے بھی پڑھواتے۔ بیشک انہی شب و روز کی دعاؤں کا اثر تھا کہ خدا نے وارہ شہر کے ایک شخص کو سندھی قوم کی قربانی کے لئے بنیادی اینٹ کے طور منتخب کر لیا۔ حالانکہ مطالعہ تاریخ احمدیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سندھ میں ایک تو احمدیت دیر سے داخل ہوئی اور دوسرے جو سندھی مخلص احمدی بھی تھے انہیں ایسے انعامات سے دوچار ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

اس لئے

قطعہ سندھ سے عبدالحکیم صاحب اڑو پہلے سندھی شہید ہیں۔ اگرچہ خیرپور سندھ کی زمین میں سنہ ۱۹۵۲ء میں چوہدری محمد حسین صاحب شہید کر دیئے گئے تھے اور پھر سنہ ۱۹۶۶ء میں محترم عبدالحق صاحب نور کو بھی کرونڈی سندھ میں احمدیت پر قربان ہونے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ پھر سنہ ۱۹۷۴ء میں عباس بن عبدالقادر اور عبدالحمید صاحب نے سندھ کے ریگستانوں کو اپنے خون سے رنگین کیا تھا۔

مگر ماسٹر عبدالحکیم صاحب اڑو اس سندھ میں پہلے سندھی احمدی شہید قرار پائے ہیں اس لئے یہ خوش نصیبی ہے کہ باوجود اس کے کہ ماسٹر صاحب نہ تو پہلے احمدی ہیں اور نہ ہی پہلے شہید۔ پھر بھی وہ ! وہ مقام پا گئے ہیں جو کسی قوم کی ترقی کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ یعنی ناکہ آپ سندھی قوم کے پہلے شہید ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِکَ۔

آپ کے بیٹے ریاض احمد ناصر لکھتے ہیں کہ

"گھر کا ماحول مذہبی ہونے کی بنا پر اردگرد لوگوں پر اس کا بہت اچھا اثر تھا۔ چنانچہ والد صاحب کی شہادت کے بعد بعض لوگوں نے بعض غیراز جماعت افراد سے سوالات کئے۔ کہ کیا نقص تھا، کیا برائی تھی اس شخص میں جس کو آپ لوگوں نے

اس بیدردی سے شہید کر دیا تو انہیں میں سے ایک شخص بولا ماسٹر صاحب نہایت شریف آدمی تھے۔ ہم جب بھی آپ کے دروازے سے صبح کے وقت گزرتے تو تلاوتِ قرآن الحکیم کی آواز بلند ہوتی ہوئی سنتے تھے۔ باقی سارے شہر میں تلاوت قرآن پاک کی آواز کبھی بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ گویا یہ گھر کا ماحول بن چکا تھا کہ قرآن مجید کی آواز فجر کی نماز کے بعد اُس گھر سے ضرور بلند ہوتی اس میں تمام بچے، بوڑھے، بڑے اور چھوٹے، مرد اور عورتیں بھی تلاوت کرتے تھے۔ نمازوں میں باقاعدگی کی وجہ سے ہمارے محلہ کی ایک لڑکی جو کہ اُس وقت پردہ کرتی تھی جب بھی ہمیں نماز باجماعت پڑھتے دیکھتی ہمارے ساتھ ضرور شامل ہو جاتی۔ حالانکہ وہ لڑکی خود اہلِ حدیث ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ساتھ مل کر نماز پڑھتی تھی۔"

"یہ ایک نمونہ تھا"

جو نیک دل لوگوں کو بھاتا تھا۔ مگر شریر دل کو برافروختہ کرتا تھا۔ وہ شریر دل غضب میں آتا تھا اور حیلے تلاش کرتا تھا۔ ایک دن اُسے وہ حیلہ مل گیا کہ اُس نے اپنے منصوبے کی تکمیل کی مگر اس ایک گھڑی اللہ تعالے نے ایک داعی کو زندہ جاوید بنا دیا۔

اور

چونکہ ماسٹر صاحب بحیثیت صدر مجلس اور زعیم انصاراللہ ایک مثالی نمونہ تھے۔ اس لئے ہر قدم ان کا اپنا نقش چھوڑتا تھا۔ وہ خود جمعہ کو بہت اہمیت دیتے۔ دوستوں، بچوں اور بیوی سے بلند توقعات رکھتے تھے۔ اور انہیں جمعہ کی نماز سے ناغہ پر سرزنش بھی کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ تربیت اولاد کے لئے ضروری ہے کہ والدین نیک اور متقی اور راست باز ہوں، کیونکہ اولاد والدین کی خاموش محاسب ہوتی ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات کو گہری نظر سے دیکھتی ہے اور اثر قبول کرلیتی ہے۔ اس اثر کی بنیاد پر

وہ ہمیشہ چوکس رہتے اور اعلیٰ و عمدہ اثر دینے کے لئے اولاد کے سامنے کوئی غفلت ولاپرواہی نہ ہونے دیتے۔ کیونکہ اولاد ہمیشہ ماں باپ کے قدموں کی چھاپ پر چلتی ہے۔ اس لئے زندگی میں تضاد اولاد کے لئے جہنم کو قریب کر دیتا ہے۔

وہ جمعہ کے روز شہر کے بازار میں چکر لگا کر آتے کہ اگر کوئی گاؤں سے احمدی رشتہ دار یا دوست آیا ہے تو اُسے نماز جمعہ کے لئے کہہ دیتے کہ فلاں وقت اور فلاں جگہ نماز جمعہ ہوگی اور آپ ضرور بہ ضرور تشریف لائیں۔

اسی طرح

رمضان کے مہینے میں بہت زیادہ عبادت بجا لاتے اور روزے بڑی باقاعدگی سے رکھتے۔ اس مہینے میں سفر کرنے سے کتراتے کہ سفر کی وجہ سے روزہ رہ جائے گا۔ نیز سفر میں روزہ رکھنے کے سخت خلاف تھے۔ اگر کوئی مجبوراً جاتا کہ میرا فلاں کام، لاڑکانہ حیدرآباد یا کراچی میں ہے اور میرے ساتھ ضرور چلنا ہے تو انسانی ہمدردی کی بنا پر رمضان میں سفر پر جاتے۔ ورنہ نہیں۔ نماز کے بابرکت ایام میں تمام اطفال اور بڑوں کو بھی اٹھاتے اور انہیں عبادت کرنے کو کہا کرتے تھے۔ کوشش کرتے کہ اطفال سے دو چار نفل پڑھوا لیتے اور پھر بعد میں کہتے کہ اچھا اب تم سحری کھا سکتے ہو۔

عمومی طور پر چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے قرآنی دعائیں اور صد سالہ جوبلی کے لئے منتخب دعائیں کثرت سے پڑھتے رہتے تھے۔

خدمت خلق وجذبہ تبلیغ

یہ نتیجہ تھا اس سچی لگن کا اور روحانی تڑپ کا جو عبدالحکیم اڑو صاحب کے رگ و ریشہ میں رچی بسی ہوئی تھی کہ مخلوقِ خدا یعنی ان کے اپنے ہی گاؤں والے کہیں غفلت میں نہ رہ جائیں اور اس طرح وہ بیداریٔ دین کا پیغام ان کے گھر گھر لے کر

جاتے تھے۔ وہ ایک نڈر، دلیر، بہادر داعی الی اللہ پیامبر انسان تھے۔ کئی بار زندگی میں تلخیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر ہمیشہ دینی احکامات کو مدنظر رکھا اور کوئی موقعہ فرض شناسی اور خدمت خلق کا ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ بے شک حقیقی اور موثر انداز عملی نمونہ ہی ہوتا ہے۔ جو انسان کی شعلہ بیانی سے زیادہ اثر رکھتا ہے اور یہ جذبہ خدمت خلق آپ میں کمال درجہ کا تھا۔" یہ وصف ان کے اندر احمدی ہونے سے بھی پہلے تھا۔ مگر احمدی ہونے کے بعد تو اور زیادہ نمایاں ہو کر ظاہر ہوا۔ بغیر کسی معاوضہ کے ہر وہ کام جو ان کے بس میں ہوا کرتے تھے کر دیا کرتے تھے اور دوسروں سے بھی کروا دیا کرتے تھے۔ کام خواہ کتنا ہی مشکل ہو۔ ہر ممکن کوشش کرتے کہ کسی طرح فلاں آدمی کا کام ضرور ہو جائے تاکہ اس کی مشکل دور ہو جائے۔ اس میں کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اور احمدی اور غیر احمدی کی تفریق بھی مدنظر نہیں رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک غیر از جماعت" اسکول ماسٹر" نے ہائی اسکول وارہ میں ایک سرکلر پاس کروایا جس میں لکھا تھا کہ" کہ آئندہ کوئی استاد احمدی اساتذہ کو سلام نہ کرے اور نہ سلام کا جواب دے۔ چنانچہ یہ سرکلر والد صاحب کے پاس بھی آیا۔ ان پر اس کا بڑا دکھ والا اثر ہوا۔ انہوں نے دکھ کا اظہار بھی بہت کیا۔ کہ یہ فلاں فلاں شخص کی شرارت ہے۔ اتفاق سے اس کر مخالفت کرنے والے استاد کی کچھ اضافی تنخواہ اکاؤنٹنٹ جنرل کراچی کے دفتر میں رک گئی تھی۔ تقریباً یہ رقم چار ہزار روپے کے قریب تھی۔ کراچی آفس والے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ کچھ دے دو تو ہم تمہارا کام کر دیں گے۔ وگرنہ ہم نہیں دیں گے۔ چنانچہ وہ خود دینے سے انکار کرتے رہے اور بالآخر کام بالکل بگڑ گیا۔ اتفاق سے ایک ایسا وقت آیا کہ والد صاحب کو اپنے کسی کام کے لئے کراچی جانا پڑا۔ وہاں اپنا کام کرنے کے بعد دو دن مزید لگا کر اس آدمی کا کام کروا کر اس کے نام کا چار ہزار روپے کا چیک لے کر آئے۔ اگلے دن صبح صبح نماز فجر کے معاً بعد ان کے گھر جا کر

دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ صاحب باہر آئے آتے ہی والد صاحب کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے کہ آج ماسٹر صاحب اس وقت اچانک کیسے صبح صبح میرے گھر پر حاضر ہوئے ہیں۔ جیسے ہی وہ صاحب قریب آئے ہاتھ ملایا سلام کیا اور پوچھا کیسے آنا ہوا؟ والد صاحب نے وہ چیک اپنی جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ ماسٹر صاحب یہ کام اور آپ؟ مراد اس کی یہ تھی کہ ہم آپ کے ساتھ اسکول میں کیا برتاؤ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کس قدر مہربان ہیں۔ کہ بغیر کہے آپ کام کروا لاتے ہیں اور پھر بولا ضرور آپ نے رشوت دی ہوگی؟ والد صاحب نے جواب دیا کہ میں نے کوئی رشوت نہیں دی۔ ہاں البتہ دو دن دفتر میں دوڑ دھوپ کرتا رہا ہوں اور ۳۰ روپے اپنا خرچہ کیا ہے۔ جو کراچی میں مزید رہنے کی وجہ سے لازمی تھا چنانچہ اس نے ۱۰۰/- روپیہ نکال کر والد صاحب کو دینے چاہے۔ مگر والد صاحب نے اس سے کہا کہ "اب آپ رشوت مجھے دینا چاہتے ہیں۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ واللہ۔ ۳۰ روپے بہت تھوڑے ہیں۔ کراچی جیسے شہر میں۔ آپ نے دو دن خرچہ کیا۔ اس لئے ۱۰۰ روپے دے رہا ہوں۔ اگر آپ نے نہ لئے تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ چنانچہ بے حد اصرار پر ابا جان نے وہ رقم قبول کی اور ایک مخالف کا ہمیشہ ہمیش کے لئے دل جیت لیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگوں کی خدمت کرنے کی وجہ سے لوگ آپ سے بہت اچھے انداز سے پیش آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ (۱) ۱۲ ہزار لوگ آپ کے جنازے میں شامل تھے۔ جب کہ شہر کی آبادی ۸۰ ہزار کے نفوس سے زائد نہ تھی (۲) عوام انتظامیہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور قاتلوں کی گرفتاری چاہتے تھے اور فوری طور پر پھانسی کا مطالبہ کرتے تھے (۳) اسی دن تمام شہر اپنے کاروبار بند کر کے بیٹھ گئے۔ (۴) جلوس تمام شہر میں چکر کاٹتا رہا۔ (۵) غم و غصہ کا اظہار اس حد تک کیا کہ انتظامیہ نے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے اپنی ہر کوشش تیز کر دی اور بالآخر قاتل گرفتار ہو گئے۔

یہ تمام عوامل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ شخص ایک استاد ہی نہیں تھے محبوب مربی بھی تھے جو ہر کسی کی اصلاح اپنے نمونہ سے کسی نہ کسی طرح ضرور کرتے تھے۔ ہمدردی ان کا شیوہ تھا۔ خدمت خلق کے لئے خود کو وقف کر چکے تھے اور اکثر اپنی اولاد کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ

خداداری چہ غم داری

" دیکھو بیٹا! لوگ میری بڑی عزت کرتے ہیں اور اچھے طریقے سے پیش آتے ہیں۔ دراصل یہ احمدیت کی برکت ہے۔ ورنہ ہماری کیا اوقات ہے۔

شجاعت و بہادری

یہ اوصاف ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ خوفِ خدا رکھتے۔ اور خوفِ دنیا کو اپنے پاس بھی پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی بہادری و بے خوفی دنیا والوں کے سر چڑھ کر بولی۔ اور دنیا والے اندھے ہو گئے کہ اپنا جنون ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کے لئے تو جنت کا راستہ ہموار کر دیا۔ اور خود اندھیرے میں جا گرے وہ تو زندہ بھی شجاعت اور بہادری سے رہے اور رخصت بھی بہادری سے ہوئے۔ ۷۱ سال کی عمر میں ۲۸ زخم کلہاڑیوں اور کلہاڑوں سے کھانے والے ماسٹر صاحب موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ تو سب سے زیادہ روشن ان کے سامنے ان کا مسلک تھا۔ وہ درد و دوا کی پکار کی بجائے اپنے قریب لوگوں سے یوں گویا ہوئے۔ جس مسلک کو میں نے پکڑا ہے خدا کی قسم وہ جھوٹا نہیں ہے۔ نہ ہی میں نے کوئی بزدلی دکھائی ہے۔ اور نہ ہی میرے قدم اس راستے میں ڈگمگائے ہیں۔ ہاں میرے مقدر میں اے مخالفو! **شہادت** ہے اور تمہارے مقدر میں **نحوست** اور **ہلاکت** کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ نے باآواز بلند سندھی زبان میں یہ نعرہ لگایا۔ احمدیت سچی آہے احمدیت سچی آہے۔ احمدیت سچی آہے یعنی احمدیت

بالکل سچی ہے ۔ فسبحان اللہ علیٰ ذالکؑ

عبدالحکیم اکڑو صاحب بحیثیت داعی الی اللہ

پس پھر کیا تھا ۔ یہ پیغام خلافت آپ کی روح میں اُتر گیا۔ آپ میں ایک نیا ولولہ اور ایک نیا جوش پیدا ہوا ۔ لفظ نے اپنا رنگ جمایا اور عبدالحکیم صاحب میدانِ عمل میں پہلے سے بڑھ چڑھ کر نظر آنے لگے ۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے پھل بھی عطا کئے تبلیغ کے میدان میں آپ بہت نڈر تھے ۔ چنانچہ آپ تمام سرکاری وغیر سرکاری جگہوں پر جاتے اور لٹریچر تقسیم کرتے تھے ۔ کوئی کسی قسم کا خوف طبیعت میں نہیں تھا ۔ پوری طرح متوکل تھے کہ خداوند عالم موقع عطا کر رہا تھا تو کیونکر فائدہ نہ اٹھایا جاتا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنا نصب العین ہی تبلیغ بنایا اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے وارہ کے شہر میں ہر چھوٹے اور بڑے شخص کو خدا کے پیغام کی طرف متوجہ کیا حتیٰ کہ سرکاری دفاتر میں تحریک جدید، انصار اللہ اور دوسرے رسائل جاری کروا دیئے ۔
مخالفوں نے جب آپ کو تبلیغی میدان میں اس قدر سرگرم عمل دیکھا تو آپ کی طرف دھمکی آمیز خطوط لکھنے شروع کر دیئے ۔ جن کا مضمون نہایت گندہ بلکہ شرمناک حد تک گالیوں سے بھرا ہوتا ۔ ایک شریف آدمی پڑھ بھی نہیں سکتا تھا ۔ ماسٹر صاحب گاہے بگاہے حضور پُر نور کو آگاہ بھی کرتے رہتے تھے ۔

لیکن

شوقِ تبلیغ میں ایک بات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے کہ حکومت وقت کی حکم عدولی نہ ہونے پائے ۔ کبھی بھی کسی پیریڈ میں تبلیغی باتیں نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ ہمیشہ کلاس کو توجہ سے پڑھاتے رہتے تھے ۔ اسکول ٹائم ٹیبل اور پروگرام کی ہمیشہ قدر کرتے رہے ۔ سچا اور عمدہ نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرتے ۔ ہیڈ ماسٹر یا دوسرے اساتذہ کے لئے اعتراض

کا موقع ہی پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول میں اپنے طلبہ کے علاوہ
اسٹاف میں بھی عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اس سات ہزار
پر مشتمل شہر کے استاد المکرم تھے جن کا اوڑھنا، بچھونا توکل تھا۔ جن کا نمونہ شاگردوں
اور محلہ والوں کے سامنے ہمیشہ قابلِ تحسین رہا۔ آج حبیب اسی شہر کے دو معمولی پیشے
والے ناعاقبت اندیش سوچی رات کی تاریکی میں حسن واحسان کو خون کا غسل دینے
جائیں گے تو کون سی انسانی آنکھ آنسو نہ بہائے گی اسلیئے آج ۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء وارہ
شہر کا ہر گھر غم وغصّہ کی لہر سے بھر گیا اور گلیوں بازاروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

جب لوگوں نے سُنا کہ ہمارا قومی خدمت گار آج نہایت بیدردی اور سفا کی
سے شہید کر دیا گیا ہے تو لوگوں کے غصّہ کی انتہا نہ رہی۔ شہر کی تمام آبادی نے ہسپتال
کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ کیونکہ وہاں میّت پڑی ہوئی تھی۔ ارد گرد کے لوگ تحصیل وارہ
میں جمع ہو رہے تھے۔ عوام کا یہ شدید مطالبہ تھا کہ پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے کیونکہ وہ
سمجھتے تھے کہ اس سے میّت کی بیحرمتی ہوتی ہے۔ اور لوگ خود والد صاحب کا بہت
احترام کرتے تھے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ صرف زخم سی دیئے جائیں مگر پوسٹ مارٹم
ضروری تھا۔ جو اہوا ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق زخموں کی تعداد تیس کے قریب تھی۔ ڈاکٹر
نے بتایا کہ بعض زخم دو۔ تین انچ گہرے تھے۔

ڈاکٹری کارروائی کے بعد لوگوں نے جنازہ کو محبّت میں مغلوب ہو کر اپنے قبضہ
میں لے لیا اور ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ قاتلوں
کے خلاف لعن طعن کی۔ انتظامیہ کے خلاف نعرے لگائے اور بڑے زور سے ان
کا مطالبہ تھا کہ قاتلوں کو پھانسی دی جائے۔ اس وقت جلوس میں شامل تقریباً گیارہ
ہزار لوگ تھے۔ حالانکہ شہر کی آبادی تقریباً سات ہزار تھی۔ بقیہ لوگ وارہ کے نواحی
علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ آپ کا جنازہ جب شہر کے درمیانی ایک چوک میں

رکھا گیا تو لوگ فرطِ محبت سے صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ سب لوگ آپ کے نہایت قریبی رشتہ دار ہیں کوئی آنکھ نہیں تھی۔ جو پُرنم نہ ہو۔ دراصل یہ آپ کی سابقہ خدمات کا نتیجہ تھا کہ تمام شہر آپ کے سوگ میں اس دن بند رہا اور ٹریفک معطل رہا۔[1]

(اقتباس روزنامہ لاہور ۷ر مئی ۱۹۸۳ء)

۱۹۸۳/۴/۱۶ - آج صبح گیارہ بجے جب مرحوم کی نعش شہر کے وسط بازار میں آخری دیدار کے لئے رکھی گئی تو سینکڑوں افراد بلند آواز سے رونے لگے۔ مرحوم کا چھوٹا بیٹا جو کسی کام کے سلسلہ میں باہر گیا ہوا تھا جب اپنے والد کی نعش کے پاس آیا تو اُسے وقفہ وقفہ سے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ شہر کا تمام کاروبار اور ٹریفک صبح سے لیکر دوپہر ایک بجے تک اس معزز شخصیت کے سوگ میں بند رہے۔ شہر کے معزز افراد نے انتظامیہ پر زور دیا کہ ملزمان کا ملٹری کورٹ میں چالان کیا جائے۔

خلفائے احمدیت کے ساتھ سچی وابستگی اور عقیدت

خلفائے احمدیت کے ساتھ دلی لگاؤ اور وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ ماسٹر صاحب کسی نہ کسی نمونہ سے مرکز کے چکر کاٹتے رہتے اور چکر کاٹنے میں خوش ہوتے وہ کوشش کرتے کہ اجتماع، جلسہ سالانہ، شوریٰ اور میٹنگز میں ربوہ میں خلیفۂ وقت کی زیارت کر سکیں۔ ہمیشہ۔ نہ صرف خود کوشش کرتے کہ جماعت کے کاموں میں پیش پیش رہیں بلکہ اپنے گاؤں کے احباب کو بھی ترغیب دلاتے کہ حتی الامکان ربوہ میں امام وقت کے ساتھ لمحاتِ زندگی بسر کریں۔ بسا اوقات بعض افراد کی ٹکٹیں

---

[1] روزنامہ عبرت صفحہ ۶ کالم ۱،۲

بھی اپنی جیب سے خرید کر دیتے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ٹکٹیں واپس کرنی پڑیں اور کئی دفعہ ضائع ہوئیں۔ مگر وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے کہ نظام خلافت کو تازہ وزندہ رکھنے کے لئے مرکز کی طرف قصداً سفر کرتے رہنا ضروری ہے۔

پس خلافت کا احترام اور عقیدت آپ کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا تھا۔ کئی واقعات ایسے نمایاں سامنے آتے رہتے کہ جس سے بہ صاف ظاہر ہوتا کہ ماسٹر عبدالحکیم صاحب کی رُوح میں اپنے امام ہمام سے دلی عقیدت جاگزیں ہے مثلاً عزیزم ریاض احمد ناصر مربی سلسلہ لکھتے ہیں کہ:۔

"۷۲-۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ میں اس وقت چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھا کہ والد صاحب مرحوم کے اچھے اور گہرے دوست تھے جو ہمارے قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ اتفاق سے ان دنوں انور آباد میں بطور ہیڈ ماسٹر متعین تھے۔ ان دنوں سندھ کے اساتذہ اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال پر تھے اور تمام کے تمام اساتذہ نے سیاہ پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ چونکہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی ہدایت تھی کہ کوئی احمدی گورنمنٹ ملازم ہڑتال میں شامل نہ ہو۔ چونکہ یہ حضور کا ارشاد تھا۔ اس لئے والد صاحب نے پوری کوشش کی کہ اپنے آپ کو کلیتہً ہڑتال سے دُور رکھیں۔ جب بھی ہیڈ ماسٹر صاحب دیر سے آتے تو ابا جان مرحوم لڑکوں کو درس و تدریس میں مشغول رکھتے۔ چنانچہ اس پر دونوں دوستوں میں بڑی ناراضگی پیدا ہوگئی۔ ابا جان کے دوستوں نے بڑی کوشش کی کہ آپ صرف ہاں کر دیں۔ باقی دلی طور پر بیشک اپنے آپ کو اس ہڑتال سے دور رکھیں لیکن والد صاحب نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔ آپ نے انہیں برملا بتایا کہ میں خلیفۃ المسیح الثالث کے حکم اور ارشاد کو باقی تمام دنیاوی حکموں سے برتر اور بالا سمجھتا ہوں اگر اس پر کسی کو ناراضگی ہوتی ہے تو مجھے کچھ پرواہ نہیں"۔ چنانچہ والد صاحب کے دوست نے وہاں سے ٹرانسفر کروالی۔ جاتے ہوئے انہوں

نے آخری دعوت بہت اصرار کے بعد قبول کی۔ اور اپنی الوداعی تقریر کر رہے تھے تو والد صاحب اشکبار تھے کہ ایک اچھا دوست جدا ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ برداشت کیا۔ لیکن امام وقت کے حکم سے انحراف نہیں کیا۔

۲۔ اسی طرح ایک اور چھوٹا سا واقعہ ہے۔ لیکن اپنی نوعیت میں بہت بڑا ہے۔ میرے سب سے چھوٹے بھائی کا نام عبدالسمیع فیض تھا۔ ایک دن بیٹھے میرے دل میں خیال آیا کہ اگر اس کا نام عبدالسمیع کی بجائے فیض احمد فیض رکھ دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ باقی تمام بھائیوں کے ناموں کے ساتھ "احمد" لگتا ہے۔ اس لئے اس کا نام بھی احمد کے ساتھ رکھ دیا جائے۔ اس خواہش کا ذکر میں نے اپنے والد سے کیا۔ والد صاحب نے سنتے ہی کہا تم کیا حق رکھتے ہو کہ خلیفہ وقت کے رکھے ہوئے نام کو تبدیل کر دو۔ چنانچہ اگلے روز فوری طور پر شہر کے پرائمری اسکول میں جاکر WAITING LIST میں اس کا اصل نام درج کروا آئے۔ یعنی حضور خلیفۃ المسیح کا تجویز کردہ نام اسکول کے رجسٹر میں درج کروا آئے۔ تاکہ کسی وقت بھی اس کا نام تبدیل نہ کر سکیں۔ حالانکہ اس وقت اس کی عمر ۱/۲ سال تھی۔ تو یہ تھا جذبہ اطاعت ایک شہید ہونے والے منعم شخص کا۔ یہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ شہادتیں کوئی "اتفاق" قسمت میں نہیں آجاتیں۔ بلکہ ان شہید ہونے والے لوگوں کے رگ و ریشہ میں، اخلاق اور دین متین ایک اپنا مقام بنا چکا ہوتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں (ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات) اسی طرح شہید کی زندگی کے شب و روز بھی اطاعت، شجاعت اور عبادت سے عبارت ہوتے ہیں تبھی تو خدا تعالیٰ اتنے بڑے انعام کے لئے منتخب کرتا ہے اور یہ انعام خدا تعالیٰ رحمت کے ساتھ اسی کو دیتا ہے جو رات دن اعمال صالح بجا لاتے ہیں۔

مذہبی معاملے میں غیرت اور بہادری کا مظاہرہ

بھٹو حکومت کے بعد ضیاء دور میں پہلے (B.D) بلدیاتی انتخابات ہونے والے تھے فہرستیں تیار ہو رہی تھیں۔ والد صاحب کو تحصیل کے کسی بڑے افسر نے بلایا۔ آپ گئے۔ انہوں نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ اپنے ووٹ کا اندراج کیوں نہیں کرواتے ہے؟ والد صاحب نے اسے کہا کہ "ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ اس نے کہا کیوں؟ آپ نے کافی بحث کے بعد اسے بتایا کہ کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ ایسے فارم پر دستخط کریں جس پر یہ لکھا ہو کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر میرا کوئی ایمان نہیں ہے۔ اُس نے کہا یہ تو میں قطعاً نہیں کروں گا۔ والد صاحب نے جواب دیا کہ پھر آپ مجھ سے اس قسم کی کوئی توقع رکھ سکتے ہیں کہ میں ایک ایسے فارم پر دستخط کردوں جس میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت اور اپنے امام کا کلیتہً انکار کیا گیا ہو۔ بالآخر جب وہ افسر مطمئن نہ ہوا تو اُس نے اپنی افسری دکھاتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ میں آپ کو گرفتار کروا دوں گا۔ اس لئے کہ تم صدر جماعت ہو تم یہ کام نہ کرو گے تو دوسرے احباب بھی نہیں کریں گے۔ والد صاحب نے جواب دیا کہ "ہر دو صورتوں میں گرفتاری کو ترجیح دیتا ہوں۔" ساتھ اُسے پُر رعب الفاظ میں جواب دیا کہ تم یاد رکھو! یہ تمہاری کرسی بھی ہمیشہ کے لئے نہیں رہے گی۔ تم نے جو کرنا ہے کر لو۔ میں اپنے ملک اور عقیدے کو ہر صورت میں تمام حکموں پر فوقیت دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ عزم اور حوصلہ دیکھ کر وہ افسر اپنے ہوش میں آ گیا۔ اس کے بعد والد صاحب گھر تشریف لے آئے۔

جلسہ سالانہ پر جب بھی آتے اپنے ساتھ غیر از جماعت۔ دوستوں کو ضرور لاتے انہیں اچھی طرح ربوہ دکھاتے۔ جلسہ کی مکمل کارروائی انہیں سنواتے۔ واپسی پر وہ غیر

از جماعت دوست نہایت اچھا تاثر لے کر واپس لوٹتے تھے۔ ایک دفعہ ایک جلسہ سے واپسی پر والد صاحب مرحوم نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کا انگریزی میں چھپا ہوا ایک پاکٹ بیج (LOVE FOR ALL , HATARED FOR NONE) ساتھ لے کر گئے۔ اسکول کا ہیڈ ماسٹر چونکہ مذہبی آدمی نہیں تھا۔ اس لئے مذہب سے بالکل متنفر تھا۔ خصوصاً علماء سے تو کافی حد تک (یعنی ملاؤں سے بہت زیادہ نفرت کرتا تھا جس کی بناء پر والد صاحب سے بھی کبھی کبھار مذہب کے معاملہ میں تلخ کلامی کر لیتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی اس کی نظر اس بیج پر پڑی۔ اس نے بلند آواز سے حضور پُر نور کے یہ الفاظ دہرائے۔ ساتھ ہی کہا کہ یہ الفاظ کتنے پیارے ہیں۔ یہ تو ایسے الفاظ ہیں کہ ان کی کوئی قیمت بھی نہیں۔ اس نے اس کی بہت زیادہ تعریف کی۔ ساتھ ہی والد صاحب سے کہنے لگے کہ یہ مجھے دے دو۔ چنانچہ والد صاحب نے اُسے دے دیا۔ اس نے وہ اپنے سینے پر سجا کر لگا لیا اور بہت اچھے انداز میں اس کو پڑھا۔ چنانچہ اُسے یہ بھی بتایا گیا کہ یہ ہمارے امام کے مبارک الفاظ ہیں۔ اس نے جواباً کہا کہ ہمیں تو ان الفاظ سے سروکار ہے باقی تم جانو اور تمہارا امام۔

چنانچہ یہ الفاظ اس ہیڈ ماسٹر کے دل پر اس قدر نقش ہو گئے کہ بعد میں اُس نے اسکول کا ایک بیج تیار کروایا جس میں اس نے کچھ انگریزی حروف لکھنے کے بعد آخر میں موٹے حروف کے ساتھ LOVE FOR ALL HATARED FOR NONE لکھوا دیا۔ اور یہ بیج تقریباً ۸۰۰ سو طلباء اپنے اپنے جیبوں پر سجا کر صبح صبح اسکول جایا کرتے تھے۔

سدا اپنے حکموں کا محکوم رکھے	ہمارا خدا ہم کو مظلوم رکھے
وہ اپنی محبت میں سرشار رکھے	سدا دیں کے کاموں میں ہشیار رکھے

تدفین

تدفین : دنیا کے تمام مسائل اور بکھیڑوں سے ہٹ کر آخری عمل تدفین ہی رہ جاتا ہے۔ یہ آخری خدمت ہوتی ہے۔ جو احباب اور لواحقین اپنے پیارے کے لئے دعاؤں سے کرتے ہیں۔ آج ۱۶ر اپریل ۱۹۸۳ء کو ماسٹر عبد الحکیم ابڑو صاحب شہید کی تدفین کے موقع پر ہزاروں سوگوار جلوس کی شکل میں ساتھ تھے۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ وضاحت ہو جائے گی کہ ایک گاؤں کھنڈوں سندھ میں پیدا ہونے والا غریب الحال بچہ باپ کی سرپرستی سے محروم ایک استاد کی زندگی گزارتا تھا۔ اور ایک دن آخری گھڑی یعنی وفات کے وقت کسی نا عاقبت اندیش کی حرکت سے اتنا مقبول ہوا کہ خاص وعام اور اپنے پرائے گاؤں کے گاؤں اس کے سوگ میں سوگوار ہو گئے۔ اور اس کی آرام گاہ تک اُسے ساتھ چھوڑنے گئے۔ آخر کیوں ؟ صرف اس لئے کہ وہ دین کا فدائی تھا۔ اور دین پر ہی فدا ہو گیا۔ اس نے اپنے دین کے بدلے اپنا سر بطور ہدیہ پیش کر دیا۔ اس طرح اس نے دین کی بنیادوں میں اپنے خون سے آبیاری کی تھی۔ وہ مصداق ہے اپنے محبوب امام کے اس خطاب کا جو خلیفۂ وقت نے اس کی شہادت پر دیا تھا۔ فرمایا تھا۔ "حقیقت یہ ہے کہ آج ہم وہ روحیں ہیں جن کے ذریعے سے دنیا میں انقلاب برپا ہو گا۔ ہم وہ انقلابی ہیں جن کے ذریعے سے دنیا کی تقدیر بدل دی جائے گی۔"

آخری حالت نزع میں بھی یہی الفاظ دہرائے کہ

بیٹا ریاض ! "میں تو اب بچ نہیں سکوں گا۔ مگر یہ یاد رکھو کہ احمدیت بالکل سچی اور برحق ہے۔ اور تم اپنا وقف ہرگز نہ توڑنا۔" وارہ میں نماز سید احمد علی شاہ صاحب نے پڑھائی۔ بعد میں آپ کے پیدائشی گاؤں کھنڈوں میں نماز جنازہ پڑھائی گئی اور وہیں امانتاً دفن کئے گئے بعد میں ۲۶ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو میت ربوہ لائی گئی ۔ اور اگلے

دن ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو بہشتی مقبرہ میں دفن کر دیئے گئے۔

پیارے آقا کو جب اس اندوہناک حادثہ کی اطلاع ملی تو آپ کو بہت صدمہ ہوا اور اپنے خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء بمقام بیت الاقصیٰ ربوہ میں ان الفاظ میں شہید کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

" وہ صبر اور ثابت قدمی سے احمدیت پر قائم رہے۔ حتیٰ کہ ان کو کلہاڑیوں کے پے در پے وار کر کے ختم کر دیا گیا۔ وفات کے بعد ان کے جسم پر کلہاڑیوں کے اٹھائیس زخم پائے گئے۔"

اسی طرح آپ نے دعا کی کہ

"خدایا مرحوم کی بیگم کو لمبی اور کامل صحت والی زندگی عطا فرما تا کہ وہ پیچھے اپنے چھوٹے بچّوں کا سہارا بن سکے۔"

چنانچہ پیارے امام کی دعاؤں کی بدولت اور معجزانہ طور پر والدہ کو بہت جلد صحت یابی ہوئی۔ اسی طرح آپ کی طرف سے پیار اور شفقت آمیز خط خوبصورت تعزیت نامہ کے ہمیں موصول ہوا جس کا متن درج ذیل ہے۔

آپ کا خط مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء کو موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حافظ و ناصر ہو۔ اور آپ کے والد صاحب مرحوم و مغفور کی وصیت جو آپ کے لئے ہے اُسے کما حقہٗ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کو مقبول دین کی توفیق بخشے اور اس کی اس عظیم قربانی کو قبول فرماتے ہوئے اعلیٰ علیّین میں انہیں بلند مقام عطا فرمائے اور آپ سب کو اس عظیم صدمہ کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین۔ خدا کرے کہ اس قربانی کے نتیجہ میں یہ سرزمین ظلم اور جہالت میں خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو بڑھانے کی بجائے اس سے صلح اور اس کی اطاعت کی طرف مائل ہو۔ اور اس کے فضلوں اور رحمتوں کی وارث بنے اور احمدیت کے نور سے اس سرزمین پر بسنے والوں

کے دل منور ہو جائیں۔ اور خدا تعالیٰ کی حقیقی محبت انہیں حاصل ہو جائے اور ان کی رضا
ان کا مقصود ہو۔ آمین

اے شہید باوفا!
ہم یقین رکھتے ہیں کہ تیری یہ قربانی کبھی رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ تجھے
تیرے خدا کی طرف سے ضرور رزق دیا جائے گا۔ پس اے خلافتِ رابعہ کے پہلے
شہید تیرے خون کا ایک ایک قطرہ چمنِ احمدیت کی آبیاری کرے گا اور تیری روح
ایک دن اس قربانی کو ایک تناور درخت کی صورت میں دیکھ کر یقیناً خوش ہوگی
انشاء اللہ تعالیٰ۔

"خدا کی قسم اس دن کا منظر جس دن اس مظلوم کا جسم ۲۸ کلہاڑیوں کے
زخموں سے چور تھا۔ بسترِ مرگ پر یہ صدا بار بار بلند کر رہا تھا۔ کہ میں جس مسلک پر
جان دے رہا ہوں یہ مسلک حقیقی اور سچا ہے۔ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹنا۔ گویا وہ
دن والد صاحب کی شہادت کا ہمارے تجدید بیعت کا دن تھا۔

عجب دکھ بھرا سانحہ سن لیا ہے — تیری موت کا واقعہ سُن لیا ہے
تری زندگی صاف روشن نگیں تھی — کسی سے تیری دشمنی بھی نہیں تھی
ترا نزع کے وقت بیٹے سے کہنا — سدا احمدیت کے شیدائی رہنا
یہی ایک مسلک ہے دنیا میں سچا — نہیں کوئی دُر احمدیت سے اچھا

جناب ماسٹر عبدالحکیم ابڑو کی یاد میں

کب زمانہ دار پر منصوؔر کو لایا نہ تھا

بیگناہ کو کون سے دن خون میں نہلایا نہ تھا
کب زمانہ دار پر منصوؔر کو لایا نہ تھا

مل کے سفاکوں نے مارا تجھے عبدالحکیم
قاتلوں کے سامنے تو کچھ بھی گھبرایا نہ تھا

احمدیّت کے چمن کا اک گل خوش رو تھا تو
سیکڑوں دور خزاں آئے تو مرجھایا نہ تھا

ظُلم کی تاریکیوں میں بھی مہ کامل تھا تو
موت کے سائے میں بھی تو چاند! گہنایا نہ تھا

تو وہ مومن تھا کہ جس سے موت بھی ڈرتی رہی
تیرے چہرے پر کسی دم خوف کا سایہ نہ تھا

مرنے والے مر کے ہو جاتے ہیں زندہ جاوداں
موت کا یہ رُخ کسی کے سامنے آیا نہ تھا

کب بھلا سکتا ہے تیری خندہ روئی یہ ضیاؔ
بن کے پتھر کبر تیری راہ میں آیا نہ تھا

از: ضیاء اللہ مبشر مربی سلسلہ

جناب ماسٹر عبد الحکیم اڑد صاحب کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر

تاریخ پیدائش	۱۹۳۲ء
وفات	۱۶ راپریل ۱۹۸۳ء
نام	عبدالحکیم اڑد صاحب
جائے پیدائش	کھنڈو وارہ ضلع لاڑکانہ
تعلیم	بی۔اے بی ایڈ، ایم اے ایم ایڈ
پیشہ	استاذالمکرم
سن بیعت	اکتوبر ۱۹۵۴ء
عہدہ جماعت	زعیم انصاراللہ، صدر جماعت وارہ
وصیّت نمبر	
جائے مدفن	بہشتی مقبرہ ربوہ قطعہ نمبر

نماز جنازہ پڑھانے والے کا نام :۔ محترم سیّد احمد علی شاہ صاحب نائب ناظر اصلاح وارشاد

شمائل :۔ ۱۔ قدرت ثانیہ سے وابستگی ۲۔ خدمت خلق کے لئے مستعد
۳۔ نرم مزاج مگر اصول پرست ۴۔ تبلیغ کا بے حد شوق
۵۔ نماز باجماعت کا التزام ۶۔ مرکز کی طرف سے ہمیشہ سفر کیلئے تیار رہنا
۷۔ مہمان نواز
۸۔ بچوں سے محبت اور بیوی کا احترام
۹۔ اختلافی مسائل کے حوالہ جات ہمیشہ پاس رکھتے
۱۰۔ مطالعہ شوق

ڈاکٹر مظفر احمد شہید

۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۳ء

غالباً کسی بات میں یہ نقطہ زیرِ غور رہا ہے کہ تعداد کے لحاظ سے ڈاکٹر حضرات ہی شہداء کی فہرست میں زیادہ کیوں ہیں ؟ اگر خارجی وجوہات کو مدنظر رکھ لیا جائے تو یہ کہنا کافی ہو گا کہ وہ ہر خاص وعام کی نظر میں ہوتے ہیں اور عموماً منظرِ عام پر رہتے ہیں اور اس لئے کہ ان کا رابطہ وسیع ہوتا ہے اور بوجہ اس کے کہ ان کے دروازے پر دوست و دشمن بآسانی رسائی حاصل کر سکتا ہے غالباً اس کی یہی وجوہات ہو سکتی ہیں. لیکن اگر سوشل FACTOR کو الگ کر کے دیکھا جائے تو شہادت ایک موعود انعام ہے۔ اور اس موعود انعام میں وافر حصّہ پانے والے آخر ڈاکٹر ہی کیوں ہیں ؟ آئیے اس نشست میں ڈاکٹروں کے نایاب اور قیمتی وجود پر بھی غور کر لیتے ہیں۔ سنیئے حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الرابع کے وقت کے شہداء کی فہرست بلاترتیب کچھ اس طرح ہے ،

۱۔ ماسٹر عبدالحکیم ابڑو صاحب	۲۔ ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب
۳۔ چوہدری عبدالحمید صاحب	۴۔ بابو عبدالغفار صاحب
۵۔ ڈاکٹر مظفر احمد صاحب	۶۔ ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر
۷۔ محترم اسلم قریشی صاحب	۸۔ سید قمرالحق صاحب
۹۔ ڈاکٹر انعام الرحمان صاحب انور	۱۰۔ محترمہ رخسانہ صاحبہ

۱۱۔ نصیر احمد علوی	۱۲۔ قریشی عبد الرحمٰن صاحب
۱۳۔ ڈاکٹر عبد القدوس صاحب	۱۴۔ محترم عبد الرزاق صاحب
۱۵۔ محترم ظہیر احمد صاحب	۱۶ شیخ ناصر احمد صاحب
۱۷۔ محترم محمود احمد صاحب	۱۸۔ محترم خالد سلمان صاحب
۱۹۔ محترم ڈاکٹر عبد القادر صاحب۔	۲۰۔ ڈاکٹر منور احمد صاحب

توان شہداء حضرات میں سے چھ جاں نثار وہ ہیں۔ جن کا پیشہ امراض کا علاج معالجہ تھا۔ وہ لوگوں کو صحت و تندرستی بانٹتے تھے گویا وہ مسیحا تھے ان قومی مسیحاؤں میں کون سی روحانی بلندیاں تھیں جو دشمن کی آنکھ کو ایک آنکھ نہ بھائیں اور وہ لپک کر انہیں فلک پر لے گیا۔

تجزیہ:۔ گو تجزیہ میرے موضوع کا حصہ نہیں ہے مگر ہم صرف اس لئے تفصیلات میں جا رہے ہیں کہ آئندہ نسل اس ANALYSIS سے تسلی بخش نتائج نکال سکے اور کہیں تشنگی انہیں پریشان نہ کرے۔ اور اگر ہمارے عقائد وضاحت و تفصیلات سے سامنے آجائیں تو انشاء اللہ آسانی پیدا ہوگی اور مستقبل کی نسل کے لئے سہولت ہو جائے گی۔

انعام اربعہ

خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں وعدہ فرمایا ہے کہ میں تمہیں انعام عطا کروں گا۔ یاد رہے کہ یہ چاروں انعام صرف اور صرف امتِ محمدیہ کے لئے وعدہ ہے۔ گویا منعم علیہم چار قسم کے لوگ ہوں گے۔ اول نبی، دوم صدیق، سوم شہید، اور چہارم صالح ہوں گے اور ان کے کمالات کچھ اس طرح ہوں گے۔

۱۔ نبی کا خاص کمال یہ ہے کہ وہ خدا سے ایسا علمِ غیب پاوے جو بطور نشان

کے ہو۔ اور مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ اسے حاصل ہو۔

۲. صدیق کا کمال یہ ہے کہ صدق کے خزانے پر ایسے کامل طور پر قبضہ ہو یعنی اُسے اکمل طور پر کتاب اللہ کی سچائیاں اس کو معلوم ہوجائیں کہ وہ بوجہ خارق عادت ہونے کے نشان کی صورت پر ہوں اور اس صدیق کے صدق پر گواہی دیں۔

۳۔ شہید کا کمال یہ ہے مصیبتوں، دکھوں اور ابتلاؤں کے وقت میں ایسی قوتِ ایمانی اور قوتِ اخلاقی اور ثابت قدمی دکھلاوے کہ جو خارق عادت ہونے کی وجہ بطور نشان کے ہوجائے۔ اور

۴. مرد صالح کا کمال یہ ہے کہ ایسا شخص ہر ایک فساد سے دُور ہوجائے اور مجسم صلاح بن جائے کہ وہ کامل صلاحیت اس کی خارق عادت ہونے کی وجہ سے بطور نشان مانی جائے۔ (ضمیمہ تریاق القلوب صہ ۲)

اب

صرف شہید کے کمالات کو زیر نظر لاتے ہیں۔

ایمان کی اقسام کا ذکر پہلے ضروری ہے۔ چنانچہ ایمان کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک ایمان زبان سے ہی کیا جاتا ہے دل میں نہیں ہوتا۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایمان کی حقیقت کو پوری طرح جانتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ میں ایمان لے آیا اور ان کے قول کے مطابق لوگ بھی سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ یہ ایمان لے آیا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کی ایمان کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اور وہ منافق بھی اپنے دل میں کہتا ہے کہ میں تمسخر کر رہا ہوں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی شخص نے چھوٹا سا پودا اکھیڑ کر ہاتھ میں پکڑا ہوا ہو اور اُس کی جڑوں کا زمین سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

دوسری حالت ایمان کی اس قسم کی ہے کہ ایک شخص سمجھتا ہے کہ میں اچھی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھتا ہوں مگر دراصل وہ کچھ بھی نہیں سمجھتا ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت بظاہر زمین میں لگا ہوا ہے مگر اس کی جڑیں بالکل زمین کے اُوپر والی مٹی میں ہیں اور وہ کسی کے ذرا سے دھکے کے ساتھ ہی زمین پر آرہے گا۔

۳۔ تیسری اور آخری قسم کا ایمان یہ ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت ایمان کو سمجھ جاتا ہے۔ اور لوگ بھی کہتے ہیں کہ یہ ایماندار ہے اور خدا تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ یہ ایماندار ہے۔ اس کی مثال اُس درخت کی سی ہے جو بڑا تناور درخت ہو اور اس کی جڑیں بھی پاتال تک چلی گئی ہوں۔ اور یہی اصل ایمان ہے جو انسان کی نجات کا موجب بنتا ہے۔

(تفسیر سورۃ الشعراء تفسیر کبیر صفحہ ۲۹۴)

گویا ہم اس نتیجہ پر کمال صفائی سے جا پہنچے کہ شہید کے لیے تیسری قسم کا ایمان مختص ہے۔ گو درجہ شہادت درجہ صالحیت سے بلند تر ہوتا ہے۔ تاہم شہادت کا انعام خدا تعالیٰ کے وہی بندے پاتے ہیں۔ جو قربانی کرتے ہیں۔ ایمان کی قوت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اور انہی ایمانی حالت میں اس تناور درخت کی طرح ہوتے ہیں۔ جس کی جڑیں پاتال تک چلی گئی ہوتی ہیں۔ تبھی تو وہ لوگ ابتلاؤں اور مصیبتوں کو منہ دیتے ہیں اور منتظر بھی رہتے ہیں کہ ان کی قربانی ترقی کی طرف ہی گامزن رہے۔ وہ بتدریج قربانیاں کرتے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں

کہ ایمان زندہ ہی قربانی سے رہتا ہے ۔

پلس

یہی قوتِ ایمانی صالح کو شہید کے مقام تک لے جاتی ہے جہاں وہ صبر و استقامت سے ہر دم دکھوں کی چادر لپیٹے رکھتا ہے ۔ ابتلاء اور دکھ اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور وہ قربِ الٰہی کی راہیں تلاش کرتا پھرتا ہے ۔ اور اس کی بیشتر زندگی بحیثیت داعی الی اللہ کے گزرتی ہے تبھی تو وہ دعوتِ شہادت کو گلے لگاتا ہے ۔ وگرنہ اجنبی و انجان شخص کو جنت کی چابیاں اپنے ہاتھ سے کون دیتا ہے ؟

اخلاقی قوت

ایمانی قوت کا جائزہ لینے کے بعد اخلاقی قوت کی طرف آتے ہیں ۔ حضرت اقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ اخلاق دو قسم کے ہیں ۔ ترکِ شر پر قادر ہونا ایصالِ خیر کے لئے قدرت رکھنا ۔ چونکہ ہمیں اس موقع پر اخلاقی قوت کے متعلق تفصیل میں جانا ہے اس لئے ہم ایصالِ خیر کی بات کر لیتے ہیں ۔ اس اخلاقی قوت میں کئی پہلو آتے عفو یعنی گناہ کا بخش دینا ۔ اگر بخش دینا مناسب ہو ۔ عدل ، احسان ، نیکی ، صدقہ وغیرہ اس ضمن میں آجائیں گے ۔ ۱۔ حقیقی شجاعت ۲۔ سچائی ۳۔ صبر ۴۔ ہمدردی خلق وغیرہ وغیرہ اس وقت ہمارا لائحہ عمل ہیں ۔

حقیقی شجاعت

حقیقی شجاعت کو پہلے نمبر پر سامنے رکھ کر آگے چلیے کیونکہ یہی اعلیٰ اخلاق شہید کا اول ترین ورثہ ہوتا ہے اور یہ واحد حقیقت ایسی ہے جو تمام داعیان الی اللہ میں مشترک ہے اور وہ اپنی تمام بات لوگوں تک تلوار کے سایہ میں پہنچاتے ہی رہتے تھے ۔ اور

کوئی چیز ان کے راستہ میں مانع نہیں تھی۔ وہ سوشل تھے۔ خطرہ سے آگاہ تھے باخبر تھے۔ مگر شجاع اور دلیر تھے۔ فراست سے مزین تھے۔ مستقل مزاجی کے حقیقی علمبردار تھے۔

یہ خلق تقریباً تمام شہداء میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے بیش از بیش پایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بعض کے لئے مجھے یوں لگا کہ انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شہادت کو للکارا ہے۔ بیشک یہ کسی قوم کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس کے افراد اسی امتیازی خُلق سے مزین ہوں۔ سو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

مگر یاد رہے کہ

اِن شہیدوں کو جن کا مَیں نے اُوپر تذکرہ کیا ہے اچانک کسی چکر میں شہادت نصیب نہیں ہوئی بلکہ ہر ایک اپنی جگہ دعوتِ حق کا تاج سر پر سجا کر پھرتا تھا۔ سینہ اُس کا قوتِ ایمانی سے بھرپور تھا۔ معرفت و عرفان سے وہ مالا مال تھا اور وہ ہر کس و ناکس کو ہمدردیٔ خلق کے سمندر میں غوطہ زن دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہمدردیٔ خلق سے دوسروں کے دُکھ بانٹتا تھا۔ اور سکھ انہیں لوٹاتا تھا۔ یہی اُس کا شیوۂ زندگی تھا اور یہی اُس کا پیشہ تھا۔

ہاں

شیطان بھی تو اِسی لئے اُس کی تلاش میں رہتا ہے اور بالآخر کوئی شیطانی ہاتھ اس آواز کو خاموش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر نادان ہیں وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ حق کسی ایک حق پرست کے دینے سے مٹ جائے گا بلکہ وہ تو پہلے سے زیادہ اُبھرتا ہے۔

اگرچہ کسی مومن کی شہادت سے ایک خاندان کا نقصان ہوتا ہے مگر ڈاکٹر مسیحائے قوم ہوتا ہے جس کی شہادت خاندان کے علاوہ قوم کا نقصان بن جاتی ہے۔ ملک کی دولت، عوام کا سرمایہ اور غریبوں کا ہمدرد مسیحا ایسا خلاء پیدا کر جاتا ہے کہ جسے صدیاں پورا نہیں کر سکتیں۔ اب سندھ سے غریب ہاری لاٹھی ٹیکے بے یار و مددگار کراچی سے اپنی روشنی لینے آتا ہے۔ جبکہ روشنی کا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر اس کے دروازے پر بہتا تھا۔ کیا ملا اس ملعون کو جس نے غریبوں، بے نواؤں اور اندھیاروں سے ان کا آسرا چھین لیا۔ بیشک ایک ڈاکٹر کی شہادت قومی المیہ ہے۔ مگر اس بات کا معاملہ تو خدا تعالیٰ کے سپرد کر کے ہم آگے چلتے ہیں۔

چونکہ

ڈاکٹر مظفر احمد بھی ایک ایسے ہی مسیحا تھے۔ اس لئے ان کا ذکر سردست یہ ثابت کر دے گا کہ بیشک ڈاکٹر کا قوتِ ایمانی اور قوتِ خلق سے مزین ہونا بھی ضروری ہے تبھی تو وہ شہادت کا انعام پاتا ہے۔

چونکہ وہ سوشل تھے لہٰذا وہ ہر قسم کے خطرات سے آگاہ تھے اور باخبر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں شجاع اور دلیر بنایا تھا وہ بفضلہٖ تعالیٰ فراست سے مزین تھے اور مستقل مزاجی کے حقیقی علمبردار بن گئے تھے اور جیسا کہ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے متعلق فرماتا ہے۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا

وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ ز

وَمَا زَادَھُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّ تَسْلِیْمًا ۝ (۲۳/احزاب)

ترجمہ: چنانچہ (دیکھو) جب حقیقی مومنوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو کہا یہ تو وہی (لشکر) ہیں جن کا اللہ (تعالیٰ) اور اُس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسولؐ نے بالکل سچ بولا تھا اور ان کو اُس واقعہ نے ایمان اور اطاعت میں ہی بڑھایا (کمزور نہیں کیا)

لاریب ایک ڈاکٹر میں ایمان باللہ کی کیفیت یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا (۲۵۷/البقرہ) کے مطابق اُس کی اخلاقی قوت تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ کی حسین شاہراہوں پر قدم مارتی ہوئی نظر آنی چاہیئے۔

پس ڈاکٹر مظفر احمد

۱۹۴۷ء میں انڈیا کی ایک بستی ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ آپ احمدی گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ ابھی دو ماہ ہی کے تھے کہ تقسیم ہند عمل میں آگئی اور اس طرح ان کے والدین انہیں لے کر پاکستان کی سرحد میں داخل ہوگئے اور یہاں ایک قصبہ چونڈہ میں رہائش پذیر ہوگئے۔ میٹرک کے امتحان میں ضلع بھر میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرکے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز احسن رنگ میں کیا۔ آپ کے والدِ محترم رشید احمد صاحب ایک اسکول میں ٹیچر کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور جب ٹیچر کو ایک سعادت مند فرزند نصیب ہو تو یہ اس کی انتہائی خوش

نصیبی ہوتی ہے کہ وہ ایک ہیرے کو تراش لے جبکہ ہیرا اس کی ذاتی ملکیت ہو اور شب و روز اس کے ماحول، حال احوال اور عادات کا وہ خود نقیب بھی ہو۔ محترم رشید احمد صاحب نے اپنے بیٹے مظفر کو اپنے ہونہار خاندان کی معیت میں تمام تر توجہ دے کر نکھارا اور پروان چڑھایا۔ اپنی تمام اولاد محترم حمید احمد، محترم لطیف احمد، محترم منور احمد اور ڈاکٹر سعید احمد اور بیٹی سعیدہ صاحبہ کو ان کے اپنے اپنے ظرف کے مطابق علم و عرفان سے بھر دیا۔ تبارک اللہ تعالیٰ۔

وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کے مطابق انہوں نے اپنی امامت کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی اولاد کو فرض شناس، ہمدرد اور ثابت قدم احمدی بنایا۔ یہ ماں باپ کی عنایات ہوتی ہیں جو کسی کسی بیٹے کو تفویض ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مظفر احمد نے چھوٹی ہی عمر میں اپنے والدین کی عطا شدہ نیک تربیت و محنت پر مہر ثبت کر دی۔ میٹرک میں وظیفہ حاصل ہوا تو ربوہ میں منتقل ہو کر ایف ایس سی کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں پر کامیابی حاصل کر کے میڈیکل کی تعلیم کے لئے کنگ ایڈورڈ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا یہاں بھی اس ہونہار بچے نے انتہائی جانفشانی سے میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے آرمی میں بحیثیت کیپٹن کام کا آغاز کیا۔ مگر تھوڑے عرصہ بعد ہی آرمی کی بجائے میو ہوسپٹل لاہور میں کام شروع کر دیا۔ یاد رہے کہ خادم جہاں بھی ہوتا ہے میدانِ جنگ ہو یا میدانِ امن اُس کی روحانی ذمہ داریاں اس کا اولین لائحہ عمل ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ روح کو زندہ رکھتی ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر مظفر صبح و شام اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ اپنی جماعتی ذمہ داریوں کو پورا کرتے رہے۔

لیکن

۱۹۷۶ء میں چند ذاتی وجوہات کی بناء پر پاکستان چھوڑ کر اس سرزمین کی طرف

چلے گئے جہاں شہادت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا یہ قدم جو امریکہ کی طرف اُٹھ رہا ہے کسی نہ کسی زمانہ میں انہیں سرزمین امریکہ پر رتبۂ شہادت سے سرفراز کرے گا۔ اور وہ اس دیارِ صلیب میں پہلے احمدی نوجوان ہوں گے جو اپنی ایمانی و اخلاقی قوت سے ایسی مشعل روشن کریں گے اس کی ضیاء سے آئندہ آنے والی نسلیں راہ نمائی حاصل کریں گی۔ انشاء اللہ

جماعت سے وابستگی

حضرت اقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے دراصل دو وجود ہوتے ہیں۔ ایک وجود تو وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں تیار ہوتا ہے۔ اور جسے ہم تم سب دیکھتے ہیں۔ اور یہ وجود بلا کسی فرق کے سب کو ملتا ہے لیکن ایک اور وجود بھی انسان کو دیا جاتا ہے جو صادق کی صحبت میں تیار ہوتا ہے۔ یہ وجود بظاہر ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اسے چھو کر یا ٹٹول کر دیکھ لیں۔ مگر وہ وجود ایسا ہوتا ہے کہ ایک قسم کی موت وارد ہو جاتی ہے۔"

(ملفوظات جلد سوئم صہ ۲)

مندرجہ بالا صداقت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اگر دیکھیں تو ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی زمانہ سے یہ خواہش رہی کہ کسی نہ کسی طور سے صحبتِ صادقین اُن کو میسر رہے اور وہ ہمیشہ تلاش میں رہے کہ جاب کسی ایسی جگہ کریں جہاں بہت سی جماعت ہو اور ان سے بھرپور رابطہ کا موقعہ ملتا رہے۔ اور سلسلہ کی خدمت کا بھی جی بھر کر موقعہ میسر آتا رہے۔ خدا تعالیٰ نے ان کی اس خواہش کو پورا کیا اور شکاگو رائیل ہاسپٹل میں سروس دے دی۔ یہاں تین سال کی ٹریننگ مکمل کر کے بحیثیت چیف آف ڈیپارٹمنٹ ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔

"اپنے تمام فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے اور سب سے

اہم فریضہ جو ادا کیا وہ جماعت کے منصب تھے جنہیں وہ کما حقہٗ بہت تندہی سے ادا کرتے رہے۔ جذبہ اور جوش سے جماعتی روابط کو قائم رکھا۔ بعد میں جب قائد خدام الاحمدیہ مشی گن منتخب ہوئے تو نیشنل لیول پر متحد ہو کر اپنی روح تک کام میں ڈال دی۔ مقامی ایجوکیشن کا عہدہ، جنرل سیکرٹری کا عہدہ حتّٰی کہ ناصرات الاحمدیہ کی تنظیم کو بھی خود اپنے ہاتھ سے منظم کیا اور انہیں دینی تعلیم و تربیت سے روشناس کرایا۔ باقاعدہ پروگرام بنائے اور خود ہی ناصرات الاحمدیہ کا امتحان لینے اور پوزیشن آنے والیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ان میں انعامات بھی تقسیم کرتے۔"

۱۹۸۳ء میں پہلا جلسہ امریکہ کی سرزمین پر جب ہوا تو ڈیٹرائیٹ مشی گن اس کا مرکز تھا۔ ڈاکٹر مظفر احمد اپنی طبیعت کے لحاظ سے اتنے فکرمند تھے کہ اس سے پہلے میں نے اپنے شوہر کو اتنا فکرمند نہیں دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں کہ چلتے پھرتے سارا سارا دن دعائیں کرتے کہ "کنونشن کامیاب ہو جائے جوں جوں کنونشن قریب آ رہا تھا وہ اسے کامیاب بنانے کے لئے کوششیں تیز تر کرتے جا رہے تھے۔ تمام احباب کو خطوط لکھے اور جلسہ کے لئے کام و فرائض کی سرانجام دہی کی تجاویز پیش کیں۔ چونکہ خوشخط لکھتے تھے اس لئے کئی کئی گز لمبے کپڑے کے بینرز بھی خود ہی تیار کئے۔ کلمہ طیبہ اور الہامات حضرت اقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کو کئی کئی چارٹ پر جلی حروف میں لکھ کر پیش کیا" وغیرہ وغیرہ

کمال تو یہ ہے کہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں اپنی ڈیوٹی نبھاتے اور ہسپتال سے واپسی پر شب و روز اپنی روحانی غذا کو حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کرتے رہتے تھے گویا ہر وقت بے لوث خدمت میں پیش پیش تھے۔

داخل ہوتے تو تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنے بیوی بچے کے لئے بھی وقت نکالتے اور اُن سے والہانہ الفت کا اظہار کرتے کیونکر وہ اظہار محبت وخدمت میں خوب خوب شناسا تھے ۔ بیٹے غضنفر احمد کو بیشتر وقت دیتے ۔ پڑھاتے ۔ لکھاتے اور اس کی تربیت کی ذمہ داریاں باحسن ادا کرتے ۔ ان کا بیٹا جو بوقت شہادت پونے چار سال کا تھا اپنے تمام دینی آداب و عادات باپ سے سیکھ رہا تھا ۔ اور دوسرا بیٹا جعفر منصور احمد تو شہادت کے دو ماہ بعد پیدا ہوا ۔ دعا ہے کہ یہ دونوں بیٹے غضنفر احمد اور جعفر منصور احمد اپنے باپ کا عکس ہوں ۔ اور خدمت دین میں وہ کسی سے پیچھے رہنے والے نہ ہوں ۔ کیونکہ درخت ہمیشہ اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ۔

مطالعہ کتب

ڈاکٹر شہید کے والد محترم رشید احمد صاحب ایک استاد تھے اور استا کا ہر قدم علم کی درس گاہ کو ہی جاتا ہے ۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے سکھاتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انجانے میں وہ اپنی اولاد کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے ۔ اور بعض اوقات تو علم کے معراج تک لے جاتا ہے ۔ یہاں فہرست شہداء میں اساتذہ کے سپوت جو بھی ہیں قابل ستائش ہیں ۔ بزرگوں کے علم نے انہیں ایسی جلا بخشی کہ ہر موڑ پر وہ روشنی کے مینار بن کر کھڑے ہیں ۔ محترم ڈاکٹر صاحب بھی ایک اُستاد کے سپوت ہونے کی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتے تھے ۔

مطالعہ دینی کتب کا بے حد شوق تھا ۔ اسلامی مسائل سے بخوبی واقف ہوتے کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر ملنے والے ڈاکٹر اور نرسز سے مختلف سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے اور دینی کتب کے علاوہ بائبل کے مسائل پر بھی ایک گونا گوں عبور حاصل تھا ۔ اور یہی وجہ تھی کہ امریکہ کے ہم پیشہ لوگوں میں شب و روز محفل سوال و جواب زندہ رکھتے تھے اور موازنہ کر کے بتلاتے تھے کہ قرآن مجید کو کیا کیا فوقیت

حاصل ہے۔ افضلیت میں قرآن کا مقام ثابت کر کے بے حد خوش ہوتے تھے
اکثر انگلش ٹرانسلیشن والا قرآن مجید بطور تحفہ پیش کرتے تھے۔ انہیں یہ فخر ہوتا کہ میں
ایک یکتا تحفہ اپنے دوستوں کی خدمت میں دے رہا ہوں۔ اور یہ سلسلہ تحائف
ان کا معمول ہو گیا ہوا تھا۔ جب کبھی فیصلہ کن گفتگو پر دوستوں کی مجلس ختم ہوئی تو
بائبل پر قرآن مجید کی افضلیت اور برتری ثابت کر کے ایک فاتح کی حیثیت سے
خوش ہوتے اور پھر دوسری مجلس کا وعدہ لے کر اُٹھتے۔ کبھی کوئی موقعہ ایسا
نہیں آیا کہ دعوت الی اللہ کا جذبہ کار فرما نہ ہوا ہو۔ بلکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ
اللہ تعالیٰ انہیں تبلیغ حق کا موقعہ عطا فرمائے اور وہ اس سے مستفید نہ ہوں۔

"میرے شوہر اپنے وقت کو کچھ اس طرح ترتیب دیتے کہ زیادہ سے زیادہ
وقت مطالعہ کے لئے نکال لیتے تھے اور پھر اپنے دریافت شدہ نکات کو دوسروں
کے سامنے بیان فرما کر انہیں دعوتِ حق پہنچا کر بے حد خوشی محسوس کرتے۔ حتیٰ کہ
ایک انتہائی خوشی کا وقت وہ تھا جب کہ انہوں نے ایک زیرِ تبلیغ امریکن کو
قرآنِ مجید اور تفسیر کبیر کا تحفہ پیش کیا اور اس کامیابی پر بے حد مسرور تھے۔"

داعی الی اللہ

ڈاکٹر مظفر احمد گو کہ بچپن سے ہی ایسی طبیعت
کے مالک تھے کہ اپنے ملنے والوں سے کسی نہ
کسی رنگ میں دین حق کی گفتگو کرتے۔ مگر جو نکھار ان کی گفتگو اور انداز تبلیغ میں
دوران سروس میو ہسپتال آیا وہ ان کی طبیعت کو چار چاند لگا گیا۔ اس دور
میں وہ جماعت کے ذمہ دار عہدوں پر بھی خدمت کرتے رہے اور سیکھتے بھی
رہے۔ چونکہ دعوت الی اللہ کا جذبہ حقیقی ایک قدرتی چیز ہے
جو شخص بھی خواہش کرتا ہے کہ میں دعوت الی اللہ کے لئے نکلوں تو خود کو تیار کرتا
ہے اپنے جذبوں کو تازہ کرتا ہے اور عمیق مطالعہ اور محنت شاقہ کے بعد وہ اس قابل

ہوتا ہے کہ مسائل کا جواب دے کر دوسرے کو مطمئن کرے اور کبھی کبھی مسائل کے ساتھ ساتھ اسے حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور دلیری و حاضر جوابی اس کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے جس سے بفضلہ تعالیٰ کامیابی مقدر ہو جاتی ہے۔ مگر ایک شخص پیدائشی اور موروثی طاقتوں سے جو میدانِ عمل میں آتا ہے وہ ہمیشہ بفضلِ خدا کامیاب ہوتا ہے وہ اصل میں میدانِ دعوت الی اللہ کا شیر ہوتا ہے۔ خود ہی بولتا ہے۔ بولنا جانتا ہے۔ معاملہ فہم ہوتا ہے۔ حاضر جواب ہوتا ہے۔ بات کرنے میں بلاغت ہوتی ہے۔ علم کا خزانہ بھی اُس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ ارادہ اور جذبہ لے کر بھی اٹھتا ہے مگر سب سے بڑی چیز جو میدانِ عمل میں کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے کسی داعی اللہ کا نمونہ ہے جو مثالی ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر مظفر احمد خدا کے فضل سے تمام دینی ہتھیاروں سے لیس تھے اور اپنے نمونہ میں بھی مثالی تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دعوتِ الی اللہ کی محبت میں وہ اُس شاہراہ کی طرف چل نکلے جو شہادت کی طرف جاتی ہے۔

کیسے ؟

شہادت سے دو ہفتہ قبل بیت الذکر ڈیٹرائٹ میں خُدام کی ایک میٹنگ تھی۔ پریذیڈنٹ صاحب نے سب خدام سے پوچھا کہ کوئی ایسا شخص ہے جو کچھ لوگوں کو تبلیغ کرنے کے لئے وقت نکال سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل اپنا نام پیش کر دیا اور ڈاکٹر صاحب نے پریذیڈنٹ صاحب کو نام دینے کی اجازت دے کر مستعدی سے مطالعہ کی طرف توجہ کر لی تھی۔ چنانچہ کنونشن سے چند روز قبل ایک بلیک امریکن لڑکے نے ڈاکٹر صاحب کے گھر فون کیا اور ان سے راستہ دریافت کیا اور گھر آ

گیا۔ باوجود بے پناہ مصروفیت کے ڈاکٹر صاحب اس دن ہسپتال سے جلد گھر واپس آ گئے۔ وہ بلیک امریکن لڑکا ۵ بجے شام گھر آیا۔ اور ۹ بجے رات واپس گیا۔ اور تبلیغ کے بہانے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔

اس دوران انہوں نے اس کی رات کے کھانے پر خوب خاطر مدارت کی اور احمدیت کے متعلق خوب بتایا۔ کہاں تک احمدیت سچی ہے۔ چار گھنٹے اُسے تبلیغ کرتے رہے۔ اس سے بہت دوستانہ ماحول اور خندہ پیشانی سے پیش آتے رہے جاتے ہوئے اُسے تفسیر کبیر اور قرآن مجید کا تحفہ دیا۔ ڈاکٹر مظفر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ جب اس نے کہا کہ میں کنونشن میں شامل ہوں گا۔ نیز یہ وہ منگل وہ دوبارہ گھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مہینہ پہلے ہی گھر خریدا اور ان کی دلی خواہش تھی کہ کنونشن کے مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے گھر ٹھہرانے کا انہیں شرف حاصل ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو مہمان گھر تشریف لائے وہ تھے مشنری انچارج شکاگو "مرزا افضل احمد صاحب" وہ بلیک امریکن لڑکا جو ڈاکٹر مظفر کے زیر تبلیغ تھا۔ منگل کا وعدہ کر کے سوموار کو اچانک آ گیا۔ دروازے پر گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر صاحب دروازے پر خوش آمدید کہنے گئے اسے اندر لائے اور کہا مرزا صاحب! ان سے ملئے اور دُعا کی درخواست کی۔ اور کہا مرزا صاحب یہ میرے زیر تبلیغ ہیں اس کے لئے دُعا کیجئے۔ چنانچہ چند سیکنڈ ٹھہرنے کے بعد جلدی سے اس لڑکے نے واپس جانا چاہا۔ ڈاکٹر صاحب اُسے دروازہ پر چھوڑ کر جونہی واپس آ رہے تھے کہ اُس نے دروازہ کے پیچھے سے ڈاکٹر صاحب پر وار پہ وار کئے۔ ایک گولی جب ان کی گردن پر پیچھے لگی تو انہوں نے منہ موڑ کر سیدھا ہو کر اُسے دیکھا جیسے انہیں یقین نہ ہو۔ اُس وقت تک دو گولیاں ان کے چہرے اور بازوؤں میں سے بھی گزر گئیں۔ دو ضائع ہو گئیں۔ اس شخص نے ۵ گولیوں

سے اس معصوم پر وار کر کے ۸ راگست ۱۹۸۳ء رات ۹ بجے ان کے گھر پر انہیں شہید کر دیا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اے مظفر آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی نمازِ جنازہ آپ کے پیارے امام خلیفۃ المسیح الرابع نے سرزمینِ ربوہ میں ادا فرمائی ۔ آپ کی خوش نصیبی تھی کہ خلیفہ وقت حضرت مرزا طاہر احمد مدظلہ تعالیٰ اپنے مرکز میں اپنی پوری شان کے ساتھ متمکن تھے ۔ خدا تعالیٰ نے انہیں توفیق عطا کی کہ انہوں نے شہید مرحوم کو ارضِ ربوہ سے آخری سلام عطا کیا اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا ۔

اور آج پیارے طاہر محبوبِ جماعتِ احمدیہ !! آپ کو مبارک ہو کہ مرکز کی دھرتی پر کھڑے ہو کر آپ نے حضرت مسیح موعود بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کا الہام پورا ہوتے ہوئے از خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپ کے وقت میں اور آپ کے ہی ذریعہ یہ الہام پورا ہوا ۔ الحمد للّٰہِ علی ذالک

اور اے مردِ صادق ! تیرا بھی ایک نرم گوشہ شہادت بینک صداقت حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کا متحمل ہوا ۔ ہم سب گواہ ہیں کہ تیری شہادت نے ارضِ کلیسا کو قربانی کے خون سے غسل دیا تھا ۔ اور یہ پہلے احمدی کا خون تھا جو تیری رگوں سے ایک امریکن نے بہا دیا تھا ۔ ارضِ امریکہ ! یاد رہے کہ یہ خون پھول لائے گا اور پھل لائے گا اور تیری زمین میں جذب ہو کر شرک اور فسق و فساد کی جڑوں پر ہلاکت کا تبر چلائے گا ۔ انشاءاللہ

"چشمِ بصیرت سے دیکھو کہ مظفر آج بھی زندہ ہے بلکہ پہلے سے کہیں بڑھ کر زندگی پا گیا ۔ اے مظفر تجھ پر سلام کہ تیرے عقب میں لاکھوں مظفر آگے بڑھ کر تیری جگہ لینے کے لئے بے قرار ہیں ۔ اے مظفر کے شعلۂ حیات کو بجھانے والو تم نے تو اُسے

ابدی زندگی کا جام پلا دیا۔ زندگی اُس کے حصہ میں آئی اور موت تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی۔"
(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۲ ر اگست ۱۹۸۳ء)

جذبۂ زندگی

ڈاکٹر مظفر کا جذبہ شوقِ تبلیغ اتنا زندہ تھا کہ وہ اس شہادت کے بعد بھی ہمیشہ زندہ رہا۔ کیونکہ دعوت الی اللہ کا معراج تو یہی ہے کہ شہادت کے بعد بھی ان کے پیغامات کو لوگوں کے کانوں نے مختلف انداز سے سنا۔ ان کی بیگم لکھتی ہیں کہ ان کی شہادت کے بعد ڈیٹرائٹ میں اس واقعہ کی وجہ سے ہفتہ بھر ٹی وی میں ڈاکٹر مظفر احمد اور احمدیت کے متعلق بہت سی چیزیں آتی رہیں۔ مقامی انگلش اخباروں میں مفصل مضمون احمدیت کے متعلق ہفتوں بھر آتے رہے۔ جو لوگ احمدیت کے متعلق بالکل نہ جانتے تھے وہ بھی جان گئے۔ ٹی وی کے مختلف چینل سے لوگ ڈاکٹر مظفر کی بیگم سے انٹرویو کے لئے آتے رہے اور جماعت سے پوچھتے رہے کہ ہمیں بتائیں یہ واقعہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟

۱۔ احمدیت کیا ہے ۲۔ کب شروع ہوئی؟ ۳۔ کہاں سے آئی یہ تنظیم؟
۴۔ احمدیت کا پیغام کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ چند سوالات ایک شعلہ جوالا کی طرح امریکہ کے مختلف طبقوں میں گردش کرنے لگے اور یہ کیسے ممکن ہوا؟

توجہ طلب امر یہی ہے کہ ایک شخص کا قتل کئی سوالات کے کئی باب کھول گیا اور احمدیت کے پیغام کو از خود راستہ ملتا چلا گیا۔ جو کہ بے پناہ رقم خرچ کرنے کے باوجود ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ قوم اپنی معاشی، معاشرتی اور سیاسی دوڑ میں اس طرح غلطاں ہے کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کچھ سُننے اور جاننے کے لئے تیار ہو۔ مگر اس واقعہ نے ہر ایک کو جھنجھوڑ دیا اور اُن میں ایک قدرتی بیداری پیدا ہوئی کہ آخر ایک شخص نے کس عقیدہ کی سچائی پر جان کیسے قربان کر دی؟؟

یہ سچائی پرکھنے کے لئے مختلف قسم کے کسوٹی نما سوالات گردش کرتے رہے اور یہ اُس مشتاق مظفر شہید کا جذبہ شوق تھا۔ جو وفات کے بعد بھی دعوت الی اللہ ہی دیتا چلا گیا۔

وہ جلنے پہ ہو مائل تو عاشق صادق
وہ خوشی سے جان کی بازی بھی ہار دیتے ہیں

ایک کرید
شہادت کے بعد ایک سوال تھا جو ہر جگہ گردش میں تھا

اگرچہ

ڈاکٹر مظفر خوش مزاج تھے اور منکسر المزاج بھی تھے۔ ہر ایک سے دوستی اور بھائی چارہ ان کا شیوہ تھا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کی دوستانہ طبیعت اور خوش مزاجی ہر ایک بوڑھے، جوان اور بچے کو پہروں آنسو رلاتی رہی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے سرجن اور نرسز شہادت کے واقعہ سے بہت متاثر ہوئے کیونکہ وہ لوگ حیران تھے کہ آخر مظفر کے عقیدہ میں کون سی آفت تھی جو اس کالے امریکن کے گلے پڑ جاتی اگر مظفر زندہ رہتے؟ زیادہ تر یہ سوال کریدا جاتا رہا کہ ڈاکٹر نے کون سا عقیدہ اپنایا ہوا تھا۔ جو امریکن شخص سے دو دن بھی بادر نہ ہو سکا۔ وُہ صرف ۴ گھنٹے ان کے ساتھ رہا۔ اور تمام کچھ جاننے کی کوشش کرتا رہا اور دوسری بار وہ شہادت کا پیغام ہی لے آیا۔ اتنا مختصر تعلق اتنا زہر آلود کیسے ہو گیا۔ جبکہ امریکن کو ذاتی دشمنی کوئی نہ تھی۔ اُسے مکان چاہیئے تھا نہ دکان تو بالآخر کون سی سچائی تھی جو امریکن کے گلے کے پھندے کو تنگ کرتی جا رہی تھی کہ وہ

برداشت نہ کر سکا۔ اور دوسری ہی ملاقات میں انہیں اوجِ ثریا کا تمغہ لگ گیا

فسبحان الذی اخذی الاعادی

فسبحان الذی اخذی الاعادی

ایک خواب

مظفر شہید یہ یقین رکھتے تھے۔ "جس نے آخرت کمالی اُس نے سب کچھ پالیا۔ اس دنیا میں کیا رکھا ہے۔ یہ دنیا تو فانی ہے۔" شہادت سے کچھ ماہ پہلے اپنی بیوی آسیہ صاحبہ کو ایک خواب سنایا تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ان کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے ساتھ نماز ادا کرو۔ بیشک ڈاکٹر مظفر احمد صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ اور تہجد گزار بھی تھے۔ بلکہ اپنے گھر والوں کو سختی سے نماز کی تلقین بھی کرتے تھے۔ اور انہیں خواب میں بھی یہی نوید نصیب ہوئی کہ آؤ میرے ساتھ نماز ادا کرو۔

انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی معیت میں نماز ادا کرنے کے لئے جلد رختِ سفر باندھ لیا۔ مرنا تو برحق ہے مگر جس کو خدا تعالیٰ اپنے محبوب خلیفہ کے ساتھ صف میں جا کھڑا کرے اس کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی کیا ہوگی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِكَ

مردِ صادق

حضور خلیفۃ المسیح الرابع مدظلہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر مظفر احمد کی شہادت پر خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا۔

"اس راستہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹو جس پر چلتے ہوئے وہ مردِ صادق بہت آگے بڑھ گیا۔"

حقیقت میں خلیفۂ وقت کی آواز اتنی اثر انداز ہوتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جانیں اور آنے والی نسلیں بھی اس کے لئے ہمہ تن گوش ہوتی ہیں

"پیچھے نہ ہٹو" کی آواز فضا میں گونجی اور نسلوں میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی ۔ ہر آنے والا تیار ہے اور ہر تیار کو یہ انعام حاصل رہے گا اے امام وقت خدا آپ کو لمبی کام والی عمر عطا فرمائے۔ "تا دین حق کا غلبہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔آپ کی راہنمائی اور مُصلح آواز نے ہمیں فولاد کی طرح کر دیا ہے ۔ ہم میں سے ہر ایک مرد وزن ، بوڑھا جوان ڈاکٹر مظفر کی راہ پہ چلتے ہوئے پہلے سے کہیں بڑھ کر زندگی پانے کے لئے کمر ہمت باندھے کھڑا ہے ۔ شہید نے جو مشعل جلائی ہے وہ کبھی بجھنے نہیں پائے گی ۔ اس کی روشنی میں ہر فرد جماعت آگے ہی بڑھتا چلا جائے گا اور اس حقیقت کو کلے گوسے ہر ایک سے منوائے گا ۔ انشاء اللہ ۔

مبارک باد

ڈاکٹر مظفر احمد کو صالحیت سے بالا تر مقام پانے کی مبارک باد محبوب امام وقت نے یوں دی فرمایا ۔

" آج میں جماعت کو ایک گہرے غم میں لپٹی ہوئی خوشی کی خبر سنانا چاہتا ہوں بعض سُننے والے یہ تعجب کریں گے کہ کیا ایسی بھی خوشی کی خبر ہو سکتی ہے جو گہرے غم میں لپیٹ کر پیش کی جائے تو ان کو میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہاں ایک خبر ایسی ہے جو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ لیکن ہمیشہ غم میں لپیٹ کر پیش کی جاتی ہے ۔ اور وہ شہادت کی خبر ہے ۔ ہر شہادت میں آپ یہ عجیب بات دیکھیں گے کہ وہ بڑی عظیم خوشی اور بشارت کے باوجود گہرا غم بھی پیش کر دیتی ہے ۔ جس شہادت کا ذکر میں کرنے لگا ہوں وہ تاریخی نوعیت کی شہادت ہے ۔ کیونکہ امریکہ میں اللہ تعالےٰ نے ایک مخلص احمدی نوجوان کو پہلی مرتبہ شہادت کا رتبہ

عطا فرمایا۔ پس امریکہ کی سرزمین نے جو شہادت کا خون چکھا ہے یہ تاریخ احمدیت کا امریکہ کے لحاظ سے پہلا واقعہ ہے اور یہ شہادت ایک عظیم نوعیت کی شہادت ہے کہ ہمارے ایک بہت ہی مخلص اور فدائی نوجوان ڈاکٹر مظفر احمد جو ڈیٹرایٹ میں رہتے تھے۔ اپنے اخلاص اور دینی کاموں میں پیش روی کے نتیجہ میں قائد علاقہ امریکہ مقرر کیا گیا تھا۔ وہ تمام جماعت امریکہ کے نیشنل سیکرٹری بھی رہے اور شہادت کے وقت اسی عہدہ پر فائز تھے۔ ان کو دعوتِ الی اللہ کا بہت شوق تھا۔ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں (دین حق... ناقل) کی دعوت الی اللہ کا موقعہ دے اور وہ اس سے رُکے رہیں۔ چنانچہ آج سے تین روز قبل ایک بلیک امریکن میں سے بدقسمت شخص ان کے گھر آیا۔ اور تبلیغ کے بہانہ سے اُن سے کچھ دیر گفتگو کی۔ اس سے قبل بھی اس وسیلے سے وہ آچکا تھا اور ان کی مہمان نوازی سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ سمجھ کر یہ واقعتاً اپنی دلچسپی میں مخلص ہے اس کو پھر موقع دیا جب وہ چھوڑنے کے لئے گھر سے باہر جا رہے تھے اور چھوڑ کر پلٹے ہیں تو اس نے فائر کر کے انہیں وہیں شہید کر دیا ....

حضور نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں کے دماغ میں یہ خیال ہے کہ احمدی ڈر جائے گا یا اس کے نتیجہ میں (دعوتِ الی اللہ... ناقل) سے باز آجائے گا تو بڑا ہی احمقانہ خیال ہے۔ احمدی تو ڈرنے کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ احمدی کے دل اور حوصلے سے یہ لوگ واقف ہی نہیں ہیں۔ احمدی تو یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم حضرت مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور سپاہی ہیں۔ ہماری تو شان سے یہ لوگ واقف ہی نہیں ہیں ان کو علم ہی نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ قدم قدم پر اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ڈیٹرایٹ یا امریکہ یا دُنیا کے کسی گوشہ میں احمدی اس قسم کی ظالمانہ حرکتوں کی بناء پر تبلیغ سے باز آجائے۔ وہ

تو دعوت الی اللہ بہرحال دے گا۔ اور دنیا چلا جائے گا۔ ایک سے سو اور سو سے ہزار اور ہزار سے لاکھوں داعی الی اللہ پیدا ہو جائیں گے۔ اس لئے ہرگز کسی خوف اور خطرہ کا مقام نہیں ہے۔

اس لئے کہ شہادتیں تو مقدر ہوتی ہیں ان قوموں کے اور شہادتیں سزا کے طور پر مقدر نہیں ہوا کرتیں۔ اس لئے میں ان لوگوں کو جو متاثر ہوتے ہیں۔ مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اسے ڈیٹرائیٹ اور امریکہ کے دوسرے شہروں میں بسنے والے احمدیو اور وہ بھی جو امریکہ سے باہر بس رہے ہو اور اے مشرق و مغرب میں آباد (دین حق. ناقل) کے جانثارو اس عارضی غم سے مضمحل نہ ہونا۔ یہ ان گنت خوشیوں کا پیش خیمہ بننے والا ہے اس شہید کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہے۔ اور اس راستہ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹو۔ جس پر چلتے ہوئے وہ بہت آگے بڑھ گیا۔ تمہارے قدم نہ ڈگمگائیں۔ تمہارے ارادے متذلزل نہ ہوں۔ دیکھو تم نے خوب سوچ سمجھ کر اور کامل معرفت اور یقین کے ساتھ اپنے لئے راستی کی راہ اختیار کی ہے۔ جس پر صالحیت کی منزل کے بعد ایک شہادت کی منزل بھی آتی ہے۔ اسے خوف و ہراس کی منزل نہ بناؤ۔ یہ تو ایک اعلیٰ اور ارفع انعام کی منزل ہے جس پہ پہنچنے کے لئے لاکھوں ترستے ہوئے مر گئے اور لاکھوں ترستے ہوئے مر جائیں گے۔ وہ وقت یاد کرو خالد بن ولیدؓ کی جب بسترِ مرگ پر روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ایک عیادت کرنے والے نے پوچھا۔ اے اللہ کی تلوار تو تو میدانِ جہاد کی اُن کڑی اور مہیب منزلوں میں بے خوف و خطر رہا اور بے نیام رہا۔ جہاں دلیروں اور شیروں کے پتے پانی ہوتے تھے۔ تجھے یہ بزدلی زیب نہیں دیتی۔

خالد نے جواب دیا کہ نہیں نہیں خالد موت سے خائف نہیں ہے بلکہ اس غم سے نڈھال ہے کہ راہِ خدا میں شہادت کی سعادت نہ پا سکا۔ کاش میں بھی

ان خوش نصیبوں میں داخل ہو جاؤں جو اللہ کی راہ میں شہید کئے جاتے ہیں۔ جہاں سر تن سے جدا کئے جاتے اور گردنیں کاٹی جاتی ہیں۔ یہ وہی خالد تھا جو یہ تمنا لے کر ہر خطرہ کے بھنور میں کود گیا۔ اور ہر روز اس گھمبیر مقام پر پہنچا جہاں بدن کے اعضا ٹکڑے کئے جاتے ہیں لیکن ہر اس مقام سے وہ غازی بن کر لوٹا اور شہادت کا جام نہ پی سکا۔ بستر مرگ پر اس سوال کرنے والے کو خالدؓ نے اپنے بدن کے وہ داغ دکھائے جو میدان جہاد میں کھائے جانے والے زخموں نے پیچھے چھوڑے تھے۔ اپنے بدن سے کپڑا اٹھایا، اپنا پیٹ دکھایا اپنی چھاتی دکھائی اپنے بازو ننگے کئے اور کندھوں کے جوڑ تک اپنے داغ داغ بدن کا ماجرا اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ یہ دیکھو۔ یہ دیکھو اور یہ دیکھو اور یہ دیکھو اور اے دیکھنے والے مجھے بتا کہ کیا ایسی ایک انچ جگہ بھی دکھائی دی ہے جہاں اللہ کی راہ میں خالد نے زخم نہ کھائے ہوں۔ مگر وائے حسرت، وائے حسرت اور وائے حسرت کہ خالدؓ شہید نہ ہو سکا۔

اور یہ زخم

جو آج مجھے کھائے جا رہا ہے اُن زخموں کے دُکھ سے کہیں زیادہ جان سوز ہے جو شوقِ شہادت میں مَیں نے اللہ کی راہ میں کھائے تھے

پس

اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دروازہ سے داخل ہونے والو! اے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے دروازہ سے داخل ہونے والو! تمہاری زندگی کے سفر میں لازماً صالحیت سے بالاتر مقام بھی آنے والے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ یہ راستہ خوف و ہراس اور نقصان و ضیاع کا راستہ ہرگز نہیں۔ بلکہ لامتناہی

انعام پانے کا سلسلہ ہائے کوہ ہے۔ جس کے انعام کی ہر منزل پہلی منزل سے بلند تر ہے۔

پس خوشی اور عزم ویقین کے ساتھ آگے بڑھو اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ تبلیغ اسلام کی جو لَو میرے دل میں جگائی ہے اور آج ہزار ہا احمدی سینوں میں جل رہی ہے۔ اس کو بجھنے نہیں دینا۔ اس کو بجھنے نہیں دینا۔ تمہیں خدائے بالا و برتر کی قسم اس کو بجھنے نہیں دینا۔ اس مقدس امانت کی حفاظت کرو۔ میں خدائے ذوالجلال والاکرام کے مقدس نام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم اس شمع نور کے امین بنے رہو گے تو خدا اسے کبھی بجھنے نہیں دے گا۔ یہ لَو بلند تر ہو گی اور پھیلے گی اور سینہ بہ سینہ روشن ہوتی چلی جائے گی اور تمام روئے زمین کو گھیر لے گی اور تمام تاریکیوں کو اُجالے میں بدل دے گی۔ اے بدخواہو! اور اے نگاہ بد سے اس لَو کو دیکھنے والو! سنو تم ہرگز ہرگز اس کو بجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ ارفع چراغ وہ نہیں جو تمہاری سفلی قوتوں سے بجھایا جا سکے۔ جبر کی کوئی طاقت اس نور کے شعلہ کو دبا نہیں سکتی۔ اے مظفر تجھ پر سلام کہ تیرے عقب میں لاکھوں مظفر آگے بڑھ کر تیری جگہ لینے کے لئے بے قرار ہیں۔ اور اے مظفر کے شعلۂ حیات کو بجھانے والو تم نے تو اس کو ابدی زندگی کا جام پلا دیا زندگی اس کے حصہ میں آئی اور موت تمہارے مقدر میں لکھی گئی۔ مذہبی آزادی کا قرآنی تصور تو ایک پاک، اعلیٰ اور ارفع اور وسیع تصور ہے اور اسے جبر و اکراہ کے مکروہ اور مجذوم تصور سے بدلنے والو! اور اے مذہب کے پاک سرچشمہ سے پھوٹنے والی لازوال محبت کو نفرت اور عناد میں تبدیل کرنے والو! اور اے ہر نور کو نار میں اور ہر رحمت کو زحمت میں بدلنے کے خواہاں اور بدقسمت لوگو! جو انسان کہلاتے ہو۔ یاد رکھو کہ تمہاری ہر سفلی تدبیر خدائے برتر کی غالب تقدیر سے ٹکرا ٹکرا

کر پارہ پارہ ہو جائے گی۔ تمہارے ناپاک ارادے خاک میں ملا دیئے جائیں گے اور رب اعلیٰ کے مقدر کی چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر تم محض اپنا ہی سر پھوڑ دگے۔ تمہاری مخالفت کی ہر جھاگ اٹھاتی ہوئی لہر ساحل اسلام سے ٹکرا کر ناکام لوٹے گی اور بکھر جائے گی اور منتشر ہو جائے گی۔ اور پیش قدمی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اے اسلام کے مقابلہ پر اُٹھنے والی ظاہری اور مخفی، عیاں اور باطنی طاقتو! سنو کہ تمہارے مقدر میں ناکامی اور پھر ناکامی اور پھر ناکامی کے سوا کچھ نہیں لکھا گیا اور دیکھو اسلام کے جانثار فدائی ہم وہ لوگ ہیں۔ ہم وہ مردانِ حق ہیں جن کی سرشت میں ناکامی کا خمیر نہیں۔ اللہ تعالےٰ دکھائے گا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہر وہ لفظ جو آج میں نے بیان کیا ہے سچا ثابت ہو گا کیونکہ یہ میرے منہ کی بات نہیں یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے جو کبھی تبدیل نہیں اور کبھی تبدیل نہیں ہو گا۔ احمدیت نے کبھی ناکام نہیں ہونا۔ کسی منزل پر ناکام نہیں ہونا۔ آگے سے آگے بڑھنا ہے اور جتنی شہادتیں توفیق پاؤ گے اتنے ہی زیادہ کامیابیاں اور فتح تمہارے مقدر میں لکھی جائیں گی۔ اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو اور جلد اسلام کی فتح کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء
بیت الاقصیٰ ربوہ

ایک نظر میں

نام	مظفر احمد ولد رشید احمد
پیشہ	ڈاکٹر
عمر	۱۹۴۷ء سے اگست ۱۹۸۳ء تک
جائے پیدائش	ہوشیار پور
جائے شہادت	سنی گن امریکہ ، تاریخ شہادت ۸ راگست ۱۹۸۳ء ۹ بجے رات
آلہ شہادت	گولی PISTOL کی
تعلیم	ڈاکٹر ، ایم بی بی ایس کنگ ایڈورڈ کالج لاہور ، ایم .ڈی . کیپٹن الیف .اے .سی .ای ڈیٹرائٹ امریکہ
قدوجسم	۵ء۵ فٹ . سڈول
کھانے میں	گوشت کو ترجیح دیتے تھے
اوقات	صبح ۵ بجے سے ۱۱ بجے رات تک
قیلولہ	فرصت ملنے پر ضرور کرتے تھے
نماز جنازہ	حضرت خلیفۃ المسیح الرابع
مقام جنازہ	ربوہ
آخری آرام گاہ	قبرستانِ شہداء ربوہ
تاریخ خطبہ شہادت	۱۲راگست ۱۹۸۳ء
عہدہ جماعت	جنرل سیکرٹری و سیکرٹری تعلیم ڈیٹرائٹ
بوقت شہادت	معتمد تھے ، نیشنل سیکرٹری

تہجد گزار ، تلاوت قرآن کریم و ترجمہ سے شغف

شیخ ناصر احمد شہید

کہیں ہے کوئٹہ کی داستان ظلم و سفاکی

کہیں اوکاڑہ اور لاہور اور ستیانہ آتا ہے

ماں کا ایک عظیم الشان مقام ہے جو قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کے ارشادات نے عورت کو دیا ہے۔ یعنی ماں کے لحاظ سے عورت کو قرآن کریم نے اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عورت کو جیسے محاورہ میں کہتے ہیں۔

ماں کے لحاظ سے دیکھتے ہوئے پگڑی گر جاتی ہے [۱]

ماں

ہاں ناصر شہید کی ماں بھی عظمت کے اس بلند مقام پر کھڑی ہیں کہ جہاں سے دیکھنے والے کی پگڑی گر جاتی ہے۔ ناصر احمد کی شہادت بھی انہیں کی دُعا۔ قربانی اور محنت کا نتیجہ تھی۔ ناصر احمد ابھی لڑکپن میں ہی تھے کہ ۱۹۵۳ء کا طوفانی دور شروع ہوا۔ جبکہ ہر ملاں مولوی تحریک ختم نبوت کے تحت سر پر کفن باندھ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔ کہ یہ کفن یا تو مولوی کے جسم کو زمین دوز کرے گا یا من حیثیت

---

[۱] خطاب جلسہ سالانہ ۱۹۸۸ء

الجماعت احمدی کا لباس آخری بنا دیا جائے گا۔ یہی قتل عام کا عزم لے کر اٹھنے والے لوگ منظم شکل لے کر گاؤں گاؤں قریہ قریہ یہ نعرہ مارتے پھرتے۔ یہ نعرہ بستی بستی ہر احمدی کے در و دیوار پر نوشتہ تقدیر بن کر لکھا گیا۔ ادھر اوکاڑہ میں بھی ہر گھر اس جمعہ کا انتظار کر رہا تھا کہ میدان شہادت نصیب ہو۔ اور ناصر شہید کی عظیم والدہ محترمہ نے اس مقصد کے لئے اپنے دونوں بچے ناصر احمد اور سعید احمد کو عید کی سی تیاری کر کے تیار کر دیا۔ دونوں بچوں کو نہلایا دھلایا بُراق سفید کپڑے پہنائے اور سرمہ وغیرہ لگا کر تیار کر دیا کہ شہادت ہیں جب گلے لگئے تو ہم میں سے ہر ایک دُلہا کی طرح سجا سجایا ہو۔ اس دلیر ماں نے اپنے دونوں بچے اپنا سرمایہ حیات لئے جواں سال مستقبل کے سہاروں کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کر دیا۔ کہ "آج اگر مولوی مار بھی دیں تو ہم لوگ اور ہمارے بچے پیچھے نہ رہیں۔ یہ تھی ایک ماں جو قربانی کے لئے بچوں سمیت خود بھی تیار ہے اور بیٹا دوسری طرف موٹے جلی لفظوں میں لکھی ہوئی تحریر لے کر اپنی قربانی پر مہر لگاتے پھرتا ہے۔

۱۹۵۳ء آج بروز جمعہ ناصر احمد اپنی رضا و رغبت کا اظہار بحضور خلیفۃ المسیح کر رہا ہے۔ "اباجی گھبرا گئے ہیں لیکن حضور میں آپ کے ساتھ ہوں۔" یہ وہ تحریر تھی جو ناصر احمد اپنے ہاتھوں میں لئے پھر رہے تھے۔ لہٰذا آپ کے ساتھ رہنے والا ناصر احمد بیشک آپ کے ساتھ ہی رہا اور ۱۹۸۳ء میں ٹھیک ۳۰ سال بعد قربتِ خدا اور محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں میسر آگئی۔

"دادی جان ہمارے ابوجان کو پکڑے ہوئے ان کے والد یعنی ہمارے دادا جان کے پاس لے گئی ابوجان کے ہاتھ میں موٹی قلم سے لکھا ہوا رقعہ تھا۔ جو ابوجان نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کو لکھا تھا کہ اباجی گھبرا گئے ہیں۔ لیکن حضور

میں آپ کے ساتھ ہوں۔ دادا جان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ دوسری طرف جلوس آیا۔ اور چلا بھی گیا۔ لیکن اپنے پیچھے ایک انمٹ واقعہ چھوڑ گیا جس نے خون کو گرما دیا۔ اور وہی ناصر جس کو اس کی والدہ نے ۱۹۵۳ء میں سفید کپڑے پہنا کر عید کی طرح تیار کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء کو عین عید کے دن شہادت کے عظیم رتبہ پر فائز ہو کر سفید کپڑوں میں ہی ملبوس اس دارفانی میں امر ہو گیا۔

اے ماں! آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی تربیت عظمت کا بھرم رکھنے والے ناصر احمد نے آپ کی سوچوں کو عملی جامہ پہنا دیا۔ شہید کی ماں کو ہزاروں سلام کہ انہوں نے ایسا بیٹا پیدا کیا جو سپوتِ احمدیت تھا۔ جس نے اپنے خون سے بے رنگ زمین اوکاڑہ کو خون رنگ بخشا ہے۔ بیشک وہ پانچ بھائیوں اور تین بہنوں کا بھائی سالارِ قافلہ تھا۔ جس نے رضائے الٰہی کے لئے اپنی جان قربان کر دی اور حروفِ ابجد میں سکھایا ہوا یہی سبق اس نے پانچ سال کی عمر میں فرفر سنا دیا۔

پیدائش

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے پہلے موگا ضلع فیروزپور میں شیخ فضل محمد صاحب کے گھر پیدا ہونے والا بچہ اپنے کنبہ کے ساتھ زندگی کی بہاریں دینی ماحول میں ہی گزار رہا تھا۔ والد محترم فضل محمد صاحب کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد اوکاڑہ میں بھی یہی کاروبار جاری رکھا اور معاشی حالت کے ساتھ ساتھ دینی حالت کو بھی سنوارنے کے لئے شب و روز محنت کرتے رہے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو محترم خواجہ عبدالصمد صاحب کی صاحبزادی محترمہ عائشہ صدیقہ صاحبہ سے رشتۂ زوجیت میں باندھ دیا گیا۔
دونوں میاں بیوی شہر میں متصل جامعہ احمدیہ اوکاڑہ رہائش پذیر رہے گو کہ ناصر احمد صاحب خود مڈل پاس تھے مگر جذبہ تعلیم اس قدر تھا کہ اپنے تمام بچوں کو اچھی

اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کی طرف توجہ دلائی خود بھی ایم بی ہائی اسکول اوکاڑہ میں ہی پڑھتے تھے اور تمام بچے عزیزم بابر احمد (الیف اے) عزیزم ڈاکٹر عامر محمود ہاؤس سرجن، اظہر محمود سول انجنیئر اور شیخ نعمان احمد طاہر پری میڈیکل سب نے اسی اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اپنے محترم باپ کی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے مختلف میدانوں میں نکل گئے۔ ہر میدانِ علم میں خدا نے ان کا ساتھ دیا۔ الحمدللہ

محترم ناصر احمد! آپ کی قربانیاں ضرور رنگ لائیں گی۔ بیشک وہ رائیگاں نہیں جائیں گی۔ آپ کے بیٹے پوتے، بیٹیاں اور نواسے آپ کی قربانی کی لامحدود جزا حاصل کریں گے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وہ آپ کا سر بلند کریں گے آپ کو تعلیم کا شوق تھا نا؟ آپ کے بچوں نے تمام تر توجہ صرف کر کے اعلیٰ تعلیم کی منزل پر کمندیں ڈال دی ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تعلیم ان کی دینی تعلیم کے لئے حقیقی کمند ہو۔ وہ بڑھیں پھولیں اور پھلیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے دل کے کاغذ پر "حضور ہیں آپ کے ساتھ ہوں۔" رقم کرے اور یہ اَنمٹ الفاظ کبھی نہ مٹیں۔ آمین۔

ناصر شہید کی محبتِ علم کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عامر محمود کہتے

ہیں کہ ابو جان ہماری کتابیں باقاعدگی سے CHECK کیا کرتے تھے اور کاپی پر EXCELLENT OR GOOD دیکھ کر انعام بھی دیتے تھے اور گھر میں جب کوئی مہمان آتا خاص طور پر ماموں جان تو انہیں ہماری کاپیاں دکھاتے تاکہ ہم مزید شوق سے پڑھیں اور ان سے مشورے بھی لیتے تھے۔

اور

ہماری امی جان ہمیشہ ہم سب کو اپنے ساتھ بٹھا کر پڑھاتیں تھیں۔ اور جن دنوں میں پرچے ہوتے تھے ان دنوں میں خود ساری رات جاگتی تھیں۔ ایک تو جاگ کر دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ بچوں کو تنہا جاگتے کا احساس

نہ ہو اور جو چیز سمجھ نہ آتی وہ خود پڑھتیں اور پھر اگر سمجھ نہ آتی تو درود شریف خود بھی پڑھتیں اور ہمیں بھی پڑھاتیں۔ اور پھر یاد کرواتیں تھیں۔ اور اکثر یہی ہوتا کہ وہی سوال آتے جن پر درود شریف زیادہ پڑھا ہوا ہوتا "

دعاؤں کے ہمراہی

وہ دونوں میاں بیوی صرف ایک کشتی کے ہم سوار نہیں تھے بلکہ طوفانوں کے ہم سوار بھی تھے۔ جب بھی کوئی طوفان آتا وہ دونوں سر جوڑ لیتے اور ایک ہی سمت اپنی طاقتیں خرچ کر دیتے۔ وہ دعاؤں کی کشتی میں سوار ہو کر کوئی نہ کوئی مسئلے کا حل تلاش کر ہی لیتے۔ " وہ صاحب فراست تھے مشکل سے مشکل مسئلوں کو اپنے تدبر سے حل کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔"

۱۹۷۴ء کے ہنگامہ خیز طوفان میں جماعت کی ڈھارس بندھانا ان کا کام تھا۔ کتنی ہی فکر انگیز بات ہوتی اس کو اپنے وجود کے اندر جذب کر لیتے اور جماعت کا حوصلہ بندھاتے۔ جماعت ادکارہ کے سیکرٹری امور عامہ اور سیکرٹری جائیداد تھے۔ سیکرٹری جائیداد کی حیثیت سے انہوں نے تین سال میں دس سال کا کام کیا۔[1]

دس سال کا کام صرف تین سال میں، تدبر سے نہیں بلکہ دعاؤں کی آبپاشی سے یہ کھیتی ہری بھری ہوئی ہے اور بسرعت تمام ہوئی ہے اور ناصر احمد تو دعاؤں کے راہی تھے۔ دعائیں ان کا شیوہ تھا۔ ہر قدم پر میاں بیوی دعاؤں کی کشتی میں سوار ہو کر کوئی نہ کوئی مسئلے کا حل نکال لیتے وہ صبح شام دعاؤں کا عمل دہراتے رہتے۔ حتیٰ کہ اگر بچوں کو کوئی سوال حساب وجغرافیہ کا نہ آتا تو بھی ماں باپ انہیں دعا کی دنیا میں غوطہ زن ہو جانے کا مشورہ دیتے۔ درود شریف

---

[1] اداریہ انصاراللہ اکتوبر ۱۹۸۳ء

پڑھ پڑھ کر اسکول کے ہوم ورک کی پرابلمز حل کرنے والے خاندان کا ہر فرد اسی شاہراہ پر چلتا تھا۔ یہ کیسا مبارک خاندان ہے کہ اپنی شادی کی سالگرہ پر بھی تہجد اور درود شریف کی گرہ باندھتے ہیں اور سارا دن اور ساری رات ۲۴ گھنٹے درود شریف ہی پڑھ کر گزار دیتے۔" وقتاً فوقتاً جب موقع ملتا تہجد اور صلوٰۃ التسبیح ضرور ادا کرتے تھے۔ اور جب جماعت کی طرف سے اہتمام ہوتا تو بھرپور شامل ہوتے تھے۔ بلکہ بقول امی جان۔ یہ بات امی جان نے شہادت کے بعد ہمیں بتائی کہ شادی کی سالگرہ کی رات امی اور ابو دونوں تہجد پڑھ کر دعا کرتے تھے کہ اے اللہ میاں تو نے ایک سال اچھا گزار دیا ہے اب آنے والا وقت اس سے بھی بہتر ہو۔"

محبت الٰہی

خدا تعالیٰ کی محبت کا جذبہ جب پیدا ہو جائے تو اس کی شدت کم نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسی آگ ہے کہ اگر کسی دل میں لگ جائے تو اس کا بڑھ جانا تو لازمی ہے کم ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ تو ایک ہاتھ میری طرف بڑھائے گا تو میں دس ہاتھ تیری طرف بڑھاؤں گا۔ اس صورت میں دس دس ہاتھ آگے بڑھنے کا سلسلہ اگر شروع ہو جائے تو کبھی اور کہیں سے بھی ٹوٹا نہیں کرتا۔ شرط صرف آتشِ عشق الٰہی ہے کیونکہ یہ ایک لامتناہی سفر ہے۔ اور اس سفر میں واپس کوئی نہیں ہوا کرتا۔ بصورتِ دیگر خدا کو پانے کے بعد اس سے بے وفائی کرنا اور اس سے منہ موڑنا ہلاکت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ کی محبت کو پالینے کے بعد انسان خدا کا ہو جاتا ہے اور اس کا دل خدا کا دل ہوتا اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ خدا تعالیٰ سے مانگی ہوئی کئی دعائیں رد ہو جاتی ہیں۔ مگر ایک دعا محبت الٰہی کی طلب ایک ایسی دعا ہے کہ کبھی کہیں بھی اللہ تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ اور یہ ضرور قبول کرتا ہے اور بندے

کو اپنا قرب عطا کرتا ہے۔ مگر شرط یہاں بھی یہی ہے کہ

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ [1]

کہ اے اللہ کے رسول ان لوگوں کو جو خدا تعالیٰ کی محبت کے

دعویدار ہیں۔ بتا دو کہ اگر خدا تعالیٰ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو

تو میری پیروی کرو۔

یہاں محبتِ الٰہی کے حصول کے لئے پیروی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو دو لفظوں میں اگر مقید کر دیا جائے تو یوں بنتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی بھلائی کی طرف بلانا اور بدی اور برائی سے منع کرنا ہی سچی پیروی ہے۔

اب دیکھتے یہ ہیں

کہ ناصر احمد شہید نے اپنے خدا کی محبت پانے کے لئے اپنی زندگی کے شب و روز میں پیروی کا کیا اسلوب اپنایا ؟

بحیثیت بندۂ خدا ! ہم خدا کے بندے ہیں اور خدا کے مومن بندے ہیں ہم ہلاکتوں سے زندگیاں نچوڑنا جانتے ہیں۔ اس لئے یہ جتنی ہلاکتیں ہمارے لئے تجویز کریں گے اتنی ہی زیادہ ہم زندگی کا رس ان ہلاکتوں سے نچوڑ لیں گے وہ رس ہمیں مزید زندہ کرتا چلا جائے گا [2] یہاں تھوڑی دیر کے لئے کہ زندگی کا رس کیا چیز ہے ہم دیکھتے ہیں اس کا تجزیہ ناصر شہید کی زندگی میں ہی کر لیتے ہیں۔ زندگی کا رس حیاتِ جاوداں کا دوسرا نام ہے اور یہ رس انسان کو

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۳۲ [2] خطبہ جمعہ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۶ء

مزید زندہ کر دیتا ہے۔ اور اس شہید کو ایک ابدی زندگی مل جاتی ہے وہ بظاہر اپنے خون سے غسل کرتا ہے اور اپنی بے رنگ زمین کو رنگ دیتا ہے۔ اور یہ زمین اس کا حق ادا کرتی ہے۔" اے ناصر تو اس زمین میں اسی طرح زندہ رہے گا۔ دلوں میں دماغوں میں مجلسوں میں اور خاص و عام میں بھی کیونکہ تو حقیقی زندگی پا گیا ہے۔"

" اور اے جانے والے ناصر تجھے خواہش تھی کہ خدا تجھ سے بڑا کام لے۔ دیکھ تو زندہ جاوید ہو گیا۔ تیرا نام تاریخِ احمدیت میں شہداء کی فہرست میں آویزاں ہو گیا۔ تجھ پر خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں۔ خدا تیرے پسماندگان کا متکفل ہو۔ وہ تیرے بوڑھے والدین اور معصوم بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ وہ تیرے پسماندگان سے اس دنیا میں اور تجھ سے اگلے جہان میں رحم و کرم کا سلوک کرے۔ تیرے درجات بلند فرمائے۔ تیری ساری آرزوئیں وہ قادر خدا پوری کرے۔ آمین یارب العالمین۔[1]

اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت

جہاں تک خدا اور اس کے رسولؐ پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تعلق ہے۔ ناصر شہید اپنی زندگی میں یہ شعار رکھتے تھے کہ صبح تلاوتِ ناظرہ کے بعد تفسیر صغیر سے ترجمہ پڑھنا اور عام حالات میں اپنے کام میں مشغول ہو جانا۔ لیکن اگر رات کو کوئی مشکل درپیش آ جائے تو صبح تلاوت میں اس کا حل ڈھونڈ نکالنا۔ گھنٹوں تلاوت کرنا سوچ و بچار کرنا۔ ترجمہ کرنا اور تفسیر کرنا۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آ جاتا تھا کہ حل مِل جاتا تھا اور عموماً اس

---

[1] انصار اللہ اکتوبر ۱۹۸۳ء

خوشی میں سب کو شامل کرتے اور فخر سے بتاتے کہ میں نے اپنے مسائل کا حل تو کلام خداوندعالم میں خود ہی یا حسن معلوم کر لیا ہے۔ پھر اس پر دل و جان سے عمل کرتے دنیوی پرابلمز (PROBLEMS) کا حتی الوسع علاج قرآن کریم سے ہی کیا کرتے تھے۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ۔ سبحان اللہ العظیم۔ ہر وقت زبان پر جاری رکھتے اور ہر کام کی ابتداء اور انتہا اسی دعا سے کرتے اور درود شریف پر اس حد تک اعتقاد تھا کہ اپنی دوکان میں فارغ اوقات میں درود شریف کثرت سے پڑھتے رہتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی محبت کا اظہار بلند اخلاق سے ہی ہوا کرتا ہے اور عظمت اخلاق کی پرکھ صرف اور صرف مخلوقِ خدا سے محبت اور ہمدردی کا سلوک کرنے سے نمایاں ہوتی ہے۔ ناصر شہید کی ایک یہ عادت فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی کہ کوئی شخص خالی ہاتھ میرے گھر سے نہ جائے۔ ہمیشہ ہر غریب و بے کس کی مدد کرنا اپنا اولین فرض خیال کرتے تھے۔

"ابو جان کسی کو گھر سے خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ اکثر خواتین امی جان سے ملتی ہیں تو یہی بتاتی ہیں کہ اگر کبھی دکان پر جاتی تھیں تو کوئی نہ کوئی کپڑا یا پیسے ہمیں ضرور دیتے تھے۔ امی جان کو گھر پہ اتنا سامان دے جاتے تھے کہ گھر سے کوئی خالی نہ جائے۔ اسی طرح جانوروں سے بھی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ کسی جانور کو دکھی یا زخمی نہ ہونے دیتے تھے۔ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ ابو جان کے کمرہ میں چڑیوں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور جب تک چڑیاں اور اس کے بچے وہاں سے چلے نہیں گئے اُس گھونسلے کو کسی کو چھیڑتے نہیں دیا۔ ایک دن گھونسلے کے لمبے لمبے تنکے باہر لٹک رہے تھے۔ اور کمرہ کی حالت بہت عجیب لگ رہی تھی ہم بچوں نے تنکے کاٹنے کے لئے ابا جان سے اجازت مانگی تو ابو نے کہا کہ نہیں، تجھے کیا معلوم کہ کتنی محبت اور محنت سے یہ تنکے انہوں نے اکٹھے کئے

ہیں۔ اور دانہ بھی وہیں ڈالتے تھے۔ جب تک چڑیاں معہ خاندان وہاں سے نہیں گئیں۔ ابو نے اس حصۂ گھر کی صفائی نہیں کرنے دی یہ رحم کا جذبہ تھا جو جانوروں اور پرندوں کے لئے ان کے دل میں تھا۔

خدمت خلق اسی طرح خدمت خلق کا جذبہ شیخ ناصر احمد شہید میں بہت بلند تھا۔ وہ اس جذبے کے ماتحت اپنی زندگی کا ہر لمحہ خدمت میں کسی نہ کسی طرح خرچ کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جماعت پر ایک کڑا وقت آیا تھا اس کے علاوہ ابو جان یہ بھی کہتے کہ اگر ایسی جگہ کوئی چیز مہنگی بھی مل جائے تو کوئی بات نہیں اور یوں چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے شہر کا ایک کثیر حصۂ ابو جان کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اور اس کا احساس پہلی دفعہ ابو جان کی شہادت کے موقعہ پر دیکھنے میں آیا۔

اخلاق کا حسن تو نکھرتا ہی اس وقت ہے جب کوئی شخص غرباد، یتامیٰ اور بیواؤں کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھ کر حل کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ محترم ناصر شیخ بھی بہت ساری بیواؤں اور یتامیٰ کی مالی امداد خاموشی سے کرتے رہتے تھے۔ بعض کا تو علم ان کی شہادت کے بعد ہوا کہ وہ مال کی تقسیم کرتے تھے۔ اپنے بچوں میں بڑوں میں، بیوی میں، ماں میں غرباء میں اور بیواؤں اور یتامیٰ میں۔

ان کی طوعی قربانی

"ناصر ہال"

ناصر ہال کی تعمیر نشاندہی کرتی ہے کہ اس مرد مومن سے جماعت کو کتنا پیار اور انس تھا کہ ان کی شہادت کے بعد ۱۹۸۴ء میں عید گاہ میں ایک ہال تعمیر کیا گیا

ہے۔ جس کا نام ناصر شہید کی مناسبت سے ناصر ہال رکھا گیا ہے۔ دوسری طرف یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ ناصر نفس نفیس کتنے بے نفس انسان تھے کہ اپنی جماعت اوکاڑہ کے لئے ان تھک اصلاحی اقدام اٹھاتے تھے۔ ان کی کسی نہ کسی نوعیت سے خدمت کرتے تھے بحیثیت ناظم اشاعت کام کرتے رہے۔ جب کہ آپ خادم تھے پھر سیکرٹری امور عامہ اور جائیداد مقرر ہوئے جب کہ اب انصار اللہ میں تھے۔ جامعہ احمدیہ کی توسیع کرنا بھی انہی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ بیت الاحمدیہ اوکاڑہ میں بھی بہت جذبہ محبت سے مربی سلسلہ کا گھر بنوایا۔ خدا تعالیٰ کے گھر کو پوری توجہ اور انہماک سے نئے سرے سے تعمیر کروایا۔ لجنہ اماء اللہ کی نماز کے لئے بھی علیحدہ کمرہ تیار کرواکر عورتوں کے جذبات کا بھی خیال رکھا۔ اور سب سے بڑی بات عیدگاہ سے باہر چار دکانیں تعمیر کروائیں۔ تاکہ مقامی جماعت کرایہ لے کر مالی و معاشی ضروریات پوری کر سکے اور سوچ کا نفع بخش انداز ہے۔

آج کے ناصر ہال کی تعمیر کے لئے ابوجان نے پانچ ہزار روپے نقد ادا کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ عیدگاہ سے ملحقہ کوٹھی محض اس بنا پر خریدی کہ عیدگاہ کی حفاظت ہو سکے۔ نیز شہر کے جماعتی فنکشن بھی اسی کوٹھی میں منعقد ہو سکیں۔ اب تمام جماعتی اجتماع، میٹنگز، کھیلیں، نماز، جلسے اجلاس اسی قطعہ زمین میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور ان سب کے انعقاد میں عمل دخل اسی سوچ کا ہے جو کبھی ناصر شہید کی سوچ تھی۔ اور ان کے جذبہ قربانی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

"مرحوم بہت خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ بہت ہی صالح، بردبار، متقی، دعاگو اور صاحب رویا نوجوان تھا۔ سلسلہ کے کاموں کے لئے وہ بہت درد رکھتے تھے۔ بہت لگن اور محنت سے کام کرنے والے انتھک انسان تھے۔ جماعت کو ہمیشہ اپنے حکیمانہ مشوروں سے نوازتے ...... انہوں نے تین سالوں میں دس سال کا کام

کیا۔ اللہ یہ رُتبہ اپنے پیاروں کو ہی عطا کرتا ہے۔ یا ان کو جن کو وہ اپنا پیار دیتا رہتا ہے۔ [۱]

قُوا انفسکم وَاھلیکم ناراً

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو آگ کے عذاب سے بچاؤ۔"

بچے کی پیدائش پر ایک کان میں آذان اور دوسرے میں تکبیر کہنا ایک بہت ہی عظیم الشان اور گہرا حکم ہے۔ اور یہ بتانے کے لئے ہے کہ بچے کی عمر کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہے جو تربیت سے خالی ہو۔ ہمیں والدین کو بھی متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تم نے پہلے دن سے ہی دینی رنگ میں تربیت کرنی ہے۔ اگر نہیں کرو گے تو جوابدہ ہو گے چونکہ بچے کو بچانے کا عمل پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس لئے روزِ اوّل سے ہی تربیت کا عمل اذان و تکبیر سے شروع ہوا۔

اذان چونکہ نماز کے لئے تیار ہوتے کا فلسفہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسی طرح اذان زندگی کی تربیت و تنظیم کے لئے بھی انسانوں کو تیار کرتی ہے۔ گو بچہ نہیں سمجھ رہا ہوتا۔ مگر ماں باپ کی تربیت کے لئے ہی خدوخال اور گائیڈ لائنز دی جاتی ہیں۔ اس لئے ہر ماں باپ پہلے خود کو گائیڈ کرے گا اور اپنے نفس کو راہ راست پر لائے گا تا کہ بہتر نمونہ پیش کر سکے بعد میں اس نمونہ کو اولاد کے سامنے رکھے گا۔ اس لئے لازمی طور پر تربیت دینے سے پہلے تربیت یافتہ ہونا پڑے گا۔ شیخ ناصر شہید کو اللہ تعالیٰ نے ایک اچھا جوڑ عطا کیا تھا۔ یہ دونوں ساتھی اپنی خوبصورت زندگی کی گاڑی مشیت ایزدی سے مثبت انداز میں چلاتے رہے اور ایک دوسرے کے لئے

---

[۱] انصار اللہ اکتوبر ۱۹۸۳ء

خدا کی رضا کے راستے ہموار کرتے رہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ساتھی ایک روٹین (ROUTINE) سے چلتے تھے۔ اور ہر ممکن لائحہ عمل سامنے رکھتے تھے۔ باقاعدگی میں زیادہ ہاتھ نمازوں کے اوقات ہی کا ہوتا تھا۔ یعنی فلاں نماز کے بعد سے لے کر فلاں نماز کے وقت تک یہ کام ضرور کرنا ہے اور نمازوں سے ہی اپنے دن کا آغاز اور انتہا کا لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔ اور خدا کی قدرت دیکھیں کہ نمازوں سے لائحہ عمل تیار کرنے والے کا آخری عمل بھی نماز پر ہی جا ختم ہوا۔ یعنی نماز عید پڑھ کر خدا تعالیٰ کی گود میں جا بیٹھے

ذالک فضل اللّٰہ

اس طرح۔ صبح نماز فجر کے وقت جاگنا اور رمضان کے دنوں میں بچوں کو باقاعدگی سے جگانا۔ اور نمازِ فجر کے بعد تھوڑا سا سوجانا لائحہ عمل ہوتا تھا۔ گو عام دنوں میں سیر کے لئے نکل جاتے تھے اور رات کو ۱۲ بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے

اور امی جان کو ساتھ بٹھا کر دکان کا حساب کتاب لکھاتے تھے۔ اور دعا درود شریف پڑھتے رہتے تھے۔ ہمارے پرچوں کے دنوں میں خاص طور پر جلا گنے تھے۔ تاکہ ان کے بچے اعلیٰ کامیابی کے لئے اکیلے ہی محنت کر کے پریشان نہ ہوں بلکہ جتنی اور جہاں تک والدین کی قربانی کا تعلق ہے۔ وہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں کرتے رہتے تھے۔

صدیقہ عائشہ ناصر یعنی ہماری امی جان شادی سے پہلے ہی نماز روزہ کی پابند تھیں اور پھر ابو جان بھی باقاعدہ ہو گئے اور اتنے کہ جب ہماری عمر نماز کی ہوئی تو مقابلہ کروا دیا کہ کون باجماعت نماز پڑھتا ہے۔ پھر زیادہ پڑھنے والے کو انعام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ صد سالہ جوبلی کی دعائیں بھی ایسے ہی یاد کروائیں کہ جو پہلے یاد کر کے سنائے گا۔ اسے بڑا انعام ملے گا اور یہ عموماً نقدی کی صورت میں ہوتا تھا۔

روزہ نہ صرف خود رکھتے تھے بلکہ ہمیں اتنا ہوش ہے کہ شروع شروع میں ہمیں "چڑی روزہ" یعنی آدھے دن کا اور پھر اس کے بعد رمضان میں جمعہ کے دن پورا روزہ اور پھر آہستہ آہستہ روزوں کی تعداد بڑھاتے رہتے تھے اور پھر خوب اُس دن افطاری کا سامان تیار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اب نہ صرف رمضان کے روزے رکھے جاتے ہیں یعنی گھر میں نفلی روزہ تقریباً ہر ماہ ایک نفلی روزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں تک اہلی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ جوڑا بہت مثالی تھا۔ غمی خوشی میں اکٹھے شامل ہوتے تھے۔ اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی جو خالص گھریلو ہوتی تو دونوں باہم مشورہ کرتے اور پھر دعا سے کام لیتے۔ طبیعت کے لحاظ سے خوش مزاجی دونوں کا طرہ امتیاز تھا۔ جس محفل میں دونوں بیٹھ جائیں خوشی و ہنسی سے ہمکنار ہوئی جاتی تھی۔ نیز ہر عید کے موقع پر ایک دوسرے کو تحفہ دیتے تھے۔ کیونکہ تحفہ محبت کو پختہ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر ان مسنون طریقوں کو مدّ نظر رکھتے تھے۔ حسنِ اخلاق، خدمت گزاری، برداشت اور دعائیں ہی انس و محبت کے رشتہ کو استوار رکھتے ہیں۔ یہ رشتہ برکتوں اور کامیابیوں کا رشتہ مابین ناصر اور صدیقہ عائشہ ناصر کے اکتوبر ۱۹۶۲ء سے لے کر نمبر ۱۹۸۲ء تک قائم رہا اور فخر و عظمت کے ساتھ پختہ ہوتا رہا۔

لیکن

روزِ حشر تک یہ رشتہ مابین ناصر احمد اور صدیقہ عائشہ ناصر آسمان پر پختہ و تابندہ رہے گا۔ کیونکہ یہ مثالی جوڑا دین کی شاہراہوں پر قدم جما کر چلنے والا تھا۔ اور کہیں بھی راستہ ٹکرایا نہیں اور ایسے بے مثال جوڑے دین و دنیا کے ہمسفر ساتھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں دعاؤں کے ہمراہی تھے۔ وہ اکثر ایسی سوچیں جن کا دھارا

قربانی سے نکلتا ہو مل کر شیئر (SHARE) کیا کرتے تھے۔ ایک دن ایسا آیا کہ شیخ ناصر احمد کی قربانی کا وقت معراج آگیا۔ وہ دنیا میں قدم قدم پر قربانی کیا کرتے تھے۔ کبھی وقت کی قربانی دیتے اور کبھی مال کی قربانی پیش کرتے تھے مگر ایک دن ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کو جمعہ کے دن حضور پُر نور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کا پیغام محبت ڈاکٹر مظفر احمد شہید امریکہ کا تام فضا میں گونجا تو شیخ ناصر احمد نے انتہائی حسرت سے یہ جملہ کہا کہ " یہ تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔ اور ایسی زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں۔"

اس زندگی کی خواہش کرنے والے ناصر ایک دن ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کو جمعہ کے دن حضور کے خطبے کو بار بار سنتے رہے اور دو دن بعد وہ دعا قبول ہو گئی جو زبانِ حال ۱۶ ستمبر کو کہہ رہے تھے۔ یعنی ۱۸ ستمبر ۱۹۸۳ء کو جب عید کی نماز ادا کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو ہماری امی جان کو کہا کہ اس وقت حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ مولانا عبدالمالک خان صاحب اور ڈاکٹر مظفر احمد شہید اوپر جنت میں اپنی محفل جمائے ہوئے ہوں گے۔ تو امی جان نے کہا آئیں چلیں پھر ہم بھی عیدگاہ میں جا کر اپنی محفل لگائیں۔ یعنی ابو جان یہی خواہش رکھتے تھے کہ شہادت نصیب ہو اور اسی دن محفل لگ گئی اور دعا قبول ہو گئی کہ خود بھی اسی صف میں جا کر کھڑے ہو گئے۔"

جو چاہے تو تُو وہی غیر فانی بن جائے
وہ زندگی کہ جسے سب حباب کہتے ہیں

(کلامِ محمود)

محترم ناصر احمد شہید کی چند یادیں

نہایت بلند اخلاق، خوش گفتار، با وصف، با اصول، باحیا۔ بہت نفیس سخی دل، دُور اندیش، معاملہ فہم، ہنس مُکھ، سچائی کا علمبردار، اپنوں کا غمگسار اور غیروں کے کام آنے والا۔ والدین پر جان نچھاور کرنے والا۔ اولاد کو تربیت کے سنہری اصولوں میں پرونے والا۔ بہنوں سے سچی اور حقیقی ہمدردی کرنے والا۔ بھائیوں کے متعلق اس حدیث پر سختی سے کاربند رہنے والا کہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ جماعتی عہدہ داروں کی اُسی طرح عزت کرو اور اطاعت کرنے والا جیسے کہ اُن کا حق ہے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کے موٹو (MOTO) "محبت سب کے لئے اور نفرت کسی سے نہیں" پر سختی سے عمل کرنے والا ایک وجود تھا۔

اِن صفات کا حامل ایک وجود تھا جس کا نام تھا محترم ناصر احمد شہید۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ انہوں نے اپنے حقیقی مالک کی عطا کی ہوئی سب سے پیاری چیز یعنی اپنی جان اُسی کی راہ میں اُسے واپس لوٹا دی اور وہ مقامِ شہادت پایا جس کی بڑے بڑے جرنیلوں نے تمنائیں کیں۔ لیکن ولئے قسمت کہ ان کو یہ مقام نصیب نہ ہوا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صالحیت کے مقام سے بلند مقام یعنی شہادت کے مقام بھی آنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ شہادت کا مقام اُسے عطا فرماتا ہے جو اپنی زندگی میں صالحیت

کے مقام کا حق ادا کر دے۔ سلسلہ کے کام بہت دلچسپی سے نمٹاتے تھے۔ وہ جماعت احمدیہ اوکاڑہ کے سیکرٹری جائیداد تھے۔ اُن کے دور میں جماعت کو قبرستان کے لئے قطعہ اراضی ملا۔ جس کی انہوں نے بہت محنت سے چار دیواری تعمیر کروائی پھر اُس میں جنازہ گاہ تعمیر کروائی۔ حلقہ سیٹھ کالونی میں ایک بہت ہی خوبصورت اور چھوٹی سی بیت الذکر بھی اُن کے دور میں تعمیر ہوئی۔ انہوں نے ذاتی دلچسپی لے کر جامع بیت الذکر کی وسیع پیمانے پر مرمت کروائی۔ پھر محنت اور لگن سے چھت والے پنکھے لگوائے۔ عید گاہ کے باہر "فضل عمر" مارکیٹ تعمیر کروائی جس سے مقامی جماعت کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔ غرضیکہ سلسلے کا بہت درد رکھتے تھے۔ پچھلے دو سال سے وہ "بجٹ کمیٹی" کے رکن رہے۔ ان کی محنت اور خدا کے فضل سے مقامی جماعت کے بجٹ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ وہ جماعتی چندے باقاعدگی سے ادا کیا کرتے تھے۔ تقریباً روزانہ ہی صبح تفسیر صغیر کا مطالعہ کرتے تھے۔ اور کسی نہ کسی بہانے سے صبح کا پڑھا ہوا مضمون بیان کر دیتے تھے تاکہ دوسرے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ نمازیں بہت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور ہر معاملے میں بہتری کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے۔ نیز حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں دُعائیہ خطوط لکھتے رہتے تھے۔ آپ کو خدا پر کامل توکل تھا۔ جب بھی کسی پریشانی کا سامنا ہوتا تو کہا کرتے تھے کہ میں تو خدا کے حضور بہتری کی دعا کرتا ہوں اور اس کی جناب سے بہتری کی اُمید رکھتا ہوں۔

سیکرٹری امور عامہ کی حیثیت سے انہوں نے بے شمار جھگڑوں کے فیصلے کروا دیے تصفیہ اس طور پر کرتے تھے کہ دونوں فریق فیصلے سے خوش ہوتے تھے۔ خاکسار کبھی ان سے کہتا کہ آپ نے اپنی ذہانت سے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے تو کہتے تھے کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی اور اس نے قبول کر لی۔ وہ

بہت سخی دِل تھے۔ کسی کی مدد کرتے تھے اور واقعۃً دوسرے ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کتنے لوگوں کی مالی اعانت کیا کرتے تھے سلسلے کے رسائل اور اخبار کا پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سلسلہ احمدیہ سے اِن ٹچ TOUCH رہنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ روزانہ "روزنامہ الفضل" کے مطالعہ کی عادت ڈالی جائے اور اکثر دیکھا گیا کہ الفضل موصول ہوا اور آپ نے فوراً پڑھنا شروع کر دیا۔

خلیفہ وقت کی طرف سے جو بھی تحریک کی جاتی آپ فوراً اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حضور کی جاری کردہ سب سے اہم تحریک "الداعی الی اللہ" میں بھی شمولیت کا شرف عطا فرمایا۔ ایک دوست نے ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر بیعت کی اور سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۷۴ء کا سال جماعت کے لئے بہت ابتلاء کا سال تھا۔ ان حالات میں انہوں نے اپنے گھر والوں اور جماعت کو جو حوصلہ دیا وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ہر قسم کا غم اور درد اپنے وجود کے اندر رکھتے تھے اور دوسروں کو تسلی اور حوصلہ دیا کرتے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا اور جماعت پُر آشوب حالات سے نکلی۔ ہمیشہ مُسکرانا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ ایک نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر اُس وقت بھی دیکھی گئی جبکہ ہزارہا لوگ اُن کا آخری دیدار کر رہے تھے۔

خاکسار نے بارہا دفعہ مشاہدہ کیا کہ وہ بیک وقت کئی جماعتی اور ذاتی الجھنوں میں گھرے ہوتے تھے۔ لیکن کسی تیسرے آدمی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ میں کسی پریشانی میں ہوں۔ ہر ملنے والے پر ایسا بھرپور پیار بھرا اثر چھوڑتے تھے کہ وہ تا زندگی آپ کو یاد رکھتا۔ گھر میں سب بھائیوں اور بہنوں سے بڑے ہونے کے باوجود کسی بھی معاملہ میں اپنا فیصلہ ٹھونستا نہیں کرتے تھے بلکہ کہا کرتے

تھے کہ میری ناقص رائے میں یہ معاملہ ایسے نمٹانا چاہیئے۔

ناصر احمد شہید کو والد صاحب سے اِتنا پیار تھا کہ ان سے کہا ہوا تھا کہ میرے کسی بھی معاملے میں آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ میرے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں وہ مجھے قبول ہوگا۔

اور یہ بات خاکسار نے اکثر دفعہ پورے ہوتے ہوئے دیکھی۔ والدہ صاحبہ سے ایک خاص تعلق تھا۔ بیاہ شادی اور لین دین کے معاملات میں اُن کی ذہنی، قلبی اور مالی مدد کیا کرتے تھے۔

چھوٹے بھائیوں کو پھیلتا، پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ بڑے ہونے کے باوجود ہماری خدمت کرتے تھے اور خوشی محسوس کرتے تھے۔

اپنی اولاد کی تربیت ایسے رنگ میں کی کہ احمدیت کی محبت اُن کے دلوں میں کُوٹ کُوٹ کر بھری۔ اطاعت کا نمونہ ایسے طور پر ان میں منتقل کیا کہ ان کا ہر اچھا وصف کمال طریقے پر ان کی اولاد میں نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو دینی اور دنیاوی تعلیم کے زیور سے آراستہ راہوں پر گامزن کیا۔

بنیادی طور پر وہ ایک تاجر تھے اور تاجر کی حیثیت سے کبھی کسی کو اُن سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ کسی کی دلآزاری ان کو قطعاً ناپسند تھی۔ اگر کبھی بھولے سے ایسی بات ہو جاتی تو فوراً معذرت کر لیا کرتے تھے۔ ہر ایک سے اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے۔ ہر کہنے والے کی بات غور سے سُنتے تھے۔ اگر کوئی بچہ بھی بات سمجھانے لگ جاتا تو معلوم ہونے کے باوجود بہت توجہ سے سُنتے اور اس کی دلجوئی کرتے تھے کہ کہیں اس کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ کوئی بھی بات جو اُن کو معلوم نہ ہوتی تھی اُسے معلوم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

دوسرے لوگوں کے مشکل کام کر کے بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان

کا کام ایسی دلجمعی سے انجام دیتے تھے کہ ان کو احساس تک نہیں رہتا تھا کہ ہمیں کوئی مشکل کام کرنا تھا۔

بہت پُرمغز گفتگو کیا کرتے تھے۔ ہر کسی کا دُکھ اِس غور سے سُنتے کہ اُسے احساس ہو جاتا تھا کہ یہ میرے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔

اعلیٰ اخلاق اُن کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں تھی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ دُنیا کی خریدنے میں سستی ترین اور فروخت کرنے میں مہنگی ترین چیز اعلیٰ اخلاق ہے۔

شہید کی زندگی میں بہت نفاست تھی اور بہت نفیس چیزیں پسند کیا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو بہت نفیس شہادت کی زندگی عطا فرمائی۔

خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ انہوں نے ناظم صاحب خدمتِ خلق سے کہا ہوا تھا کہ کوئی بھی مہمان تشریف لائیں تو کھانا میرے گھر سے کھلایا جائے گا۔ اور جو کھانا خود کھاتے وہی مہمان کو پیش کرتے تھے۔ اسی طرح گھر آئے ہوئے مہمانوں کی تواضع میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ اُن کے لئے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ کوئی ان کے گھر سے کھانا کھا رہا ہے۔

محترم ناصر احمد شہید کو نئی نئی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ اُس وقت تک کسی نئی چیز کی حقیقی خوشی محسوس نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہی چیز دوسرے بھائیوں کو بھی نہ مل جائے۔

اُن کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا۔ جب بھی کسی نئی جگہ پر جاتے تو آتے ہی ہمارے لئے پروگرام بنانا شروع کر دیتے کہ آپ بھی ضرور جائیں۔ یعنی کوئی بھی خوشی اُن کے لئے خوشی نہ تھی جب تک وہی خوشی اور راحت بھائیوں کو نہیں مل جاتی تھی۔

ان مختصر یادوں کے بعد جس نتیجہ پر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ،

اللہ تعالیٰ اپنے بہت پیارے بندوں کو اس فانی دنیا میں پیدا فرماتا ہے اور

وہ پیارے بندے دنیا کو خدا کی پسندیدہ راہوں پر چل کر دکھاتے ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے اِن پیارے بندوں کو واپس اپنے پاس بُلا لیتا ہے تاکہ دنیا والے یاد کریں اس بندے کو اور اس بندے کے پیدا کرنے والے یعنی خالقِ حقیقی کو جس نے اس پیارے بندے کو پیدا فرمایا کہ وہ خالقِ حقیقی کتنا پیارا ہے۔ واقعی وہ ہستی بہت پیاری خوبصورت اور اپنی ذات میں واحد ہے جس کی حمد ہمارا فرض اور ایمان ہے۔

فقط خاکسار

محمد صفدر

ناصر احمد شہید کا سب سے چھوٹا بھائی

شیخ ناصر احمد

(از رشحات فکر مکرم چوہدری خورشید احمد صاحب باجوہ اوکاڑہ)

اے شہید احمدیت ناصر عالی وقار
تیرے غم میں حالت ہو گئی زار و نزار

صبح عید اپنے لئے شام جدائی ہو گئی
آرزوؤں کے بھرے گھر کی صفائی ہو گئی

صدمۂ فرقت سے دل بریاں تو آنکھیں خوں فشاں
آہ لب پر آتش ہجراں ہے سینے میں نہاں

پڑ رہا ہے عکس خاموشی فضائے دہر پر
کاٹنے کو دوڑتے ہیں اپنے ہی دیوار و در

رو دیں جا کر کس کے در پر کس سے حال دل کہیں
کیسے اس چرخ ستم ایجاد کے چرکے سہیں

زندگی کی ہر تمنا ہے پریشان و تباہ
نالۂ دل لب پہ لرزاں ہو رہا ہے بن کے آہ

نخل الفت کی ہوئی ہے خشک ہر اک شاخسار
ہر طرف پت جھڑ کا موسم ہے ہوئی رخصت بہار

دم بدم سے تیرے خارستاں بھی گلزار تھا
توں میرا ہردم رفیق و مونس و غم خوار تھا

تو گیا تو دوستی کی ہر ادا رخصت ہوئی
رسم الفت چل بسی قدر وفا رخصت ہوئی

تو تھا سرچشمہ محبت کا عظیم انسان تھا
کون کہہ سکتا ہے تو کتنا عظیم الشان تھا

سنتے ہیں کہ جس گھڑی تو داخل جنت ہوا
تیرے استقبال کو رضواں ادب سے جھک گیا

یا الٰہی کر دعا خورشید احقر کی قبول
روز و شب تربت پہ اسکی رحمتوں کا ہو نزول

"اسلام کے معنی ہیں ذبح ہونے کے لئے ۔ گردن
آگے رکھ دینا ۔ یعنی کامل رضاء کے ساتھ اپنی
رُوح کو خدا کے آستانہ پر رکھ دینا یہ پیارا نام
تمام شریعت کی رُوح ہے اور تمام احکام کی جان
ہے ۔ ذبح ہونے کے لئے اپنی دلی خوشی اور رضا
سے گردن آگے رکھ دینا کامل محبّت اور کامل عشق کو
چاہتا ہے اور کامل محبّت کامل معرفت کو چاہتی ہے
پس اسلام کا لفظ اِسی بات کی طرف اشارہ کرتا
ہے کہ حقیقی قربانی کے لئے کامل معرفت اور کامل
محبّت کی ضرورت ہے نہ کسی اور چیز کی ضرورت ۔"

(لیکچر لاہور صد ۱۵۲)

ایک نظر میں

نام	شیخ ناصر احمد صاحب
والدِ محترم	شیخ فضل احمد صاحب
تعلیم	مڈل پاس
پیشہ	تجارت
آغاز ازدواجی زندگی	۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۹ء، محترمہ عائشہ صدیقہ بنت خواجہ عبد الصمد صاحب
عہدہ بوقت شہادت	سکریٹری امور عامہ و جائیداد
تاریخ شہادت	۱۸ر ستمبر ۱۹۸۳ء
مقام شہادت	اوکاڑہ
تدفین	بہشتی مقبرہ ربوہ
آلۂ قتل	چھری نیزہ نما
شمائل	سخی و رحم دل، غریبوں کے بے انتہا ہمدرد، تہجد گزار درود شریف کے شائق۔ جماعتی کاموں میں پیش پیش خوش لباس و خوش کلام

چوہدری عبدالحمید شہید

۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۸۴ء تک

تقسیم ہند سے پہلے محترم چوہدری سلطان احمد صاحب کے آباؤاجداد ضلع ملتان میں رہائش پذیر تھے۔ مگر بعض وجوہات کی بناء پر سلطان احمد صاحب نے نقل مکانی کر کے مستقل طور پر سندھ کو اپنا وطن بنالیا اور لاکھا روڈ کی زمین خرید کر آباد کرنی شروع کر دی۔ اور اس طرح اِس نو آبادی والے گوٹھ کا نام گوٹھ سلطان علی رکھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ جگہ چھوڑ کر محراب پور تجارت کی غرض سے جا آباد ہوئے اور یہیں اناج کے بیوپار کا کاروبار شروع کر دیا اور آج تک ان کے گھرانے میں اناج کے بیوپاری کا کاروبار جاری ہے۔ وہ یہی سوچ کر محراب پور آئے ہوں گے کہ باآسانی تجارت کے مواقع میسّر آئیں گے۔ کچھ شہری سہولتیں، منڈی اور کچھ اسکول وغیرہ کی آسانیاں میسر آجائیں گی مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے ہاں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہونے والا بچّہ جو ملتان میں پیدا ہوا تھا اپنے خون سے محراب پور کی سرزمین کو بھی سیراب کرے گا اور اُن کے گھر کو منوّر کرے گا۔ یعنی محراب پور میں آکر انہوں نے امام وقت کی شناخت کر لی اور بفضلِ خدا ۱۹۴۹ء میں امام جماعت احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (خدا تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس طرح احمدیت میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

گویا

۱۹۴۰ء میں ضلع ملتان میں پیدا ہونے والا بچہ عبدالحمید پیدائشی احمدی نہیں تھا مگر ۹ سال کی عمر میں ہی اطفال الاحمدیہ کے زمرے میں شامل ہو گیا تھا اور اپنے باپ کے اس روحانی انقلاب سے ننھا بچہ متاثر بھی بہت تھا لہٰذا وہ اپنے ابوجان کا بغور مطالعہ کرتا رہا اور بالآخر ۱۹۵۹ء میں ۱۹ برس کی عمر میں اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر اپنے والدِ محترم کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اس طرح ۱۹۵۹ء کا سال اس خاندان کے لئے وہ مبارک سال تھا جو خاندان سلطان علی میں احمدی افراد کا اضافہ کر گیا۔ اور اس طرح باپ کو اپنے بیٹے کی تربیت پر کماحقہٗ توجہ دینے کی زیادہ ضرورت پیش آگئی۔ میٹرک تک تو تعلیم محراب پور میں ہی دلوائی مگر اس کے بعد ذہنی آماجگی اور ذہنی آگہی کے لئے ربوہ مرکز میں بھیج دیا گیا۔ جہاں عبدالحمید صاحب نے تعلیم الاسلام کالج میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی۔ اور بعد میں میدانِ تعلیم چھوڑ کر اپنے آبائی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ یعنی غلہ منڈی کا مرکزی کام شروع کر دیا۔

ادارہ تعلیم کا اثر خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے آپ نے ربوہ کے مرکز میں دین کی تعلیم کو بیش از بیش توجہ دے کر حاصل کیا۔ بعدہٗ ممتاز کالج خیرپور میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ فطرت کی نیکی ہمیشہ آپ کے لئے راستے ہموار کرتی چلی گئی۔ ربوہ میں قرآنِ مجید کا شغف آپ کا لائحہ عمل رہا اور قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کے باریک در باریک معانی کی ہمیشہ جستجو رہی۔ اگرچہ باقی مسائل بھی ان کے آسان تر ہوتے چلے گئے اور ہوتا بھی یہی ہے کہ ہر ادارہ کسی انسان کی تخلیق اور اخلاق و عادات میں بہت حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن ماحول کا اثر جلد اور بآسانی قبول کرتا ہے۔ اگر اس کو دینی ماحول

میسر آجاتا ہے اور طبیعت و پسند کے مطابق وہ خود کو ڈھال لیتا ہے تو
اُس کے تمام راستے ہموار ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ماں کی گود + فطرت + ماحول +
گھر کی تربیت کسی بھی وجود کو بہتر انسان بنانے میں ممد و معاون ہوا کرتے ہیں
بشرطیکہ وہ عوامل اپنی اپنی جگہ صحیح اور معروف نمونہ سے کام کر رہے ہوں اور
ارتقائی منازل طے کرنے میں بھی چنداں مشکلات پیش نہ آئیں۔

چنانچہ

عبدالحمید صاحب کو جب باپ کی خواہش کے مطابق دینی ماحول مرکز میں میسّر
آگیا تو آپ نے مسائل اور مطالعہ کے لئے زندگی وقف کر دی۔ وہ اختلافی
مسائل اور تفسیر قرآن مجید میں ہمہ وقت مشغول رہے اور جب عملی زندگی میں
داخل ہوئے تو بھی ان کا مرکزی کام تھا کہ وہ داعی الی اللہ کے طور پر زیادہ وقت
خرچ کریں۔ چونکہ غلہ منڈی میں کام کرتے تھے اس لئے ان کا رابطہ بھی لوگوں
کے ساتھ زیادہ ہی رہتا تھا۔ اور اسی طرح میل و ملاقات کی بناء پر انہیں اپنا
مدعا بھی سمجھا دیا کرتے اور تبلیغ کی وہ تشنگی جو انسانی روح کے اندر ہوا کرتی
ہے اس کو تسکین دینے کے لئے وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے ہی دم لیتے تھے۔

ازدواجی زندگی محترم عبدالحمید شہید کی شادی فیصل آباد والے محترم ڈاکٹر
فضل کریم صاحب کی صاحبزادی محترمہ امۃ اللہ راشدہ
صاحبہ سے ۱۹۶۲ء میں عمل میں آئی۔ چونکہ سسرال کا خاندان بہت زیادہ دیندار
اور مشنری نمونے کا تھا اس لئے عبدالحمید صاحب کا گھریلو ماحول بھی بہت حد
تک نکھر گیا۔ جو چیزیں عبدالحمید صاحب کو اپنی والدہ محترمہ سے نہ مل سکیں وہ ایسی
مربیانہ ماحول میں بآسانی میسّر آگئیں۔ مثلاً جلسے اجلاس، منظم اوقات، تحریکات
و چندہ جات وغیرہ وغیرہ اور ایک مربیانہ گھر کا تقاضا بھی یہی ہوتا ہے کہ اس

کے ارکان اور مقاصد یکسر سامنے ہوں اگر کہیں بیوی سے چوک ہو جائے تو میاں متوجہ کرے اور اگر میاں کہیں غافل ہو جائے تو بیوی بیدار کر دے۔ خدا تعالیٰ نے عبدالحمید صاحب کو پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کیں۔ (۱) محمد منور صاحب جو آج کل صدر جماعت احمدیہ محراب پور ہیں۔ (۲) محمد ناصر صاحب (۳) منظفر حسین صاحب (۴) محمد اسلم صاحب اور محمد احسن صاحب اور بیٹیاں بشریٰ نفیلت صاحبہ اور سلمیٰ ندرت صاحبہ تمام خاندان اپنی اپنی جگہ اسم بامسمیٰ ہے۔ الحمدللہ

عبدالحمید صاحب کی اولاد آپ کی توجہ کی دولت سے مالا مال تھی۔ کیونکہ آپ اُن کی تربیت پر بیشتر وقت خرچ کرتے تھے۔ بلکہ رات کو زیادہ تر وقت دیتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ عبدالحمید صاحب نے رات کا اسکول کھول رکھا تھا۔ تمام بچوں کو انفرادی طور پر پڑھاتے اور نماز فجر کے بعد انہیں پھر پڑھاتے اور تاکیداً متوجہ کرتے کہ یہ وقت حصول تعلیم کا بہترین وقت ہے۔ کیونکہ دل و دماغ زیادہ تر شفاف و تازہ اس وقت ہوتا ہے۔ اسی وقت کی یادداشتیں ساری عمر کام آتی ہیں اور آئیں گی۔ انشاءاللہ۔

عشق قرآن اور درود شریف

میں نے شہداء کے حالات میں یہ بات نوٹ کی ہے کہ تقریباً تمام شہداء کو قرآن پاک اور درود شریف سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو قرآنِ مجید سے محبت کرتے ہی مطاہر لوگ ہیں اور ان کی محبت ان کو عمیق عشق کی وادی میں لے جاتی ہے۔ جہاں ان کو وصلِ خدا نصیب ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق ہر شخص اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ یہ جواہرات ہیں ہی ایسے کہ نہ زر سے ملتے ہیں نہ زمین سے بلکہ نصیب میں آتے ہیں ان لوگوں کے جو پیار کرتے ہیں اپنے خالقِ کل سے اور توجہ دیتے ہیں۔ غوطہ زن ہوتے

ہیں اور گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیساکہ حضرت مسیح موعود (خدا تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) کا معمول تھا کہ قرآن مجید کے باریک در باریک نکات تلاش کرنے میں گھنٹوں صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ بٹالہ جاتے ہوئے آپ نے سورۃ فاتحہ کے معارف دغوامض پر تادیر سر جھکائے رکھا اور ہمہ تن اس معرفت کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ اس حد تک آپ کو موتی و جواہرات اس بے پایاں سمندر سے ملے کہ آج ہر احمدی کے در و دروازہ پر روحانی خزائن کی شکل میں عرفان کا دریا بہہ رہا ہے اور ہر احمدی اپنی ہمت کے مطابق اپنی جھولی قرآن حکیم کے موتیوں سے بھر رہا ہے۔

سو عبدالحمید شہید نے روحانی خزائن سے محبت کی لیے اوقات کا بیشتر حصہ معارف کی تلاش میں صرف کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے عشقِ قرآن کا بہت اچھوتا رُخ اپنایا کہ اپنا بیٹا ہی قرآن کی محبت میں وقف کر دیا۔ ان کا ایک بیٹا محمد ناصر جس نے قرآنِ پاک حفظ کیا اور اپنے سینے میں اُتار کر کما حقہ عشق کا ثبوت دیا۔ امتہ اللہ راشدہ صاحبہ والدہ محترمہ محمد ناصر قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کے بیٹے کو خدا تعالیٰ نے تاجِ قرآن سے سجایا ہے۔ وہ حافظ قرآن ہوا اور خدا کی رحمتیں اس خاندان پر مترسم ہوگئیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ سے پیار کرنے کی ایک شہادت حفظِ قرآن بھی ہے اور یہ تمام تر عاشقِ قرآن عبدالحمید صاحب کی محنت و توجہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اپنے بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے عبدالحمید صاحب کوئی نہ کوئی بندوبست کرتے ہی رہتے۔ وہ عام ماں باپ کی طرح ایک نامکمل جملہ "کہ کوئی پڑھانے والا اچھا نہیں ملتا" کہہ کر خود کو سبکدوش خیال نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ اپنے اخراجات پر بچوں کے معلم منگوا کر رکھتے تھے اور پھر ان کی نگہداشت اور مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ آنے دیتے تھے۔ مثلاً انہوں

نے حافظ فتح محمد صاحب کو ربوہ سے منگوایا تھا جو نابینا تھے۔ وہ بچوں کو خوب لگن سے پڑھاتے تھے ادھر عبدالحمید صاحب کو یہ شوق تھا کہ قرآن کریم کا یہ پھول اور پھل میرے گھر کے صحن میں ہر لحظہ رچتا بستا رہے۔ سو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ حافظ محمد ناصر صاحب کی شکل میں یہ قرآن عبدالحمید کے صحن میں آباد ہے۔ اور اِس طرح قرآن مجید کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ ان کے گھر میں زندہ جاوید ہے۔ وہ اِس نایاب تحفہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک یہ بھی سعی کرتے کہ جب کبھی بیت المال کے انسپکٹر صاحب علاقہ کا دورہ کرنے کے لئے آتے تو وہ انہیں اپنے ہاں بصد شوق ٹھہراتے۔ تا آنکہ بعد از دورہ وہ ان کے گھر قیام پذیر ہوں اور ان کی قربت بچوں کو قرآن مجید کی تلاوت و معنی سے بہرہ ور کر دے۔ اسی میں ان کی خوشنودی تھی۔ سو وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی راستہ حصولِ نعمت کے لئے نکال ہی لیتے تھے۔ اور یہی کسی سچے پیار کرنے والا کا پیار ہوتا ہے۔ جو منزلیں آسان کرتا ہے اور راستے روشن کر دیتا ہے۔

اِس پیار کو نکھارنے کے لئے عبدالحمید صاحب زیادہ تر وقت درود شریف میں گزارتے تھے۔ وہ تہجد گزار بھی تھے اور ہر کام کی ابتدا اور انتہا درود شریف سے ہی کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ایک دو نمازیں جو گھر میں ادا کرتے ہیں۔ باجماعت ہوں اس لئے اہل خانہ کو نماز کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ مسجد میں جو نمازیں ادا کرتے ان میں بچوں کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ بعدہٗ تلاوت اور ترجمہ میں کئی باریک مسائل بیان کرتے تھے۔ پس یہی کوششیں کسی اولاد کی بہتر تربیت کی ضمانت ہو سکتی ہیں۔ سو وہ باپ خوش نصیب ہے جس کا بیٹا حافظِ قرآن ہے اور اولاد خوش نصیب ہے کہ ان کا باپ شہید راہ مولیٰ ہے اور جان کی قربانی دے کر بیٹوں کے لئے راستے ہموار کر دیئے ہیں۔ اور قربانی ہی مومن کا

معراج ہے۔ اور قربانی وہی لوگ دیتے ہیں جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ جان دینا زندگی بخش ہے۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں وہ بے پرواہ ہو کر میدانِ عمل میں آجاتے ہیں اور داعی الی اللہ ان کا لقب العین ہوتا ہے۔ اور ہر آنے جانے والے کے لئے وہ دعوتِ حق مہیا کرتے ہیں اور انہیں راہوں پر چلتے چلتے دیئے سے دیا جلاتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر کوئی ناعاقبت اندیش آگے بڑھ کر ان کی زندگی کا دیا گل کر دیتا ہے۔

مگر وہ تو

اپنی مقصدیت پالیتے ہیں اور اپنی بقا کا سامان کر جاتے ہیں۔ وہ بے فکر اور بے خوف آگے بڑھتے ہیں اور ایسے نقش ثبت کرتے ہیں کہ آیندہ ان نقوش پر چلنے والا جب آگے بڑھتا ہے۔ تو تمام راستے روشن پاتا ہے۔ اور یہ جانے والے کی سخاوت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ مضبوط نقش چھوڑ جاتا ہے۔

عبدالحمید شہید ایک روز ۱۰ اپریل منگل کے دن جو کہ ان کی پاکیزہ زندگی کا سنہرا باب تھا صبح ۱۰ بجے کے قریب بازار سے اپنی آڑھت کی دوکان کی طرف آرہے تھے۔ راستہ میں ایک جلد ساز کی دوکان پر بچوں کی کتابیں جلد کروانے کے لئے دی ہوئی تھیں۔ اس دوکاندار سے کتابوں کے بارے میں پوچھ کر آپ نے سائیکل چلایا ہی تھا کہ پیچھے سے قاتل نے آواز دی کہ "عبدالحمید میری آواز سننا" (قاتل آپ سے ہر سال زکوٰۃ وغیرہ بھی لے کر جاتا تھا) آپ نے ابھی سائیکل سے پاؤں نیچے رکھا ہی تھا کہ قاتل نے پیچھے سے آکر آپ کے سینے پر سیدھے ہاتھ کی طرف چھری گھونپ دی۔

آپ سائیکل سے اُتر کر نیچے بیٹھ گئے اور اپنے ہاتھ سے پکڑ کر چھری سینے میں سے نکال لی ۔ لوگوں نے قاتل کو موقعہ پر ہی پکڑ لیا تھا اور اس کی بہت پٹائی بھی کی ۔

اس نے کہا کہ یہ قادیانی ہے میں نے اسی لئے اسے مارا ہے اور جہاد کیا ہے ۔ لوگوں نے آپ کے بڑے بھائی کو اطلاع کر دی وہ آپ کو اٹھوا کر قریبی ہسپتال لے گئے ۔ جہاں پر ڈاکٹر نے زخم کو ٹانکے لگا دیئے اور کہا کہ انہیں نواب شاہ لے جاؤ ۔ نواب شاہ لے جانے کے لئے آپ کو گاڑی میں ڈال کر تھوڑا دور ہی گئے تھے کہ آپ نے اپنی جان مالک حقیقی کے سپرد کر دی ۔ زخم کی وجہ سے آپ کا پھیپھڑا سخت مجروح ہو گیا تھا ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آپ چونکہ سماجی اور لوگوں کی بھلائی والے کاموں کی وجہ سے علاقہ میں نہایت مشہور تھے اس لئے آپ کی شہادت پر غیر احمدی لوگوں نے نہایت دکھ اور غم کا اظہار کیا تھا ۔ آپ کے قاتل کو سزا دلوانے کے لئے ضلع کونسل نواب شاہ تحصیل کونسل کنڈیارو، یونین کونسل بھلانی اور ٹاؤن کمیٹی محراب پور نے قرار داد تعزیت پاس کیں اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ قاتل کو سخت سے سخت سزا دیں ۔

یہ باتیں تو دُنیا کے دربار کی ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے دربار میں شہادت پانے والے کا مرتبہ کیا ہے ؟ اور شہید کرنے والا کا حشر کیا ہے ؟

حقوق العباد

دُنیا سے دُکھ دور کرنا اُن کا نصب العین تھا تعلق باللہ کا جہاں تک سوال ہے ۔ عبدالحمید صاحب نے اپنے شب و روز میں ایک منظم پروگرام بنایا تھا ۔ کہ تہجد کے بعد صبح نماز با جماعت ادا کر کے تلاوتِ قرآنِ مجید سے دن کا آغاز کرتے اور اسی طرح بچوں کو تلقین و نصیحت

کرتے۔ روزہ خود رکھتے اور بیوی بچوں سے تقلید کی تمنا کرتے۔ مالی قربانی کو زندہ رکھنے کے لئے چندہ خود دیتے، بیوی بچوں کو بھی شامل کرتے۔

مردِ مومن کے لئے حقوق العباد کی نگہداشت بھی لازمی ہوتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ عبدالحمید صاحب نے اپنی احمدیت کے بعد والی ۲۲ سالہ زندگی کس طرح گزاری۔ اور کس کس طرح حقوق کی نگرانی کی۔

چونکہ اس چھوٹے سے شہر محراب پور میں سماجی اور معاشرتی کام آپ بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔" اس لئے گاؤں کے گاؤں ہر روز ایک نہ ایک مسئلہ لے کر آجاتے تھے۔ اور آپ بڑے شوق و انصاف سے حل کرتے تھے اور دفاتر میں جاکر ان سادہ لوح لوگوں کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ کیونکہ آپ کی مختلف محکموں میں بہت جان پہچان تھی اس لئے تقریباً روزانہ دفاتر کا چکر ضرور لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد غیر از جماعت لوگ ان کے لئے رطب اللسان ہیں کہ " بندہ بہت ہمدرد تھا اور انسانیت کا اعلیٰ درجے کا دوست تھا۔ اُن کی نمازِ جنازہ ان کے سُسر محترم جناب ڈاکٹر فضل کریم صاحب نے محراب پور میں ادا کی

بے شک کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو غیر کو بھی سکھ پہنچانے کے لئے تیار رہتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اپنا ہے یا بیگانہ ہر ایک کو سکھ پہنچانے کے لئے

کسی خاص احمدی کو تلاش کیا جائے بلکہ اُلٹے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کسے سُکھ پہنچانے کے لئے کسی انسانی، حیوانی یا حس رکھنے والی مخلوق کی ضرورت ہے۔ دنیا سے دکھ کو دُور کرنا اس کا نصب العین ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ "

(خطبہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث)

کا امام بنا دے۔

اور

جب یہ روح زندہ ہو جائے تو ہر شخص زندگی کے تمام لمحات میں یہی پکارتا ہے کہ اے مولیٰ تو نے اولاد جیسی نعمت تو عطا کی ہے۔ اس نعمت کو امتحان نہ بنانا بلکہ یہ دُنیا میں میرے کاموں کو زندہ رکھنے والے ہوں۔ میرے دین کو پھیلانے والے ہوں۔ اور قیامت کے دن جب میں اُٹھوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو کر میں ان لوگوں کا امام ہوں۔ جنہوں نے دنیا میں تیرے نام کو بلند کیا۔ اسلام کے جھنڈے کو اونچا رکھا اور تیرے بندوں کو پُرسکون رکھا۔ اور یہ چیز صرف اور صرف نیک تربیت اعلیٰ تعلیم، پاکیزہ ماحول دعاؤں اور فضل ربی سے میسر آسکتی ہے۔ سو الحمدللہ کہ عبدالحمید شہید کے اہل خانہ میں سے زیادہ تر بچے دین کے لئے وقف ہیں۔

بڑا بیٹا منور احمد امیر جماعت محراب پور ہے اور اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ جماعت کی یہ اعلیٰ درجہ کی ذمہ داری صرف وہی کندھے برداشت کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے رات دن کا فرق مٹا کر اپنی جان و مال دین کی راہ میں قربان کرتے ہیں اور دین کا علم بھی انہیں ہوتا ہے۔ وہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ دین کا کوئی نکتہ بھی اُن کے احاطہ علم سے باہر رہے کیونکہ وہ ایک ایسے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ جو امام کا مقام ہوتا ہے۔ اور اس جماعت کی امارت ان کے سپرد ہوتی ہے۔ جس میں تمام قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ ان کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے اور گرم و سرد طبائع سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔

بیشک وہ خلیفہ وقت کے نمائندہ حقیقی ہوتے ہیں اور کسی باپ کے لئے یہ فخر کا مقام ہے اور اس کی امامت کا ثبوت ہے کہ اس کی تربیت و امامت میں اُسکی اولاد نے خدا کی رضا کی راہوں کو قبول کیا اور نیک نسل ہونے کا ثبوت

دیا۔ عبدالحمید صاحب کا دوسرا بیٹا خدا تعالیٰ کا پیار اس طرح بھی حاصل کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے وہ کلام الٰہی کو اپنے سینے میں سجا لیتا ہے۔ اس کے پیار کے نمونے ہیں۔ اور انوکھے طریقے ہیں۔ کوئی تو کلام خدا کے نور سے منور ہوتا ہے اور کوئی اس نور سے روشنی پاکر خدا کو جا پاتا ہے یعنی اس کے معانی و تفسیر پڑھتا ہے۔ اور ایسے بھی عاشق قرآن ہیں جو قرآن کو ورد زبان کرتے ہیں اور ایک ایک لفظ پر ان کی زبان مُہر لگاتی ہے۔ ان کا سینہ لفظۂ نور ہو جاتا ہے۔ ان کا دل پناہ گاہ ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت امام حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا خدایا آپ کے قرب کا کیا ذریعہ ہے تو خدا تعالیٰ نے فرمایا۔

"تلاوت کلام پاک"

پس اے عبدالحمید شہید آپ کو مبارک باد قبول ہو کہ آپ کی اولاد سے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ اور آپ کی دی ہوئی تعلیم و تربیت سے انہوں نے دینِ حق کے جھنڈے کو بلند رکھا اور آپ کی اولاد کو مبارک ہو کہ اُن کے معلم نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ طیبہ کی خاطر اپنی جان تک جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ خدا تعالیٰ نے اُن کی دعائیں قبول کیں اور اُنھیں آسمان کی بلندیاں عطا کیں۔ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں مقام رفعت عطا کرے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ساتویں آسمان پر جگہ دیتا ہے۔

(کنز العمال جلد ۲ صـ۲۵)

پس مبارک ہو کہ" آپ ایک حافظِ قرآن کے باپ اور شہید کلمہ توحید ہیں"

حق الیقین

بیشک محبت الٰہی کا نشہ ہی تو ہے کہ وہ جنبش نہ کھانے والے ایسے میدانِ عمل وسیع تر کر جاتے ہیں اور ایسے ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھنے والی نگاہ بھی میدانِ عمل میں اُتر آتی ہے۔ اور کسی شہید کے نقش پا خالی نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ دوسرے دفعتاً اُس پر اپنے پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ صرف کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ اس پر استقامت سے قائم رہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ تمام محبت الٰہی کا نشہ ہے۔ ورنہ صرف سوئی چبھنے سے ہی انسان دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ مگر داعی الی اللہ ایک ایسا ایمان لے کر قدم جماتا ہے کہ کروڑ موتوں کے سامنے استقلال کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اور وہ یہ حق الیقین رکھتا ہے کہ کوئی موت اس پر وارد نہیں ہوگی۔ وہ زندہ رہے گا اور تا قیامت زندہ رہے گا۔

اگر دیکھا جائے تو یہ بھی ایمان بالغیب کا ایک معراج ہے کہ شہید خدا تعالیٰ کے وعدوں پر یقین کا وہ درجہ رکھتا ہے کہ آگ کے اندر ہاتھ ڈال کر یقین کی انتہا کو حاصل کر لیتا ہے۔ اور وہ مال، جان اور عزت کو قربان کرنے کے لئے ہر لمحہ تیار رہتا ہے۔

اور پھر

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تیرے تھوڑے کو قبول کیا جائے گا تیری اخلاص کی وجہ سے۔ تیری اس کوشش کے نتیجہ میں کہ تو خدا تعالیٰ کی محبت میں فانی ہونا چاہتا ہے۔ اور تو اپنا سب کچھ اُس کے حضور پیش کر دینا چاہتا ہے۔ تجھے ایک ایسا موتی مل جائے گا جو انمول ہے دنیا میں اس کی قیمت نہیں۔

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۳ دسمبر ۱۹۷۷ء)

پس

خدا کے دربار میں وہ ولایت پا جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کس پیار سے اس کے لئے فرماتا ہے۔

"مجھے کسی بات میں اس سے بڑھ کر تردّد نہیں ہوتا کہ اپنے ولی کی روح قبض کر دوں۔"

(ملفوظات جلد نمبر ا صفحہ ۵۱۲)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے ان ادوار کا کیسا جامع نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں:

ہم خدا کے عاجز بندے جس دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم نے بارہا یہی دیکھا ہے کہ ایک احمدی نے اگر چند پیسوں کا نقصان برداشت کیا تو اس کو سینکڑوں روپے اُس کے بدلے میں دیئے گئے۔ سینکڑوں کا اگر نقصان ہوا تو ہزاروں اس کو دیئے گئے اور اگر ہزاروں کا نقصان ہوا تو لکھوکھہا اس کو عطا کئے پھر جس جماعت کو یہ ضمانت ہو کہ تمہارا ہر غم خوشی میں تبدیل کر دیا جائے گا وہ خدا کی راہ سے کس طرح پیچھے قدم ہٹا سکتی ہے۔ جس جماعت کی تاریخ یہ گواہ ہو کہ تمہارا ہر خوف امن میں تبدیل کر دیا جائے گا وہ کس طرح کسی خوف سے پیٹھ دکھا کر پیچھے بھاگ سکتے ہیں چنانچہ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ داعی الی اللہ پیدا ہوتے ہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مصائب کو دیکھنے والے پھر آگے قدم بڑھانے والے۔

جانتے ہیں کہ ماضی ان کے لئے کیا لے کر آیا لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر ایسے ماضی کے بعد خدا کے فرشتے ان کے لئے کیا لے کر آئے۔ پس وہ گواہ ہوتے ہیں ان مصائب کے بھی اور گواہ ہوتے ہیں ان جنتوں کے بھی جو ہمیشہ ان مصائب کے دور ہونے کے بعد ان کو عطا کی جاتی ہیں۔ جب وہ اللہ کی طرف بلاتے ہیں تو اللہ

فرماتا ہے۔ دیکھو، دیکھو میرے ان بندوں سے زیادہ حسین حال دنیا میں کس کا ہو سکتا ہے۔ ان سارے ادوار سے گزرنے کے بعد بھی یہ پھر میری طرف آرہے ہیں پہلے یہ کہا تھا کہ رب ہمارا ہے۔ اب کہتے ہیں کہ تم بھی اسی رب کے ہو۔ اس تجربے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ ہم کو ایسی عظیم الشان دولت کو پا چکے کہ دل پھڑک رہا ہے کہ کاش تمہیں بھی یہ دولت ملتی اس جذبے اور اس جوش کے ساتھ وہ خدا کے دین کی طرف بلاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ایک عرب شاعر کا یہ شعر بڑی شان کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے

دیکھو وہ مصائب یا وہ جگہیں جہاں موت کے تاریک مصائب ہجوم کر رہے تھے اور ان کے چہرے رات کی طرح سیاہ ہو رہے تھے۔ ان مصائب کو کوئی کھول نہیں سکتا مگر آزاد ماں کا بیٹا جوان مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا ان کی طرف بڑھتا ہے اور داخل ہوتا ہے اور ہر تاریکی کو نور اور روشنی میں تبدیل کر دیا کرتا ہے اور ہر موت کو زندگی عطا کرتا ہے پس یہ ہیں وہ لوگ رَبُّنَا اللّٰہ کہنے والے اور استقامت دکھانے والے جن پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں جن کی ہر تاریکی نور میں تبدیل کی جاتی ہے۔ اور ہر تاریکی کے بسنے والے کو اُسی نور کی طرف بلانے والے ہوتے ہیں۔ جن کا ہر غم خوشی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ دنیا کی طرف بڑھتے ہیں کہ آؤ ہم تمہارے غم بھی اٹھائیں اور تمہارے غموں کو بھی خوشیوں میں تبدیل کریں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو خوف ڈراتے ہیں لیکن وہ ان خوفوں سے خوف نہیں کھاتے۔ اور پھر وہ دنیا کا خوف مٹانے کے لئے دنیا کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ہیں داعی الی اللہ جو ہمیں بننا ہو گا۔ یہ دُنیا ہزار قسم کی ظلمات کا شکار ہے ہزار خوف میں مبتلا ہے۔ ہزار حزن ہیں جو سینوں کو چھلنی کئے ہوئے ہے۔ اے احمدی آگے بڑھ اور ان خوفوں کو دُور کر۔ ان اندھیروں کو روشنی میں تبدیل کر دے اور ان غموں کو راحت و اطمینان میں تبدیل کر دے

کیونکہ تیرے مقدر میں یہ لکھا گیا ہے۔

خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۲ر فروری ۱۹۸۲ء
بمقام ربوہ

جنہوں نے آج لٹایا تمہارے کل کے لئے
بڑے ہی پیار سے درسِ وفا دیا ہے تمہیں
خدا کی راہ میں مرنا ہی زندگی ٹھہرے
یہ راز اپنے عمل سے بتا دیا ہے تمہیں

ایک نظر میں

نام	چوہدری عبد الحمید ولد سلطان احمد آرائیں
پیشہ	بیوپاری (اناج)
عمر	۱۹۴۰ء سے اپریل ۱۹۸۴ء
جائے پیدائش	ملتان
جائے شہادت	محراب پور (سندھ)
آلۂ شہادت	چھری (خنجر نما)
تعلیم	بی۔ ایس سی (ربوہ، محراب پور)
لواحقین	بیوہ، ۵ بیٹے، ۲ بیٹیاں
لباس	شلوار قمیص، جناح کیپ
قد و جسم	[illegible]، دُبلا جوانی کے وقت لیکن شہادت کے وقت فربہ تھے.
اوقات کار	صبح نماز سے پہلے جاگتے اور رات گیارہ بجے سوتے تھے
شغل	قرآن مجید کے مطالعہ کا بہت شغف تھا. ترجمہ و تفسیر پڑھتے تھے۔ تہجد گزار تھے۔ بچوں کی تعلیم و تعلم کا انتظام کرتے رہتے تھے.
عہدۂ جماعت بوقت شہادت	امیر جماعت محراب پور
نماز جنازہ	محراب پور میں آپ کے سُسر ڈاکٹر فضل کریم صاحب نے پڑھائی.
آخری آرام گاہ	بہشتی مقبرہ (ربوہ)

آپ موصی تھے۔

قریشی عبدالرحمٰن شہید

میری تو آنکھ کے تاروں پہ ٹک گئی ہے نظر
یہ لوگ کس لئے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں؟

جناب عبدالرحمٰن صاحب شہید جب بڑھاپے کی تمام منزلیں طے کر چکے تو آخری منزل پر پہنچانے کے لئے ایک نہیں، دو نہیں، چار نہیں بلکہ کئی ہاتھوں نے کلمہ توحید پڑھ پڑھ کر برچھیاں آزمائیں۔ اور یہ منظر سنگساری کا تھا۔ کیونکہ آج بھی ایک شہزادہ افغانستان کی طرح سکھر کی زمین میں زمین دوز ہو رہا تھا۔ صرف آلہ قتل مختلف تھا۔ آج ہر شخص یہ یقین لئے آگے بڑھتا تھا کہ میری برچھی مجھے نجات دلائے گی۔ واجب القتل کا پروانہ لے کر مسجد سے آنے والا ہر قاتل پُرامید تھا کہ جنت کا دروازہ اس کے لئے کھول دیا جائے گا۔ اور سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام اُسے پہنچے گا۔ اور شفاعت کا حقدار روزِ محشر نوازا جائے گا۔ اللہ اللہ کیا چرب زبانی (لسانی)۔ میرے ملک کے علماء نے پائی ہے۔ ایک بزرگ پیرانہ سال کا قتل ہوتا ہے صرف اس جرم میں کہ وہ ہم عقیدہ نہیں ہے۔ گو وہ ہم زبان ہے۔ ہم رنگ ہے

ہم وطن ہے۔ ہم سخن ہے۔ مگر قصور اس کا صرف یہ ہے کہ وہ کسی آنے والے مہدی کا انتظار نہیں کر رہا۔ بلکہ بزبانِ حال کہتا ہے کہ

یارو جو مرد آنے کو تھا وہ تو آچکا
یہ راز تم کو شمس و قمر بھی بتا چکا

عشقِ الٰہی

محبت و وفا کے پیکر قریشی عبدالرحمٰن ایک احمدی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ شہر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ بہت سے مطاع و متقی وجود دنیا کے طول و عرض میں پھیلا دیئے ہیں مثلاً چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب

اسی طرح قریشی عبدالرحمان بھی ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں دولت پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا نام قریشی غلام محی الدین احمد تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے پسرور میں حاصل کی۔ اور میٹرک پاس کرنے کے بعد آپ نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ مکمل کیا اس طرح اپنی تعلیمی زندگی کو تعلم و تعلیم کے سپرد ہی کر دیا۔ اور ایک معلم کی حیثیت سے زندگی کے شب و روز گزارنے شروع کر دیئے۔

ایک معلم کے لئے دیئے سے دیا جلانے والی بات ہوتی ہے وہ جب علم کے میدان میں نکلتا ہے تو علم کی شمع ہر در و بام پر جلتی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی حال قریشی عبدالرحمان کا تھا جب ۲۱، ۲۲ سال کی عمر میں وہ علم کی شمع لے کر نکلے تو سندھ کی سرزمین منتخب کی اور سندھ کی سرزمین میں بھی اپنے سندھ سکھر کو علم و معرفت کی روشنی دینا اپنا فرض جان لیا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں ریلوے ہائی اسکول سکھر میں ایک معلم کی حیثیت سے متعین ہو گئے۔ یہاں زندگی کے بہت سے نشیب و فراز آپ نے دیکھے۔ ساری زندگی سکھر کے لوگوں کو

حروف شناسی تو سکھائی۔ مگر افسوس سکھر کے لوگ مرد شناس نہ ہو سکے۔ کیونکہ آج انہوں نے تو مردِ مومن استاذ المکرم کو ہی نہ پہچانا۔ حروف کو وہ کیا جانتے؟ وہ پہچانیں گے کیا جانیں گے کیا۔ جو کہ انسانیت کو نہ جان سکے۔ ایک معصوم انسان کو جوان کے بچوں کو معرفت بانٹتے بانٹتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ نہ سمجھ سکے وہ لوگ کیا عارف بنیں گے جو ہر گھر گلی گوچہ میں روشنی کا چراغ جلانے والے انسان قریشی عبدالرحمٰن کو جب ذبح کیا گیا تو کوئی آگے نہ بڑھا۔ اس لیئے کہ اس کے مقدر میں ذبیح اللہ ہی ہونا تھا۔ وہ تو خدا کی راہ میں ذبح ہو گئے اور ذبح کرنے والے خوفزدہ تھے کہ مبادا اس عالم دین کی بوڑھی ہڈیاں اور ابلتا ہوا خون ان کی نسلوں کو گود لے لے۔ وہ اس کو مارتے چلے گئے، مارتے چلے گئے۔ اور ہر بار ہر شخص نے نعرہ بلند کیا کہ آج جنت ہی میری میراث ہے۔

حیف صد حیف اے میرے وطن کے لوگو! تم کتنے بھولے ہو! کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے آقا وجہ تخلیق کائنات فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو چیونٹی مارنے اور درخت کاٹنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ تم ایک نمازی پرہیز گار، متقی انسان کو مار کر جنت ڈھونڈ رہے ہو۔ کیا تم نے اسلام کے ایک نقطہ میں بھی کوئی ایسا اشارہ دیکھا ہے کہ جنت الفردوس کسی انسان کی جان میں مقید ہو۔ وہ جان ماردی جائے تو جنت آزاد ہو کر تمہارا نصیب ہو جائے گی افسوس تم نے دین کو مذاق بنالیا ہے۔

قریشی صاحب تو خدا سے پیار کرتے تھے خدا سے جا ملے اور خدا تعالیٰ محسن ہے۔ وہ اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے۔ ان کو آزماتا ہے۔ اور وہ انعامات جو کئی لوگ جنگوں میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر ڈھونڈتے ہیں گھر بیٹھے ہی حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ اس کی ذرہ نوازی ہے۔ مگر تقویٰ شرط ہے۔ محبت الٰہی شرط ہے

اور اتباع رسول شرط ہے۔ ضروری ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے اس مرد حق کو اطاعت شعار بنایا تھا۔ چنانچہ وہ اطاعت میں آگے نکل گئے۔ ایک بار انہوں نے سکھر چھوڑ کر ربوہ کو مسکن بنانا چاہا اور حضرت خلیفۃ المسیح سے اجازت چاہی تو حکم ملا کہ "سکھر میں ہی قیام کریں"۔ یہ ارشاد امام تھا جو روح میں اُتر گیا۔ بس تو پھر سکھر کو نہیں چھوڑا۔ مکان ذاتی کوئی نہیں تھا۔ پھر خلیفۃ المسیح کی دعاؤں کی برکت سے اپنا گھر بھی دیا۔ اور امن و سکون بھی۔ آپ نے سکھر میں کورٹ کے نزدیک پہاڑی پر اپنا مکان بنایا۔ جس کو "دارالامان" کا نام دیا۔ عبدالرحمن نے "دارالامان" کو پہاڑی پر بنا لیا۔ مگر امان ان کو بیت الامان میں ہی ملا۔ وہ گھنٹوں ذاکر میں بیٹھتے اور محو عبادت دکھائی دیتے۔ دریں اثنا وہ خدا سے کیا باتیں کرتے اور کیا ملاقاتیں کرتے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس عشق خدا نے انہیں محبوب منتخب کر لیا۔ اور ریلوے ہائی اسکول کے استاد المکرم کو امیر جماعت احمدیہ شکارپور اور سکھر کا کام سونپ دیا۔ یہ عہدہ "امارت" کوئی آسان کام نہیں ہے جب یہ ذمہ داری کوئی سنبھالتا ہے تو ایسے رہتا ہے جیسے دھلا دھلایا کپڑا۔ معمولی سا داغ دھبہ بھی ان پر نظر نہیں آتا۔ ان کا یہ وجود مثالی ہوتا ہے۔ لوگوں کے سامنے نمونہ ہوتا ہے۔ اتقا اس کا لباس ہوتا ہے اور پرہیزگاری اس کا شعار زندگی ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ کسی کوتاہی کا مرتکب ہو تو جماعت کے کمزور طبیعت لوگوں کے لئے ابتلا کا موجب ہو جاتا ہے اور وہ با اخلاق اور با اخلاص ہوتا ہے تو جماعت کی ترقی کا موجب ہو جاتا ہے اور اگر آپ کو یاد ہو جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ شیخ سعدی نے کسی بچے کو کیچڑ میں چلنے سے منع کیا تھا۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ آپ اپنی فکر کریں۔ میں گرا تو تنہا گروں گا۔ آپ گرے تو سینکڑوں گر جائیں گے۔

اس لئے امارت بہت کٹھن منزل ہے اور خدا کے فضل اور رحم سے قریشی

عبدالرحمان صاحب کو یہ ذمہ داری بآحسن نبھانے کا ساٹھ سال تک موقع میسر رہا ہے
محترم نصراللہ خان ناصر مربی سلسلہ ربوہ لکھتے ہیں ؛

" آپ نہایت مخلص، ہمدرد، عبادت گزار، دُعاگو فنا فی اللہ احمدی تھے۔
۴۸ سال تک دینی خدمات میں مصروف رہے ۔ ۲۷ سال تک جماعت احمدیہ کے سیکرٹری مال کی حیثیت سے اور گیارہ سال امیر کی حیثیت سے آپ نے محنت و جانفشانی سے کام کیا۔ ناساعد حالات میں وقت گزارا مگر مرکز کی آواز پر لبیک کہتے رہے۔ (الفضل ۵ جون ۱۹۸۴ء)

لبیک کہنا تو ان کی سرشت کا ایک حصہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اصل چیز خدا اور اس کے رسول اور اولی الامر منکم کی اطاعت ہے۔ اور تمام قربانیاں اس روح کے ساتھ وابستہ ہیں جس قوم میں اطاعت کی روح نکل جاتی ہے وہ زیادہ ہوتے ہوئے بھی ناکام رہتے ہیں اور ناکام رہنا شیوہ شہید نہیں ہوتا۔ وہ ناساعد حالات میں بھی ٹکرا جاتا ہے۔ کیونکہ ڈرتا وہی ہے جو جان دینے سے دریغ کرتا ہے۔ اور جو جان دینے سے دریغ نہیں کرے گا کیوں اور کس لئے ؟ کیونکہ سب سے قیمتی چیز اس کے پاس صرف جان ہی تھی جو وہ کر اُس نے ایمان بچانے کے لئے داؤ پر لگا دی۔ لہٰذا باقی ڈر کس چیز کا ؟ اس لئے قریشی عبدالرحمان تنہا و یکتا پہاڑی ٹیلے پر بیٹھ بیٹھ کر گھنٹے دعاؤں میں گزار دیتے اور کبھی خائف نہ ہوئے کہ دشمن تاک میں ہے۔ یکم مئی ۱۹۸۴ء بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ پس

اے مردِ خدا پیکرِ اخلاص
تو زندہ رہے گا شہید وقاص

علامت عباد الرحمٰن

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○

(سورہ فرقان آیت ۷۵)

دعائیں خدا تعالیٰ کی لقا کا ایک بہترین اور آسان ترین راستہ ہے۔ مگر صبر شرط ہے اور صبر ہی تو سب سے زیادہ صعوبت گزار مرحلہ ہے۔ جو اس مرحلہ سے گزر گیا۔ اس نے اپنے صبر کا ثواب پالیا۔ قریشی عبدالرحمان کی زندگی کا لمحہ لمحہ دعاؤں کی وادی میں گزرتا تھا۔ وہ دن رات دعائیں کرتے کہ خدا تعالیٰ اپنی رحمتوں سے نوازے۔ ہماری زندگی میں بھی اور ہماری موت کے بعد بھی انہیں نیکی پر قائم رکھنا۔ آپ کی پکار رشبانہ تھی۔ یہ حصہ آیت کا بھی یہی بتاتا ہے کہ مومن کی ایک یہ علامت ہے کہ وہ یہی دُعا کرتا ہے کہ خدایا میری نسل کو متقی و پرہیزگار بنانا اور مجھے توفیق دینا کہ میں اپنی نسل کی صحیح تربیت کر کے صالحات و باقیات چھوڑوں۔ اور اللہ تعالےٰ کے پاک بندے ہمیشہ اپنی آئندہ نسل کی دینی و دنیوی ترقیات کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ نورِ ایمان جو ان کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف ان کی ذات تک محدود نہ رہے۔ بلکہ قیامت تک چلتا چلا جائے۔ اور کوئی زمانہ بھی ایسا نہ آئے جس میں ان کی اولاد یا ان کے مطیع یا شاگرد دنیا داری کی طرف مائل ہو جائیں اور خدا اور اس کے رسول کے احکام پر دُنیا کو مقدم کر دیں۔ قرآن کریم نے حضرت اسماعیلؑ کی ایک بڑی قربانی یہ فرمائی ہے کہ

كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ (سورہ مریم رکوع ۴)

یعنی وہ اپنے بیوی بچوں اور رشتہ داروں کو نماز کی تاکید کیا کرتے تھے۔ تاکہ خدائے واحد کی حکومت ہمیشہ قائم رہے۔ اور ہمیشہ کے لئے نماز اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری رہے اور یہی ہر مومن کا کام اور فرض ہے کہ جہاں وہ اپنی اولاد کی نیک تربیت

سے کبھی غافل نہ ہو وہاں وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتا رہے۔ اور خود ان کا معلم بنے اور انہیں اس قابل بنائے کہ وہ ہمیشہ اسلام کا جھنڈا اونچا رکھیں۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بلند کرتے رہیں۔

(تفسیر کبیر سورۃ الفرقان صفحہ ۱۸۴)

سبحان اللہ قریشی عبد الرحمان صاحب کیسے اعلیٰ درجے کے معلم تھے کہ دین کا عَلَم بھی انہوں نے بلند رکھا اور دنیا کا عَلَم بھی انہوں نے بلند رکھا۔ کیونکہ وہ خود ذاتی طور پر باحوصلہ اور بلند نگاہ مرد تھے اور ہمیشہ تعمیری سرگرمیوں کی روح رواں تھے۔ جلسے اجلاس، دورہ جات اور اجتماعات کا انتظام ان کی زندگی تھا۔ اور وہ اپنی تنظیمی صلاحیتوں کی بنا پر ایک ربع صدی تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ مگر ان صلاحیتوں اور بلند حوصلگی کے ساتھ وہ ایک دعا گو بلند عزم امام بھی تھے۔ جنہوں نے اپنی اولاد کی نیک تربیت سے اور دعا سے انہیں ایک ایسا حوصلہ دیا۔ بلند نگاہی دی اور عزم کی بلندی دی۔ کہ ان کے بچوں نے یعنی ان کے ماموم نے اپنے امام (قریشی عبد الرحمٰن) کی جگہ پُر کر دی۔

پنجاب میں تحریک ختم نبوت کی صداجب ایک حادثہ بن کر عوام پر نازل ہوئی تو حسب عادت انہوں نے مخالفت کے تمام تیر اپنی ترکش سے نکال لئے۔ ہر تیر جب آزما لیا گیا تو حربہ یہی تھا کہ غلامان احمدیت سے سوغات میں سر مانگے جانے لگے۔ اور یہی آخری حربہ تھا۔ لیکن عشق رسول میں فنا ہونے والے آگے بڑھے اور بے دریغ سرفروشی کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حق کی آواز بلند کرنے سے ایک منٹ بھی پیچھے نہ ہٹے۔ اگر آج ان مردان حق کی فہرست دیکھی جائے تو قارئین آپ کو حیرت ہوگی کہ بعض باپ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جن کے دو دو بیٹے شہادت کے انعام سے نوازے گئے۔ اور خدا تعالیٰ نے ان کی ابدی زندگی کی شہادت خود دے دی۔

مثلاً عبدالقادر صاحب کے دو بیٹے۔ عقیل بن عبدالقادر اور عباس بن عبدالقادر دونوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ پھر حکیم رحیم بخش صاحب کے دو بیٹے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب اور ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب نے شہادت کو بے دریغ گلے لگا لیا۔ تو روزِ محشر یہ بیٹے اپنے باپ کی شفاعت کے لئے سرورِ کائنات کے حضور پیش ہو کر درخواست کریں گے اور یہ کہ خوش نصیب شخص ہمارا باپ ہے

اسی طرح

ایک خوش نصیب باپ وہ بھی ہے۔ جس کا شاہد خدا تعالیٰ خود ہے۔ کہ یہ شہید زندہ ہے۔ اسے مردہ لوگوں میں مت خیال کرو۔ ایک ایسے شہید الشان اور ایک ایسے خوش نصیب الشان قریشی عبدالرحمان صاحب تھے۔ جن کے دو بیٹے اسیرانِ راہِ مولیٰ ہیں گویا یہاں بھی ایک امام ایسا ہے کہ اُن کے دو بیٹے ماموم ہیں۔

ماموم بھی ایسے ہیں کہ خدا کی راہ میں گردنیں جھکائے بیٹھے ہیں عرصے گزر گئے ہیں کہ اس خوش نصیب (شہید) باپ کے بیٹے شہادت کے دروازے میں داخل ہونے کے لئے منتظر ہیں وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ اور تادمِ آخر اپنے سچے مقصد پر جمے ہوئے ہیں۔

وہ بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ

"ہماری سرشت میں ناکامی کا خمیر نہیں۔"

یہ کہ ہمیشہ کامرانیاں احمدیت کے قدم لیں اور فتح و ظفر کا استقبال کرتی رہیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

دُعا

تذکرۃ الشہادتین میں حضرت مسیح الموعود و امام مہدی الموعود مرزا غلام احمد قادیانی (آپ پر سلامتی ہو) فرماتے ہیں:۔

"خوب یاد رکھو کہ دُعا وہ ہتھیار ہے۔ جو اس زمانے کی فتح کے لئے مجھے آسمان سے دیا گیا ہے۔ جو دُعا سے منکر ہے وہ خدا سے منکر ہے۔ صرف ایک دعا ہی ذریعہ خداشناسی کا ہے۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

"دوسرا طریق حقیقی پاکیزگی اور خاتمہ بالخیر کے حاصل کرنے کا ہے جو خداتعالیٰ اسکھاتا ہے جو دراصل سب سے مقدم ہے۔ وہ دعا ہے اس لئے جس قدر ہو سکے دعا کرو۔ یہ طریق اعلیٰ درجہ کا مفید اور مجرب ہے۔"

اس مفید اور مجرب نسخہ کو قریشی عبدالرحمان شہید نے زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا۔ بڑے بڑے اعجاز حاصل کئے۔ ایک دن وہ غریب تن تنہا تھا۔ بے آسرا دبے گھر تھا۔ پھر خدا نے گھر دیا۔ اپنا گھر بنایا خود امام بنے اور بچوں کو ماموم بنایا۔ ایک بیٹے مبارک احمد قریشی کو وقف کر دیا۔ اور اُس خوش نصیب بیٹے کو ساری زندگی دین کی راہ میں صرف کرنے کی خدا نے توفیق دی۔ انہوں نے اپنے باپ کی خواہش کا احترام کیا۔ اپنے باپ کی تربیت کی لاج رکھی۔ اور اپنا لمحہ لمحہ پیغام الہٰی کو پہنچانے کے لئے وقف کر دیا۔ یہ دعا ہی تو تھی کہ ایک بیٹا خدا کی راہ میں وقف کر بیٹھا اور دوسرے دو بیٹے تادم تحریر سلاخوں کے پیچھے خدا کے مسیح موعود و مہدی موعود کی صداقت کا زندہ ثبوت بنے بیٹھے ہیں۔ وہ کلمہ توحید کے مسافر ہیں اور کلمہ توحید

کے سفر میں ہی ایک راہ پر گم گشتہ راہی کی طرح گم کر دیئے گئے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ گم نہیں کیا کرتا۔ ایک دن وہ ابھریں گے۔ افق کے اس پار اور دنیا بھر کو عرفان کے خزانے پہنچا دیں گے۔ جو بانی سلسلہ احمدیہ امانتاً سونپ کر گئے ہیں۔ انشاءاللہ وہ ایک عظیم ماں کے دو بچے ہیں۔ یہی وہ دو بھائی ہیں جو سر لئے بیٹھے ہیں۔ اور جان کی سوغات پیش کرنے والا شہید اچانک شہید نہیں ہو جاتا۔ بلکہ انتظار میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ اور ہر بیتا ہوا دن اس کے جذبۂ قربانی کو گرما کر جاتا ہے۔ آج بھی دو بھائی سکھر کی سنگلاخ چٹانوں میں چشم براہ ہیں۔ اور عہد کرتے ہیں کہ اس نقد بہشت کو جان کا چندہ دے کر بھی حاصل کریں گے

لیکن

کلمہ توحید کو نہ نوچنے دیں گے نہ اکھیڑ کر پھینکنے دیں گے۔ اور زندگی بھر دینِ حق کی سربلندی کے لئے جنگ کرتے رہیں گے۔

بحیثیت داعی الی اللہ

کلمہ توحید، اذان اور قرآن سے ان کو باز رکھنے کی کوششیں کی گئیں مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ کلمہ تو دل پڑھتا ہے۔ اور اذان ایک صدا ہے۔ جو صلوٰۃ کے لئے تیاری پکڑنے کو کہتی ہے۔ قریشی صاحب کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ تو ہمیشہ صلوٰۃ کی کیفیت میں رہتے تھے۔ باقی رہا قرآن تو اے اہلِ سکھر! قرآن تو قریشی شہید کی رگوں میں خون اور پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ نماز عصر ادا کر کے مغرب تک دعا اور قرآن کی وادی میں ہی تشریف فرما تھے۔ اس لئے یہ ناکام حربے آزمانا علماء کی ناکامی تھی۔ جو انہیں اندھا کر گئی۔ اور فضلِ ربانی نے اُن کو کھینچ کر

جنت کی وادی میں دھکیل دیا اور یہی قریشی عبدالرحمان شہید کی کامیابی اور کامرانی تھی۔ کر وہ ابدی حیات پا گئے۔ اور یہی ان کا انعام تھا۔ اور یہی ان کا مرتبہ تھا۔ کیونکہ وہ حقیقی معنوں میں خدا تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ وہ اپنے وسیع تجربے سے کام لیتے تھے۔ اور ایسے عالی مدلل نکتے سمجھایا کرتے تھے کہ مدمقابل ہمیشہ مبہوت ہو کر اپنی کوتاہ نظری و کوتاہ علمی کا شکوہ کرتا۔ ان کے پاس ایک سلیقہ مند زبان تھی۔ ایک سلیقہ مند دل تھا۔ اور سلیقہ مند انداز بیان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ عاجزی منکسر المزاجی مثالی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ انہیں ہمیشہ دعوت الی اللہ کے میدان میں بفضل خدا کامیابی حاصل ہوئی۔

مکرم نصر اللہ خان ناصر صاحب مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۶ء میں مَیں آپ سے متعارف ہوا۔ جب میں میٹرک کے بعد اپنے بڑے بھائی چوہدری غلام رسول صاحب سب انسپکٹر ریلوے پولیس سکھر کے پاس کچھ عرصہ رہا۔ میرے بڑے بھائی کی تربیت بھی دراصل آپ ہی نے کی اور دینی امور کی طرف نہ صرف انہیں راغب کیا بلکہ ایک مخلص احمدی بنا دیا۔ جب اس عاجز کا تبادلہ نوابشاہ میں ہوا تو دوروں اور دینی تقریبات اور اجتماعات میں آپ کے ساتھ اکثر ملنے جلنے اور قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ آپ کو بڑھاپے میں بھی خدمات دینیہ میں مشغول دیکھ کر آپ پر رشک آتا۔ آپ امیر کے علاوہ ناظم اعلیٰ انصار اللہ علاقہ صوبہ سندھ بھی تھے۔ اور مجالس انصار اللہ کو بطریق احسن منظم کرنا آپ کی ایک عظیم خدمت ہے۔"

(الفضل ۵ جون ۱۹۸۴ء)

ایک اور مقام پر سید محمد سلیم شاہجہانپوری فرماتے ہیں کہ آپ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ (آپ پر سلامتی ہو) اور آپ کے عظیم فرزند حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد (اللہ آپ سے راضی ہو) کے کلام سے متاثر تھے۔ خدمت دین کا شوق اور

جذبہ اتم رنگ میں پایا جاتا تھا۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اظہار آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں اور یہ شعر ہمیشہ آپکے ورد زبان رہا ہے۔

جانم فدا شود برہ دین مصطفیٰ
ایں است کام دل اگر میسّرم

اور اللہ تعالیٰ نے جو سینوں کی پوشیدہ خواہشات کو بھی جانتا ہے آپ کو رہِ مصطفیٰ میں جان کی قربانی پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ان کی نعت کے چند شعر یہ ہیں ؎

دِل میں حبیبِ پاک کی الفت لئے ہوئے
ہوں مطمئن امید شفاعت لئے ہوئے
لاریب اس پہ آتشِ دوزخ حرام ہے
عاصی ہے۔ سر پہ دامنِ رحمت لئے ہوئے
دل میں یہی ہے تیرے صحیفے کو چوم لوں
ہر سو پھروں حضور کی برکت لئے ہوئے
پہنچا نہ کوئی اور نہ پہنچے گا ابد تک
ہے آمنہ کا لال جو عظمت لئے ہوئے

(الفضل ۱۴ جولائی ۱۹۸۴ء)

خلافت سے وابستگی

جو سچ پوچھئے تو حقیقت یہی ہے　　　خلافت میں اسلام کی زندگی ہے

یہی ایک وہ نقطہ مرکزی ہے کہ جس سے ہمیں بہت ترقی ملی ہے
کیسی خوبصورت اعلیٰ درجے کی حقیقت کو منضبط کیا ہے۔

بیشک قریشی عبدالرحمٰن صاحب ذاتی تعلق، اخلاص و اطاعت میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ خلیفہ وقت کی آواز پر لبیک کہنا ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ کبھی کسی موقعہ پر بھی یہ گوارہ نہ تھا کہ مرکز کی طرف سے جاری شدہ تحریک میں التواء ہو جائے بلکہ ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ سابقون میں جگہ نصیب ہو۔ قدرت خدا کی دیکھیں کہ چھوٹے چھوٹے احکامات کی اطاعت بڑے عظیم تر مقاصد میں کامیابی عطا کر دیا کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے وہ انعام پالیا جو شہادت کے ذریعے ان کو خدا کی قربت عطا کر گیا۔ لاریب شہادت کا انعام پانے والا خدا کو پا گیا۔ کیونکہ شہادت کے لئے کسی سے انعام کیا پانا شہادت کے انعام میں تو خدا ہی پالیا۔ شہید کی تعریف وتحسین ایک ایسی چیز ہے کہ ہزار جہتوں سے بھی اس کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ صرف یہی جملہ کافی ہے کہ شہید اپنی قوت ایمانی اور قوت اخلاقی اور ثابت قدمی وشجاعت سے ایسا مزین ہوتا ہے کہ عید کے دن کی طرح سجا بنا ہوا قربانی کے انتظار میں رہتا ہے۔ اور یہ تمام انعامات اس کو اطاعت میں ہی نصیب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ وقت یا امام جماعت کی آواز کو عبدالرحمٰن صاحب کبھی بھی زمین پر پڑنے نہیں دیتے تھے بلکہ لپک کر اطاعت کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ یہی نصیحت ہمیشہ اپنے بچوں کو کرتے کہ خلافت ایک ایسا انعام ہے کہ جسے نعمت سمجھ کر سینے سے لگائے رکھنا چاہیئے۔ سو خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ عبدالرحمٰن شہید کے جذبۂ اطاعت "اولی الامر منکم" کو زندہ رکھتے ہوئے ان کے دو جوان سال بچے رفیع احمد اور ناصر احمد صاحب کلمہ توحید کی خاطر تا حال لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سالہا سال گذارنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

ملنساری

ملنساری بھی ان کا ایک نمایاں خلق تھا اور تمام عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے علاوہ بھی ان کا حلقہ میل و ملاقات بھی بہت وسیع تھا۔ آپ دُعائیں بھی کرتے تھے اور اپنے پیاروں کو دعاؤں میں بھی یاد رکھتے ان کے دُکھ میں دکھ محسوس کرتے تھے اور ان کے سکھ کو سکون سے اپناتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ عمدہ اخلاق اور ملنساری و ہمدردی نے ہمیشہ جماعت میں بھی ان کو امارت کا مقام دلوایا۔ مگر جماعت کے امیر بن کر بھی ہمیشہ خادم کی حیثیت سے کام کرتے رہتے تھے۔

پس دارالذکر کی تعمیر میں صبح و شام بسر کرنے والے بزرگ قریشی عبدالرحمٰن سرزمین سکھر میں پہلی قربانی پیش کرتے ہیں۔ آپ کا ایک محبوب مشغلہ فارسی نظم کو خوش الحانی سے پیش کرنا تھا۔ آپ کو تقریر کرنے کا ایسا ملکہ تھا جو مثالی مقام رکھتا تھا اس پر طرّہ یہ کہ جب آپ حضرت مسیح موعود کا نعتیہ فارسی منظوم کلام پڑھتے تو عشق و محبت کا ایک ایسا سماں بندھ جاتا کہ ہر آنکھ آنسو بہا دیتی۔ اور یہی معراج ہوتا ہے خوش الحانی کا کہ انسان نعت کے سحر میں آ جائے۔ سو یہ خاص ملکہ قریشی عبدالرحمٰن کو حاصل تھا۔

۲۔ دوسرا آپ کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ عبادت گاہ میں بیٹھ کر گھنٹوں سر جھکائے دُعایں رہنا۔ وہ ہمیشہ آنکھ کے پانی سے اپنے مسائل کا حل نکال لیتے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے وہ ایسے مشکل سے مشکل کام بھی کر جاتے کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ مثلاً مرکز اور مشن ہاؤس کا قیام ان کی مساعی جمیلہ کا ایک پہلو ہے جو انہیں تا قیامت زندہ رکھے گا۔ انشاءاللہ۔

اور دوسرے زندہ رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسی اولاد عطا کی جو آج بھی کال کوٹھریوں میں اطاعتِ امام اور صدق و وفا کے پیکر کی زندہ مثال پیش کر

رہے ہیں۔

اپنے خیالات پر مہر لگاتے ہوئے میں پھر دہراتی ہوں کہ استاد کی جیب بیشک خالی ہے۔اس کا دل اور دماغ عطا کرنے والا ہوتا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ بانٹتا اور عطا کرتا ہے۔ اور اپنی اولاد میں سے ایک بچہ تو ضرور نگینہ نکل آتا ہے۔ اور یہی اس کے صیقل کا کمال ہوتا ہے جیساکہ قریشی عبدالرحمن صاحب کے دو بیٹے ہمارے سامنے اسی صیقل کا نتیجہ ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں زندگی و سلامتی عطا فرمائے آمین

یہ خداوالے واقعی خدا ہی سے جا ملتے ہیں۔ اور خدا کی ملاقات کے لئے انہیں انہی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو دشوار بھی ہوتے ہیں اور تنگ و تاریک بھی۔ ان راستوں میں وہ اپنی گردنیں بھی پیش کر دیتے ہیں۔ مگر یہ "خداوالے" بھٹکتے نہیں۔ بلکہ راستوں کو پار بھی کرتے ہیں اور ہموار بھی۔ غیروں کے لئے اپنوں کے لئے، اولاد کے لئے تیرے لئے اور میرے لئے راستے آسان کر دیتے ہیں۔

خدا کرے کہ ایسے جانثار اور وفا شعار احمدیت کے فدائی اور خلافتِ احمدیت کے شیدائی اور حقیقی جانثار بکثرت پیدا ہوں جو اپنے خون سے شجر احمدیت کی آبیاری کرنے والے ہوں۔ ان شہیدوں نے اپنے خون دے کر سندھ کی زمین کو سیراب کیا ہے۔ اس زمین میں بیج بویا گیا ہے فصل تیار ہے۔ اس کے میوے اور پھل ہم ضرور چکھیں گے۔ انشاء اللہ اس کے تاثرات ضرور ظاہر ہوں گے اور شہیدوں کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ انشاء اللہ

ایک نظر میں

نام والد	غلام محی الدین صاحب
تاریخ پیدائش	۱۹۱۱ء
مقام پیدائش	دولت پور ضلع سیالکوٹ
ابتدائی تعلیم	پسرور ضلع سیالکوٹ بعد میں انٹرمیڈیٹ پنجاب یونیورسٹی
سکھر میں رہائش	۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی۔
عہدہ بوقت شہادت	امیر جماعت ہائے ضلع سکھر، شکارپور
دینی خدمات	۴۸ سال تک ادا کیں۔ باحسن رنگ میں کہ آخری طوعی قربانی بھی پیش کر دی۔
شمائل	ملنسار، حلیم الطبع اور بردبار انسان تھے۔ فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی نیکی پر نظر رکھتے۔ اطاعت امام میں یکتا مقام رکھتے تھے۔
تاریخ شہادت	یکم مئی ۱۹۸۴ء
آلۂ قتل	چھریاں
جنازہ ربوہ میں	صوفی غلام محمد صاحب ناظر اعلیٰ ثانی نے پڑھایا
دعائے تدفین	مرزا خورشید احمد صاحب ایڈیشنل ناظر اعلیٰ
اولاد	قریشی مبارک احمد واقفِ زندگی ہیں۔ وکالتِ تبشیر میں کام کرتے ہیں۔ اور قریشی ناصر احمد اور قریشی رفیع احمد اسیرانِ راہ مولیٰ سکھر ہیں۔

محترم ڈاکٹر محمدؐ عبد القدیر جدران

۱۹۲۴ء سے ۱۹۸۹ء تک

آج جب لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو سوچا کہ پہلے کس کے حالات زندگی درج کروں۔ عموماً میں پرچیوں پر نام لکھ کر پرچی اٹھالیتی ہوں۔ اور اسی پرچی کے مطابق شروع کر دیتی ہوں۔ کیونکہ نہ تو تمام لواحقین نے مجھے حالات بھیجے ہیں اور نہ ہی بعض نے مکمل تفصیل روانہ کی ہیں۔ میرے پاس چند سال کی ان تھک کوشش کے بعد چند بیویوں نے، بیٹوں نے اور بہنوں نے حالات ارسال کئے ہیں جو موجود ہیں۔ اس لئے ترتیب ذ تاریخ شہادت کا لحاظ رکھ کر لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرعہ پر ہی کام چلا لیتی ہوں جب میں نے قرعہ نکالا تو تقریباً آج چوتھا ڈاکٹر شہید سامنے آیا۔ اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ آخر شہید کرنے کے لئے زیادہ تر ڈاکٹروں ہی کو کیوں منتخب کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ یہ پیشہ چونکہ سوشل ہوتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر اور استاد ہی کو ٹارگٹ (TARGET) بنایا گیا ہو۔ مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ یہ دونوں وجود نافع الناس ہوتے ہیں اور لفظ الناس میں تمام لوگ غریب، دکھی اور مفلوک الحال شامل ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ اپنے پیاروں، اپنے عزیزوں اور اپنے ہی لوگوں کا قتل تو نہیں ہوکہ دکھی انسان سے اس کا غم خوار چھین لیا

جائے۔ مریض سے اس کا مسیحا چھین لیا جائے۔ یوں تو میرے لوگوں کو بھی ان حضرات کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی ضرورت تھی۔ مگر جو زندگی کسی ظالم کی "تیز دھار" نے انہیں عطا کی ہے۔ وہ ابدی اور بہتر زندگی ہے جس کی خواہش کے لئے لوگ جنگوں میں شامل ہوئے اور غازی بن کر لوٹ آئے۔ شہادت اُن کا مقدر نہ بنی جس طرح حضرت خالدؓ بن ولید جیسے صحابی نے ایک سو ستائیس زخم کھا کر بھی چارپائی پر ہی جان دے دی اور اس شوق اور جذبۂ ایمانی کو پروان نہ چڑھا سکے۔ اگرچہ یہ وجہ طمانیت ہے کہ آج کے ناعاقبت اندیش ملاؤں نے شہادت عام کر دی ہے۔ اور میرے اُن بھائیوں کو منتخب کیا ہے جو اِن کے اپنوں کے لئے نفع مند تھے۔ ان کی دم توڑتی ہوئی زندگی کو واپس لا کر دیتے تھے۔ ان کی آنکھوں کو روشنی دیتے تھے۔ اور ان کی جہالت کو بصیرت عطا کرتے تھے۔ ان کے بچوں کو سچائی کا راستہ دکھاتے تھے۔ بھلائی اور برائی میں تمیز سکھاتے تھے اور زندگی کو سنوار کر گزارنے کا ڈھنگ بھی بتاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دِل اندھے ہوتے ہیں جو اِن کے سینے میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ [۱]

یعنی اصل میں نابینائی انہیں آنکھوں کی نہیں دل کی نابینائی نصیب و مقدر ہوتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کان، آنکھ اور دل تمام کو معطل کیا ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہوئی ہے۔ وہ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اور کانوں سے سنتے ہوئے گمراہی و ذلت کی طرف جھکتے رہتے ہیں۔ اور ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کی وجہ سے زنگ لگ ہی چکا ہے۔ اس لئے وہ اپنے

[۱] سورۃ الحج آیت ۴۶

نقصان کو بھی نہیں سمجھ پاتے اور بالآخر اپنے ہی لوگوں کو موت اور جہالت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ جس طرح کہ ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی شہادت سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ ظالموں نے وہی ہاتھ ٹھنڈا کر دیا۔ جو کبھی ان کی اپنوں کی نبض پر ہوتا تھا۔ دل کی دھڑکن سنتا تھا۔ اور نسخہ تجویز کرتا تھا وہ شفیق و مہربان معالج رات دن کا فرق مٹا کر ان کا سکھ خریدتے تھے اور ان کے سہاگ کو زندہ کرتے تھے اور وہ تھے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب جو حضرت حکیم رحیم بخش صاحب کے بیٹے تھے۔ حکیم رحیم بخش صاحب جو حضرت مسیح موعود بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ایک رفیق تھے۔ دعویٰ ماموریت سے پہلے بھی آپ کو حضور کی صحبت و محبت حاصل تھی۔ جب حضور نے دعویٰ فرمایا تو حکیم رحیم بخش صاحب نے احمدیت میں شمولیت اختیار کر لی اور اپنے دوست کی حقیقی محبت و صداقت کو دل و جان سے قبول کر کے مستقل رہائش قادیان میں ہی کر لی۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب پیدائشی احمدی تھے اور تلونڈی جھنگلاں ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے تھے لیکن ابتدائی تعلیم میٹرک تک تعلیم الاسلام ہائی اسکول قادیان میں حاصل کی۔ قرآن مجید کی دولت حکیم صاحب نے اپنے بچوں کو خود پڑھا کر عطا کی۔ جبکہ آپ کے استاد محترم صوفی غلام محمدؐ تھے۔ یہ ایک سنہری دور تھا۔ جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی جاری رہا۔ اور ایک رفیق کی اولاد کو خدا تعالیٰ نے تربیت کے اعلیٰ مدارج میں داخل کیا۔ وہ باپ جس نے قادیان میں بچوں کے لئے پرائمری اسکول کھولا تھا۔ بیشک تعلیم کا سچا خواہاں تھا مشتاقِ علم تھا۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ علم کی دولت سے میرا گھرانہ مالا مال ہو سو خدا تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے حکیم رحیم بخش صاحب کی دعاؤں کو قبول کیا۔ اور دینی و دنیوی تعلیم سے ان کی اولاد کو نوازا۔ بلکہ خود خدا تعالیٰ نے اس باپ کو دو شہید بیٹوں کا باپ بنا دیا۔ جنت میں وہ خوش ہوں گے کہ ان کے بیٹے ڈاکٹر عبدالقدیر اور ڈاکٹر عبدالقدوس

نے احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کر کے انہیں سر بلند کر دیا ہے۔ بیشک ہمارا عہد نامہ یہی ہوتا ہے جو ہم ہر اجتماع و جلسہ کی ابتدا میں تین بار اپنے خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کلمہ شہادت پڑھ کر عہد کرتے ہیں۔

"میں اقرار کرتی/کرتا ہوں کہ اپنے مذہب و قوم کی خاطر اپنی جان، مال، وقت اور اولاد کو قربان کرنے کیلئے ہر دم تیار رہوں گی/گا نیز سچائی پر ہمیشہ قائم رہوں گی/گا اور خلافت احمدیہ کو قائم رکھنے کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار رہوں گا/رہوں گی۔"

اور جب اقرار کو نبھانے کا وقت آتا ہے تو سچے لوگ آگے بڑھتے ہیں وہ مال و وقت آگے بڑھا کر جانیں چندہ میں پیش کر دیتے ہیں۔ وہ ہر تحریک پر لبیک کہتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور جب استقامت اور دلیری کا وقت آتا ہے تو وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ بلکہ آگے بڑھ کر ہر لمحہ خدا تعالیٰ کی رضا مندی خریدنے کیلئے تیار رہتے ہیں خواہ رضا مندی سر کی قیمت ادا کر کے ہی حاصل ہو۔ وہ سر پیش کرتے ہیں اور اپنے خدا کی لقا پا لیتے ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ

قرآن مجید متقیوں کی بہت سی علامات کا ذکر کرتا ہے۔ فرماتا ہے کہ:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۴)

یعنی متقی لوگ غائبانہ ہستی باری تعالیٰ پر بھی ایمان لاتے ہیں یعنی اس چیز کا اقرار کرتے ہیں۔ جس کا حواس ظاہری سے پتہ نہ لگ سکے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ صرف ایسے کام نہیں کرتے جن کا اجر نقد بہ نقد ملے بلکہ وہ اعمال کے آئندہ نکلنے والے نتائج پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے ایمان کا زبانی اقرار کرتے ہیں اور پھر آگے بڑھ

کر اپنے اقرار کے مطابق عمل پر سارا زور لگا دیتے ہیں۔ پھر متقی اس کے بعد تقویٰ کے اور بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ جب وہ اپنے خدا تعالیٰ کی عظمت بیان کرنے کے لئے عمدگی سے نماز ادا کرتے ہیں تو وہ اپنے اس ایمان بالغیب کا عملی اقرار کرنے کے لئے روزانہ پانچ وقت خدا تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوتے ہیں پھر اس محبت واخلاص کے زینہ پر چڑھنے کے لئے خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق وفضل میں سے خرچ کرتے ہیں دینی وقومی ضروریات کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور یہی شان ہے ایک متقی کی کہ سب کچھ کا مالک ہوتے ہوئے بھی، کچھ اس کا نہ ہو۔ جان، مال، عقل، علم، وقت، اولاد اور خواہشات وغیرہ وغیرہ سب خدا تعالیٰ کی ایک آواز پر پیش کر دے۔ اس مختصر تمہید سے میری مراد یہ ہے کہ متقی انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قربانی کے کچھ زینے بتدریج چڑھے حضرت شہید جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اپنی ذات میں اتقاء کے تمام اعلیٰ مدارج پر گامزن تھے حقیقت میں شہید انعام یافتہ وجود ہوتا ہے۔ جو کسی نہ کسی رنگ میں ان تمام خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ چلتا پھرتا ایک فرشتہ ہوتا ہے۔ جو ہمارے درمیان رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کو اس کی کوئی ادا ایسی بھا جاتی ہے کہ اس کے لئے یہ فتویٰ جاری فرما دیتا ہے اور خود اس کی ابدی حیات کی گواہی دے دیتا ہے۔

جذبہ درس وتدریس

اگر ہم بغور دیکھیں کہ شہید ڈاکٹر عبد القدیر صاحب کے والد صاحب نے جب قادیان کی سرزمینِ مقدس پر بیت الصلوٰۃ اور پرائمری اسکول کھولا ہوگا۔ تو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ماتحت انہوں نے اپنی آئندہ نسل کی روحانی اور مالی آسودگی کے لئے ضرور دعا کی ہوگی۔ قبولیت کے لئے ایک گھڑی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ نواز لیتا ہے۔ اس مبارک گھڑی کی دعا خدا نے سن لی۔ اور محترم حکیم رحیم بخش کی نسل کو ایک مقام

عطا کیا یہ کہ آپ کی نسل ہر قربانی کے لئے اپنے مال و جان کو خرچ کرتی رہی اور بحیثیت ڈاکٹر ہر خاص و عام کو مُفت علاج مہیا کرنے گاؤں گاؤں میں غریبوں کا دُکھ بانٹنے ناصرہ آباد اسٹیٹ اور ضلع تھرپارکر ایسے غریب علاقہ میں ۱۹۵۳ء تک مستقل معالج رہ کر کوئی موقع نہ آنے دیا کہ اپنے آرام کو ترجیح دیں بلکہ صبح و شام گرمی و سردی اور خزاں و بہار میں مریضوں کی تلاش میں نکلتے تھے۔ سُنتے ہیں کہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے مگر یہ کنواں پیاسوں کے پاس جاتا رہا تاکہ اپنے مسیحائی فیض سے لوگوں کو زندگی و شفا عطا کرے اور تا ان کی تشنگی دور ہو۔

یاد رہے کہ "نفق" اُس سرنگ کو کہتے ہیں جس کے اندر آنے اور باہر جانے کے دونوں راستے کھلے ہوں اس لئے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ علم، عقل، مال، اولاد وغیرہ جو کچھ بھی ان کو خدا سے ملا ہوا ہے اس میں سے ایک حصہ مخلوقِ خدا کے لئے عام کر رہے ہیں۔ اور ان کو روکتے نہیں۔[1]

پس ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کو اپنی محبت تقسیم کی لوگوں کو اپنا عقل و علم بانٹا اور جماعت کی ہر تحریک پر دل کھول کر حصہ لیا۔ آپ موصی تھے اور وصیت، تحریک جدید وقف جدید، خدام الاحمدیہ، انصار اللہ، نصرت جہاں اسکیم۔ صد سالہ جوبلی، بیرون مرکز اور بیوت الصلوٰۃ بیرون ممالک کے چندہ میں سابقون میں رہے۔ اور نہ صرف خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے بلکہ اپنے عزیز و اقارب کو تلقین کرتے کہ وہ ان تحریکات میں کبھی پیچھے نہ رہیں۔

اگرچہ پاکستان بننے کے بعد محترم عبدالقدیر صاحب اپنی فیملی کو لے کر نواب شاہ میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ مگر بعد میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے

[1] مخزن معارف

مشورہ پر ربوہ فضل عمر ہسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں دو سال تک طب کی تعلیم حاصل کی اور بعد میں نظر پارکر سے ہوتے ہوئے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک رہائش کی مستقل جگہ نواب شاہ کو ہی قرار دیا۔ اور اس طرح چھتیس سال تک خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں ۔عقل، علم، حکمت، مال اور آرام و جان گرد و نواح کے لوگوں میں تقسیم کرتے رہے کبھی مخفی طور پر اور کبھی ظاہراً ہر قربانی میں حصہ لیا۔ اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کے مصداق ٹھہرے۔ نہ صرف غریبوں کا مفت علاج کرتے بلکہ ساتھ ساتھ مالی مدد کر کے حق الخدمت ادا کرنے میں بھی کوشاں رہتے۔

لائبریری علم رکھنے والا۔ علم سیکھنے والا ہمیشہ خزانۂ علم سے پیار کرتا ہے۔ اچھے عمدہ کپڑے زیب تن کرنے کی بجائے وہ کتابوں کی تزئین کرتا ہے۔ وہ کتابیں خریدتا ہے۔ اور ہر نئی کتاب کی تلاش اس کا شغل ہوتا ہے۔ مگر کچھ ایسے عظیم لوگ بھی ہوتے ہیں جو کتابوں کا ایک عظیم خزانہ اپنے گھر میں جمع کر لیتے ہیں۔ یعنی لائبریری کھول دیتے ہیں کہ ہر خاص و عام شوقین مزاج کتاب کے پاس سے پیاسا نہ جائے وہ علم کا ایک کنواں کھود ڈالتے ہیں۔ جس میں لوگ ڈول ڈول پانی بھرتے ہیں۔ اور اپنے علم کی آبیاری کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک جاری و ساری نہر چھوڑ جاتے ہیں اور ایسے ہی حضرت ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب نے ہمیشہ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کے روحانی خزائن ۔ملفوظات اور کتب دین سے اپنی لائبریری کو مزین کیا ہوا ہے۔ اور اس لائبریری کو تفسیر کبیر، تفسیر صغیر اور احادیث نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سجایا ہوا ہے۔ اور یہ کارنامہ ایک "نافع الناس وجود پر مہر لگاتا ہے۔ بیشک تعلیم و تعلم کی روشنی کے پھیلانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ہر شعبہ کو اور ہر سمت کو آسان کر دیا۔ اور جانے والے کا یہ ایک احسان ہوتا ہے کہ جو

اس کے لئے یادوں اور محبتوں کے تاقیامت دیئے جلائے رکھتا ہے۔ اور یہ چیز اُس کو بقا دے جاتی ہے۔ قرآنِ مجید کی محبت عبد القدیر صاحب کے وجود کا ایک حصّہ تھی۔ وہ فرصت کے وقت صبح و شام قرآنِ مجید کے معارف تفسیرِ کبیر میں سے تلاش کرتے اور رمضان کے مہینے میں تو وہ دو تین بار قرآنِ مجید کی برکات سے مستفید ہوتے تھے۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ زبانی یاد ہوتی تھیں۔ اور احادیث کی روشنی میں بچوں کی تربیت کرتے تھے۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو احادیث کی فرمودہ شاہراہوں پر چلنے کے لئے تاکید کرتے تھے۔ اور ایک امام کے لئے یہ قطعی ضروری ہے کہ اپنے چھوڑے ہوئے نقوش کو اپنے مقتدی کے دل و دماغ پر ثبت کر دیوے۔ اگر وہ اس عمل میں کامیاب ہو جائے تو اس کی امامت ہمیشہ زندہ رہے گی۔ انشاءاللہ۔

کیونکہ کسی **خاندان** کی تربیت کا یہ امتیازی نشان ہوتا ہے کہ اس کے بچے باعمل و باعلم ہوں تربیت کے ہر پہلو سے نکھار ہو۔ سب سے پہلے تو عبد القدیر صاحب کے بھائیوں کی تربیت پر غور کیا جائے تو ہر بھائی اپنی اپنی جگہ ایک مثالی مقام رکھتا تھا۔ عبد اللہ خان جدران۔ عبد الرحمان مربی۔ عبد الرحیم صاحب اور ڈاکٹر عبد القدوس صاحب شہید آپ کے چار بھائی تھے۔ جو تمام موصی تھے۔ اور خدا تعالیٰ کے فضل سے با اخلاق باصفات تھے اور خدا کے فضل سے دو بھائیوں کو خدا تعالیٰ نے چُن لیا۔ اور نواب شاہ (سندھ) کی مٹی کو یہ اعزاز نصیب ہوا کہ ایک باپ کے دو[۲] بیٹوں نے دینی مقصد، جماعتی تقدس اور احمدیت کے لئے اپنا خون دیا۔

اے ارض نوابشاہ! گواہ رہنا کہ تیری آبیاری کرنے والے سچے متقی تھے وہ اچانک شہید نہیں ہوئے بلکہ للکارے گئے تھے۔ دھمکیوں کے خطوط بھی پائے تھے مگر احمدیت کو پھیلانے کے لئے اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ گواہ رہنا یہ کسی بزدل کا خون نہیں تھا۔ بلکہ جنگِ عظیم کے ایک فوجی کا خون تھا۔ جو کبھی

ملک و ملت کے لئے اُس نے پیش کیا تھا۔ مگر آج اس کے اپنے ملک کے لوگوں نے ہی اُس کی زندگی چھین لی۔ اور اُس کا خون بہا دیا۔ مگر خوشکن امر یہ ہے کہ یہ خون آج مذہب اسلام کے لئے بہا ہے۔ احمدیت کے لئے بہا ہے۔ جو پھولے گا پھلے گا اور ایک ایک قطرہ اس خون کا رنگ لائے گا۔ انشاءاللہ۔

ہاں ایک دفعہ ایک عظیم باپ محترم جناب **عبدالقادر** صاحب نے بھی یہ سعادت پائی تھی کہ سرزمین سندھ نے ان کے دو بیٹوں کا خون اپنی دھرتی میں جذب کیا تھا۔ ایک محترم پروفیسر عباس بن عبدالقادر شہید جو خیرپور میں شہید ہوئے اور دوسرے محترم ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر شہید جنہوں نے حیدرآباد میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔

اور پھر دوسرے

ایک اور عظیم باپ حکیم رحیم بخش صاحب کو یہ خوش نصیبی حاصل ہوئی کہ ان کی تربیت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ نے ان کے دو بیٹوں کو نواز لیا۔ اور شہادت کا انعام عطا کیا۔ اور ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ دونوں بیٹے ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب اور ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب دونوں کو شہادت کی گھڑی سندھ کی خشک خاک میں نصیب ہوئی۔ میں سلام پیش کرتی ہوں محترم جناب سیّد عبدالقادر صاحب اور جناب حکیم رحیم بخش صاحب کو جن کی تربیت تعلیم وصحبت نے بچوں کو جان تک پیش کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ پھر دوسری بار سلام پیش کرتی ہوں محترم جناب عبدالقدیر صاحب شہید کو جنہوں نے اپنے دو بیٹے دین کی راہوں میں وقف کر دیئے۔ عائلی زندگی میں آپ کا سب سے عظیم اور قابلِ تعریف عمل تو یہ تھا کہ آپ نے اپنی بڑی بھابھی جان جو محترم بھائی عبدالرحمان صاحب کی بیوہ تھیں (ان کی وفات کے بعد) ان سے شادی کر لی۔ عموماً لوگ اسوۂ حسنہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر جب موقع آتا

ہے تو شادی کے معاملہ میں اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ ہمیشہ چھوٹی عمر کی کنواری اور نئی نویلی بیوی کو ترجیح دیتے ہیں مگر عبدالقدیر صاحب نے اپنی بیوہ بھابھی محترمہ غلام فاطمہ بی بی صاحبہ بنت ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کو اپنے رشتہ عقد میں باندھا اور ساری عمر بہت خوشحالی سے گزاری۔ محترمہ بیگم صاحبہ چونکہ ایک متقی پرہیزگار باپ کی بیٹی تھیں۔ اس لئے ہمیشہ انہوں نے مثالی دینی ماحول بچوں کے سامنے پیش کیا۔ دونوں چندہ دینے میں بہت فعال تھے۔ اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی سعی کرتے تھے۔ اگرچہ ہمیشہ نماز کی پابندی اور بروقت ادائیگی آپ کی شان تھی۔ تاہم بیگم صاحبہ محترمہ غلام فاطمہ صاحبہ کو یہ سعادت حاصل تھی کہ نماز کے معاملے میں باجماعت نماز پر زور دیتی تھیں اور اکثر مواقع پیدا کرتیں کہ باجماعت نماز ادا کی جائے۔ اور اگر کسی ناگزیر وجہ سے دارالذکر نہ جا سکتے تو گھر پر باجماعت کا اہتمام کرتی تھیں۔ بیشک عورت گھر کو جنت بنانے میں وفا کی دیوی ہے۔

خدمت خلق یہی وجہ ہے کہ دونوں ماں باپ کی تربیت نے دو بیٹوں کو خدمت دین کا نمایاں موقع دیا۔ اگرچہ عبدالقدیر صاحب کا تمام خاندان صاحب علم تھا۔ مثلاً محترم عبدالسمیع صاحب، محترم عبدالحلیم صاحب، محترم عبدالرفیق صاحب اور ڈاکٹر عبدالمومن صاحب

سب اپنی اپنی تعلیم کے اعلیٰ معیار تک پہنچے ہوئے ہیں اور دینی لحاظ سے بھی آسودگی حاصل ہے۔ مگر دو بیٹے عبدالرفیق صاحب ۱۲ سال تک وقف عارضی کر کے افریقہ میں تعلیم دیتے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ ایم ایس سی تھے۔ آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔ پھر دوسرا بیٹا ڈاکٹر عبدالمومن صاحب فضل عمر ہسپتال میں دکھی مخلوق کی خدمت میں شب و روز زندگی بسر کرتے ہیں۔ دنیا میں آسودگی و خوشحالی تو ہر شخص کی تمنا ہوتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کے فضلوں سے وہ خوشحالی کے ساتھ ساتھ اپنے پیارے آقا! امام وقت کی تحریکات پر لبیک کہتے ہوئے رضائے الٰہی خرید لے تو اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی

ہو سکتی ہے۔ محترم کی بیٹی امت اللہ خانم صاحبہ قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی ہر لحاظ سے دینی ماحول میں گزاری۔ اور اپنے والدِ محترم شہید عبد القدیر صاحب کے شب و روز کو یکجا کر کے مجھے ارسال کیا۔ وگرنہ میرے لئے کافی مشکل امر ہے کہ شہدائے احمدیت کی سوانح حیات کو ضبطِ تحریر میں لا سکوں۔ یہ محض تعاون کی بدولت ہو سکا کہ میں نے اپنے لوگوں کو آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ آئندہ نسلوں کو ان کی قربانیوں سے باخبر کرنے کے لئے ضروری تھا کہ منضبط نمونے سے اوراق کے سپرد کر دیتی مگر زیادہ حصہ لواحقین کے ذمہ تھا کہ وہ اپنے شہدائے بزرگان کا لمحہ لمحہ میرے سپرد کر دیتے۔ سو خدا تعالیٰ جزائے خیر دے محترمہ امت اللہ خانم صاحبہ کو جنہوں نے اپنے ابا جان کے قربانی کے نمونے کو آئندہ نسلوں کے لئے پیش کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے محترم ابا جان شہید پڑوسیوں کے ساتھ نہایت مشفقانہ سلوک کرتے تھے۔ اکثر پڑوسی غریب تھے۔ اُن کو ہر سال گندم کی بوری دیتے تھے۔ عید کے موقع پر کپڑوں کے لئے رقم دیتے تھے اور ہمیشہ غرباء کا علاج معالجہ مفت کرتے تھے۔ رات کے وقت اگر کوئی بھی بلاتا تو فوراً اس کے گھر تک اکیلے پہنچ جاتے تھے اور اگر کوئی میت ہو جاتی تو کفن دفن کا خرچہ بھی خود ہی برداشت کرتے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بلا امتیاز مریضوں کو وقت دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سارا شہر مداح تھا۔ قاضی احمد[1] کے وڈیرے بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ قاضی احمد میں ٹاؤن کمیٹی کے ممبر کے طور پر خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ الغرض حسنِ سلوک، رواداری اور مالی قربانی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔ مال کے انفاق کا کیا ذکر کروں۔ آپ نے تو **جان** ہی چندہ میں دے دی۔ یہی **چندہ** تو مشغل راہ ہوگا۔ آپ

[1] نواب شاہ ضلع کے شہر کا نام ہے۔

کے لئے ۔میرے لئے ۔اوران کے لئے ۔ انشاء اللہ

وَمن یوق شح نفسہ (سورۃ حشر)

نڈر، بہادر اور بےخطر داعی

ڈاکٹر محمد عبدالقدیر صاحب خداتعالیٰ کی کرم نوازی کے ساتھ داعی الی اللہ بھی تھے ۔ داعی کے لفظی معنی تو بلانے والے کے ہی ہیں ۔تو داعی الی اللہ کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی طرف بلانے والا ۔ اور خداتعالیٰ کی طرف بلانے سے مراد یہی ہے کہ خداتعالیٰ اوراس کے رسول کو شناخت کرانے والا ۔اس کے راستے پر چلنے اور چلانے والا ۔اس کی صحیح معنوں میں اتباع کرنے والا ۔ اور کرانے والا ۔ اور بالآخر خدا اور اس کے رسولؐ اور احکامات اسلام میں فنا ہو جانے والا ۔اور لوگوں کو بھی انہیں شاہراہوں کی نشان دہی کرانے والا مگر جب وہ خود کو ایمان و اعمال کے صحیح مقام پر پہچان لے گا تو چاہے گا کہ خلق خدا بھی انہی منزلوں کی تلاش میں نکلے ۔ اور جب وہ اسلام کی اس قسم کی دعوت کے لئے نکلے گا تو لوگوں کو بتائے گا کہ اگر تم خدا کی محبت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو رسولِ خدا کی محبت و اتباع پہلے حاصل کرو ۔آپ کے نقشِ قدم پر قدم مارو ۔ وہی راہ طریقت اختیار کرو جو خدا کا چہرہ دکھادے ۔ اور رسولِ خدا کی گلی میں سے گزرو تا آنکہ خدا کی منزل مل جائے ۔

سو واضح امر یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا کھلے بازوؤں سے لوگ استقبال کبھی کیا ہی نہیں کرتے ۔کبھی اُس کی آجیا نہیں ہوتی ۔ وہ ہمیشہ آگ میں ڈالا جاتا ہے پتھروں پر گھسیٹا جاتا ہے اذیتیں اور مصائب اس کا مقدر ہو جاتی ہیں ۔یہی حال محمد عبدالقدیر صاحب شہید کا تھا کہ وہ خود اپنے خاندان رشتہ دار دوست اور دس

پڑوسس کے لئے آگے جب بڑھے تو کسی نے آجیا نہیں کی۔ کوئی بھی خدا تعالیٰ کی
پکار کو برداشت نہ کر سکا۔ کسی کے دل میں خدا کا خوف نہ آیا کہ خدا کی طرف بُلایا
جارہا ہے بلکہ دھمکیوں بھرے خطوط موصول ہوتے رہے۔ چونکہ ۱۹۳۹ء میں جنگِ
عظیم میں برما کی طرف سے فوج میں شمولیت انہوں نے کی تھی۔ اور کبھی فوج میں رہ
چکے تھے۔ اور جذبہ بہادری اور بے خوفی ان کے خمیر کا حصّہ بن گیا تھا۔ اس لئے اُن
دھمکیوں اور مصائب سے کبھی گھبرائے نہیں بلکہ ہمیشہ اجتماعات منعقد کروائے۔ جلسے
اجلاسس میں حصّہ لیا۔ سندھ کے مختلف لوگوں سے ملاقات کیں۔ اور ہر ایک کی طرف
تبلیغ کا ہاتھ بڑھایا۔ اور کبھی یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مفت علاج کر کے اپنا
سچا پیغام ان کے پلے باندھ دیا۔ تقریباً نصف صدی سندھ کی زمین میں رہائش
اختیار کی۔ اس لئے کلچر اور زبان کے لحاظ سے اس زمین کو گلے سے لگا لیا۔ مگر اہل
سندھ نے حق وہی ادا کیا جو آج تک داعی الی اللہ کا بستیاں اور قومیں کرتی رہی
ہیں۔ آج پھر خشک خاک سندھ کو خون کی ضرورت پڑ گئی اور نواب شاہ کی زمین
عبدالقدیر صاحب کے خون سے سیراب ہوگی۔

قبولیتِ دُعا

دعا کا قبول ہو جانا ایمان کی تازگی اور پختگی کا ایک
سبب بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی زندگی
کے بعض ایسے مواقع سامنے آتے ہیں کہ معجزانہ طور پر ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔
چونکہ وہ اکثر تہجد پڑھتے تھے۔ اور تہجد کا وقت قبولیت دعا کے لئے ایک اعلیٰ وقت
ہے۔ یہ ایسا ہی وقت ہے کہ جب خدا اور اس کے بندے کے درمیان کچھ حائل
نہیں ہوتا۔ وہ اکثر اُٹھتے اور اپنے خدا کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے تھے۔ ان کی
دعاؤں کا زیادہ لب لباب خدمتِ دین ہی ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ
خوشحالی عطا کرے۔ اور سب سے زیادہ بڑی دعا شہید ہونے کی تھی۔ (یہی ناکہ)

وہ اکثر خدا تعالیٰ سے یہی عرض کرتے کہ خدایا میری زندگی کا لمحہ لمحہ تیرے دین کے لئے وقف ہے۔ مگر اے رب العالمین تو بہتر جانتا ہے۔ کہ میں اپنی عزیز سے عزیز چیز تیری راہ میں قربان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہمت عطا کر کہ میں دنیا کے کناروں تک تیرے دین کو پھیلا سکوں۔ جو دولت اور معرفت تو نے مجھے عطا کی ہے وہ قصبہ قصبہ، قریہ قریہ پہنچا سکوں۔ وہ اکثر دعاؤں میں روتے تھے اور حضرت شہزادہ عبداللطیف شہید نے جو قربانی کی مشعل جلائی تھی۔ اُس کی روشنی اختیار کرنے کی تڑپ رکھتے تھے۔ سو خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں کے بھید جانتا ہے۔ اُس نے آپ کی یہ دُعا قبول کر لی اور ایک دن وہ مشعل قربانی آپ نے تھام لی۔

دعوت الی اللہ کی سبیل خدا تعالیٰ کی خاص عنایت تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو ۲۵ سال تک ایک خطیر تعداد احمدیوں کی امارت حاصل رہی۔ کسی کا امیر ہونا ایک انتہائی اہم ذمہ داری ہے جو اوّل تو سونپی ہی پرہیز گار اور متقی شخص کو جاتی ہے اور اگر کچھ کمزوریاں اس کے وجود میں ہوتی بھی ہیں تو وہ انہیں رفع کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک امتیازی مقام رکھتا ہے اور دوسروں کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔ باقی حقیقی پاکیزگی اور تقویٰ خدا تعالیٰ کی دین ہے۔ وہ اپنے بندوں کو نوازلیتا ہے اور راہ نمائی کرتا ہے جو اُس کی راہوں پر چلتے ہیں۔ کامیابی ان کا مقدر ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک ایسے علاقہ کے (قاضی احمد) چار دہائی تک صدر و امیر رہے۔ جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ فرض شناس، ہمدرد، داعی الی اللہ، متقی، علم و فضل میں بہتر، عقل و حکمت میں ایک مثالی انسان تھے۔ حکمت و نبض شناسی ان کا پیشہ تھا۔ اور لوگوں کو ہمسایوں کو اور غرباء کو مفت دوائیاں و علاج مہیا کر کے تبلیغ کو ایک سبیل بنا لیا ہوا تھا۔ وہ اپنی آواز میں خدا کے پیغام کو اور اسلام

کی شناخت کو عوام کے سامنے ضرور لاتے تھے۔ایک بار مخالفت جماعتی لحاظ سے جب بہت بڑھ گئی تو وہ خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ ناصرآباد میں اپنی پریکٹس شروع کر دی اور خدا تعالیٰ پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے یہ تمنا کی کہ میری محنت ضرور پھل لائے گی۔سونتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اسی طرح وہ قاضی احمد کی زمین سے محبت کرتے تھے۔اور اسی علاقہ میں انہوں نے احمدیت کی عزت اور وقار کو اتنا بلند کیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا کہ جسے "احمدیت" کی تفصیلات کا علم نہ ہو۔کیونکہ اس عقیدہ کی اب،ج د کو تو تقریباً ہر بچہ و بوڑھا جانتا تھا۔اور مخالفت کی بھی غالباً یہی وجہ تھی۔

اطاعت

اطاعت ڈاکٹر صاحب کا شعار زندگی تھا۔انہوں نے تین خلفائے احمدیت کا زمانہ پایا اور ہر خلیفہ کے لئے دل و جان سے زیادہ اطاعت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کیا۔ان کا نصب العین یہی ہوتا تھا۔کہ اطاعت میں ہی عطیات ملتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے بعد نبی پاک محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نجات کا موجب ہے اور وصل کی سبیل ہے اور بعدہٗ مثیل امام زمان مہدی علیہ السلام کی روشنی میں راستے نمایاں ہیں۔ان راستوں پر چلنا۔اور سچی قربانی پیش کرنا اصل الاصول ایمان ہے۔وہ اپنے ایمان میں پختہ تھے اور ہمیشہ خلافت احمدیہ کی آواز پر سے زیادہ تیز عمل کرتے تھے۔اس کے بعد بھی امیر صاحب ضلع جب کبھی طلب کرتے تو اپنی طاقت سے بڑھ کر حصہ لیتے خواہ اجتماعی قربانی کا مطالبہ ہو یا انفرادی کا وہ کبھی دیر نہیں کرتے تھے۔سو خدا تعالیٰ نے انہیں اپنے محبوب خلیفہ کی اطاعت میں ایک اعلیٰ مقام عطا کر دیا اور یہی ان کی دعا ہوا کرتی تھی۔کہ اے اللہ تعالیٰ میں اپنے مقصد میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔مجھے میری تبلیغ کا نتیجہ دکھا دے۔وہ شہادت کی دعا بھی مانگا کرتے تھے۔اور یہ ان کی سب سے بڑی دعا تھی۔سو وہ پوری ہوئی۔انہوں نے

کسی آرڈیننس کی پرواہ نہیں کی ۔ اور اپنے لائحہ عمل پر گامزن رہے اور جام شہادت نوش کیا ۔

بحوالہ امت الرشید صاحبہ بنت عبد القدیر صاحب شہید درج ذیل)

۱۹۸۴ء کے آرڈیننس میں بھی امام وقت کی اطاعت ان کا ماٹو تھا۔ کئی دفعہ خطوط آئے کہ ہم تمہیں قتل کر دیں گے ۔کئی دفعہ حملہ کرنے آئے مگر ناکام گئے۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے مشورہ دیا کہ "قاضی احمد چھوڑ دیں ۔ مگر جماعت کی محبت ۔ اور جو انہوں نے اس علاقہ میں اخلاقی اثر پھیلایا ہوا تھا اور تبلیغ کی تھی ۔ اس کا نتیجہ دیکھنے کی تمنا تھی ۔ اس تمنا کو حاصل کرنے میں اپنے خون سے اس علاقہ کی آبیاری کر گئے ۔

۲ر اگست ۱۹۸۹ء کو بوقت پونے تین بجے گھر سے کلینک پر گئے ۔ مریضوں کو دیکھا اور پھر "الفضل" اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے کہ نامراد دشمن مریض بن کر کلینک میں داخل ہوا ۔ اور اپنی نبض دیکھنے کے لئے کہا ۔ اس وقت ڈاکٹر شہید موصوف اکیلے تھے کہ نبض دکھاتے ہوئے کاربین سے شہید کر دیا ۔ جس میں سے ایک گولی دل کے اندر لگی اور باقی نو گولیاں کچھ جبڑے میں اور کچھ کندھے پر لگیں جس سے ڈاکٹر صاحب موقع پر ہی شہید ہو گئے ۔ ڈاکٹر صاحب جب دوپہر کے بعد کلینک پر جاتے تھے ۔ تو پہلے کمپاؤنڈر کا فون آتا تھا ۔ پھر وہ خود آکر ساتھ لے جاتا تھا ۔ اس دن ان کی بیگم صاحبہ نے روکا بھی کہ ابھی نہ کوئی فون آیا ہے اور نہ ہی کمپاؤنڈر خود آیا ہے ۔ آپ ابھی نہ جائیں کہنے لگے کہ میں جلدی آ جاؤں گا ۔ تم چائے بنا کر رکھو ۔ پھر ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور ان کے ایک بہت ہی مخلص احمدی دوست مستری منیر احمد صاحب تھے جن کے گھر ڈاکٹر صاحب اس دن دو دفعہ گئے ۔ مستری منیر احمد صاحب کہتے ہیں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ دوبارہ کیسے آنا ہوا ؟ کہنے لگے کہ زندگی کا اعتبار کیا میں نے سوچا کہ مل آؤں ۔

کیا پتہ دوبارہ ملاقات نہ ہو اور ان سے مل کر پھر دکان پر واپس آ گئے۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ جب ڈاکٹر صاحب گھر سے نکلے تو میرا دل چاہا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ ہماری پڑوسن جو کہ سید ہیں اوپر سے کود کر آئیں اور اس نے بیگم صاحبہ کو یہ نہ بتایا کہ ڈاکٹر صاحب شہید ہو چکے ہیں۔ تاکہ ان کو کچھ نہ ہو جائے صرف اتنا ہی بتایا کہ چاچاجی کو گولیاں لگی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے اسی وقت اپنے پوتے کو جو کہ ان کے پاس سو رہا تھا جن کی عمر ۲۰ سال تھی بھیجا مگر اس کے جانے سے پہلے ہی کمپاؤنڈر ان کو اسپتال لے جا چکا تھا۔ جہاں وہ اپنی جان خدا کے سپرد کر چکے تھے۔ گھر سے ایسے نکلے کہ پھر گھر آنا نصیب نہ ہوا۔ پھر اس کے بعد جنازہ شام ۵ بجے نواب شاہ لایا گیا۔

یہ شہید ۱۹۷۸ء میں مکہ مکرمہ اور مدینہ عمرہ پر گئے اور وہاں سے دو چادریں آب زم زم سے دھو کر لے آئے۔ ایک اپنے لئے۔ ایک بیگم کے لئے اور وصیت فرمائی کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں گا تو یہ چادر مجھ پر ضرور ڈال دینا۔ شہید کو تو کفن بھی نہیں دیا جاتا مگر خون سے لت پت کپڑے پولیس کو دیئے تھے۔ اس لئے کفنایا گیا اور وہی آب زم زم سے دھلی ہوئی چادر اوپر ڈال دی۔ پھر سپر ایکسپریس کے ذریعے میت ربوہ لائی گئی جہاں پر شہید کے دو بیٹے تھے اور بیٹی جو کہ ان دنوں اپنے بھائیوں سے ملنے گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی شہادت پر جمع ہو گئے تھے۔ دو بیٹے باہر تھے جو کہ جنازے پر پہنچ نہیں سکے تھے۔ خدا ان کو صبر دے آمین۔ جنازے کے ساتھ آنے والے ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب (شہید) جو کہ ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے بعد ۲۸ ستمبر کو شہید ہو گئے تھے۔ پہلے پہلے بچوں میں سے دونوں بیٹیاں۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی اور کچھ احمدی دوست ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک غیر احمدی دوست پیر غلام محمد مصطفٰے صاحب نے ۱۲ بجے دوپہر کو کہا کہ ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ نواب شاہ چلیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ شام کو جاؤں گا۔ پس شام جنازہ ہی پہنچا۔ جنازہ ایمبولینس کے ذریعہ ان کے نواسے لے

کر آئے تھے۔ جہاں پر تمام احمدی، غیر احمدی سب جمع ہو گئے تھے۔ شہادت سے کچھ عرصہ پہلے شہید کا رنگ تھوڑا سا پیلا پڑ گیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ کہیں والد صاحب کو کچھ نہ ہو جائے۔ کیونکہ خط وغیرہ مولویوں کی طرف سے آرہے تھے۔ مگر والد صاحب کو جیسے پرواہ نہ تھی۔ چچا صاحب جناب ڈاکٹر عبد القدوس شہید نے والد صاحب کی شہادت کے بعد بتایا کہ میں نے کافی عرصہ پہلے خواب دیکھی کہ بڑے بھائی عبد الرحمان صاحب آئے ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ عبد القدیر کا خاص خیال رکھنا تو میں پوچھتا ہوں کہ اپنے بیٹے عبد العزیز کے بارے میں کیا خیال ہے تو کہنے لگے کہ اُسے رہنے دیں۔" کہتے ہوئے کہ جب شہید ہوئے تو پھر مجھے خیال آیا کہ بھائی اس کا خیال رکھنے کو کیوں کہہ رہے تھے

والد صاحب کی شہادت کے بعد ان کے گہرے دوست پیر غلام مصطفٰے صاحب کی بہو نے خواب میں دیکھا کہ میری والدہ خواب میں آئی ہیں (مطلب بہو کی والدہ) اور سندھی میں کہتی ہیں کہ توکي خبر نہ آھي تہ ظالم ڈاکٹر صاحب کي جاڙي ۾ گولي ھڻي ماري ڇڏيا آھن۔ تو پیر صاحب کی بہو پوچھتی ہے۔ اماں تمہیں کیسے پتہ چلا۔ کہنے لگی کہ فرشتے اُسے جنت کی طرف لے جا رہے تھے مطلب کہ خواب میں کہتی ہے کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ظالم جبڑے میں گولی مار گئے ہیں۔ تو میں پوچھتی ہوں کہ تمہیں کیسے پتہ چلا اماں۔ تو جواب دیتی ہیں کہ دو فرشتے ان کو جنت کی طرف لے جا رہے تھے۔ جب پیر صاحب کو ان کی بہو نے یہ خواب بتائی تو انہوں نے اپنے مرشد پیر لواری شریف والے قاضی فیض محمد کو فون پر یہ خواب بتائی تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خواب کے مطابق واقعی ڈاکٹر صاحب جنتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبد القدیر صاحب آف قاضی احمد کے حالات زندگی پر ایک نظر

۱۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۸۹ء تک

۲۔ والد محترم حکیم رحیم بخش صاحب

۳۔ جائے پیدائش: تلونڈی جھنگلاں ضلع گورداسپور انڈیا

۴۔ استاد المکرم: صوفی غلام محمد صاحب

۵۔ اسکول: تعلیم الاسلام ہائی اسکول قادیان

پیشہ: میڈیکل پریکٹس۔ امیر جماعت جماعت احمدیہ

۶۔ حصہ وقف عارضی۔ کئی بار وقف عارضی میں حصہ لیا۔

۷۔ حصہ مرکزی امتحان: تقریباً تمام مرکزی امتحانوں میں شمولیت کی۔

۸۔ قرآن مجید باترجمہ جانتے تھے۔ تفسیر کبیر، تفسیر صغیر کے مطالعہ میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ احادیث اور حوالہ جات اکٹھے کرتے تھے۔

۹۔ درمیانہ قد، درمیانہ جسم تھا۔

۱۰۔ چال کے لحاظ سے تیز قدم اٹھاتے تھے۔

۱۱۔ کھانے پینے کے لحاظ سے نمکین چیزیں زیادہ پسند کرتے تھے۔

۱۲۔ ناشتہ ہلکا، دوپہر کا کھانا ایک بجے، سر شام چائے۔ رات کا کھانا ۸ بجے کھاتے تھے۔

۱۳ تہجد کے لئے اُٹھتے تھے۔ نماز پنجگانہ کا التزام کرتے تھے۔

میں روشنی پاکر اپنے لئے ایک معین مقام پالیا۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتب کا مطالعہ۔ حوالہ جات کا اکٹھا کرنا۔ اور پھر تبلیغ کے لئے مواقع ڈھونڈنا ایک روشنی تھی جو انعام الرحمان صاحب کی زندگی پر چھا گئی۔ اور ہمیشہ ہمیش کے لئے انہیں منور کر گئی۔

جناب ڈاکٹر انعام الرحمان صاحب انور اس نور بصیرت کو لے کر اپنے مرکز ربوہ سے نکلے اور جگہ جگہ بحیثیت ناظم اپنے لوگوں کی خدمت کی۔ اور بہت لگن اور لگاؤ سے کام کیا۔ کبھی بحیثیت ناظم خدام الاحمدیہ اور کبھی ناظم انصار اللہ اپنے اپنے وقت اور موقع پر اپنی تنظیم کی قرآن و احادیث کے حوالہ سے اصلاح اور تربیت کی۔ خود بھی حضرت مسیح موعود و مہدی موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتب کا شوق سے مطالعہ کیا۔ اور ملنے والوں کو بھی تاکید کی کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان خزائن کو دیں جو ہمارے محبوب موعود (آپ پر سلامتی ہو) ہمارے لئے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی تہہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ اس سمندر میں سے نکالے ہوئے موتی و سیپ ہی انعام الرحمان صاحب کو داعی الی اللہ بنا گئے۔ وہ ان موتیوں سے مزین ہو کر دعوتِ حق کے لئے نکلے۔ لوگوں میں بیٹھے تو پیغام احمدیت پہنچانے کے لئے اور لوگوں سے ملے تو دعوتِ حق دینے کے لئے اور لوگوں سے رخصت ہوئے تو تلاشِ حوالہ کے لئے۔ حتیٰ کہ تبلیغ ان کا معمول بن گیا۔ جس کی بنا پر وہ ہر مخالف آنکھ میں شہتیر بن گئے۔ کیونکہ مخالفین کی نگاہیں توحقیقی داعی الی اللہ کی طرف ہمیشہ لگی رہتی ہیں۔ وہ اُسے اپنا ٹارگٹ (TARGET) بنا لیتے ہیں اور اس کے پیچھے ان کا ذاتی علم کچھ نہیں ہوتا صرف مخالفت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ جبہ پوشوں اور علماء سو کی لمبی لمبی تقریریں احمدیت کے خلاف سنتے ہیں اور انہیں یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کی نجات کسی داعی الی اللہ کی گردن پر چھری رکھنے سے ہے تاکہ

تبلیغ کی آواز دبا دی جائے۔ سو ایک دن جمعہ کی شام کو گھنٹہ گھر سکھر میں ایک ناعاقبت اندیش گروہ کو یہ موقع ہاتھ آگیا۔

فقدانِ خوفِ خدا

اے اہلیان سکھر تمہیں یاد ہے کہ یہ شخص تو وہی تھا جو تمہارا مسیحا تھا۔ تمہاری نبض پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن گنا کرتا تھا۔ آج تمہارے لوگوں نے اس کی دھڑکن بند کر دی اور آج بروز جمعہ جب اُس کی دھڑکن بند ہو رہی تھی تو تمہارے شہر کے لوگ دور سے نظارہ کر رہے تھے۔ نہ کوئی آگے بڑھا نہ ظالم کا ہاتھ روکا بلکہ چند ناعاقبت اندیش جوان جن کی عمر ۱۸ - ۲۰ کے درمیان تھی۔ اس درندگی کی طرف اس وقت بڑھے جب مارکیٹ میں خرید و فروخت کا بازار گرم تھا۔ یہ سبزی اور گوشت کی مارکیٹ تھی اور کندھا سے کندھا چھل رہا تھا اس وقت قصائی کی چھری تو بکرے کے گوشت پر چلتی رہی مگر ظالموں کی چھری ایک مسیحا پر چلتی رہی جو تمہارے لوگوں میں شفا بانٹا کرتا تھا۔ اور تمہارے علاقہ کا ایک میڈیکل آفیسر تھا۔ تم نے اپنے ہی خطہ کے ایک دردمند انسان کے سینہ پر چھری چلا کر یہ یقین قطعی کر لیا کہ ہمیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچا ہے۔ اے سکھر! تمہارے لوگ آج اس یقین سے پُر تھے کہ ان کی شفاعت کے لئے سرورِ کائنات پیغمبر دو جہاں آسمان سے نیچے اُتر آئیں گے اور خدا تعالیٰ سے ان کی بہادری اور مضبوطی ایمان کے قصے بیان کریں گے۔ اور انہیں انعام دلوائیں گے۔ کیا انہیں سرور کائناتؐ کی وہ حدیث یاد نہیں کہ "مسلمان وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ سے یا زبان سے کوئی دوسرا مسلمان نقصان نہ اٹھائے۔ مگر یہاں نقصان کی تو بات نہیں۔ یہاں تو چھریوں کا بازار لگا ہوا تھا۔ لیکن کوئی مسلمان اپنی چھری بکرے پر آزما رہا تھا اور کوئی کاٹنے پر

اور کوئی مسلمان اپنی چھری اشرف المخلوقات اور فرض شناس کلمہ گو مسیحا پر چلا رہا تھا۔ وہ فرض شناس قابل انسان جو لوگوں کی جاتی ہوئی سانس کو واپس لوٹا لیا کرتا تھا۔ اور ماں کی گود اور بیوی کا سہاگ بچا لیا کرتا تھا۔ مگر آج خوشیاں لوٹانے والے کی بیوی کا سہاگ بھرے بازار میں چھری کے پے در پے وار سے جیب لوٹا جا رہا تھا تو کوئی ماں کا لعل آگے نہیں بڑھا۔ کیونکہ ایک دور قوموں پر ایسا بھی آیا کرتا ہے کہ دلوں کو بے حسی پتھر کر دیتی ہیں۔ آنکھیں ہوتی ہیں مگر دیکھ نہیں سکتیں۔ کان ہوتے ہیں مگر سن نہیں سکتے۔ کیوں! ایسا کیوں؟

اس لئے کہ خوف خدا کا فقدان قوم کا مقدر بن چکا ہوتا ہے۔ افسوس اے جبہ پوش مُلاں تو نے اسلام کو بگاڑ کر بہتوں کو دوزخ کی طرف دھکیل دیا اور گمراہی ان کا مقدر کر دیا اور عذابُ السعیر کی طرف انہیں کھینچ کر لے گئی۔ اے بے مہر ماہر شعلہ بیان تو نے اچھا نہیں کیا۔ چند سکوں کے بدلے تیری چرب زبانی نے بھولے بھولے جوانوں کا ہمیش کی آگ سے پیٹ بھر دیا۔ افسوس صد افسوس۔

محترم مولوی عبدالرحمٰن انور ابن محترم جناب مولوی عبداللہ بوتالوی رفیق حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کو اللہ تعالیٰ نے کثیر الاولاد بنایا تھا۔ آپ کا ہر بچہ بیٹا یا بیٹی اپنی اپنی جگہ نمایاں خصوصیات کا حامل تھا مثلاً (۱) لطف الرحمٰن صاحب شاکر (واقف زندگی) (۲) حلیمہ سعدیہ (۳) آمنہ خالدہ (۴) انیسہ فاضل صاحبہ (۵) احسان الرحمٰن انور (۶) نعیم الرحمٰن طارق (۷) حفیظ الرحمٰن انور (۸) مجیب الرحمٰن انور (۹) سلیمہ جلیل صاحبہ یہ ایک خاندان تھا جو قادیان، لاہور، ربوہ احمد نگر مختلف مقامات پر رہائش پذیر رہا۔ مگر ہر مقام ان کے لئے ایک مدرسہ تھا جہاں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ اطاعت امام، نظم و تنظیم، حصول علم اور ایثار و قربانی

ان کا لائحہ عمل رہا۔

مکرم انعام الرحمٰن صاحب انورؔ

یہ ایک بچہ ان میں سے خدا تعالیٰ کا ایک انعام تھا۔ جو خدا تعالیٰ نے مولوی عبد الرحمٰن صاحب انور کو ان کی خدمات کے عوض دیا تھا۔ جو انہوں نے خلفائے کرام سلسلہ عالیہ احمدیہ کی بے لوث خدمات کی تھیں اور شہادت ایک ایسا انعام ہے جو جناب ڈاکٹر صاحب انعام الرحمٰن کو مریضوں کی بے لوث خدمت کے صلہ میں نصیب ہوا۔ وہ دُکھی انسانیت کے مسیحا تھے۔ بیماروں اور مریضوں کی نگہداشت ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ پندرہ بیس منٹ آرام کر کے علاج و معالجہ کے سلسلہ میں نکل کھڑے ہوتے۔ تقریباً روزانہ کا پروگرام یہی تھا کہ ساڑھے آٹھ بجے ڈسپنسری پر جاتے تھے اور ۲½ بجے تک ان گنت لوگوں کا دُکھ بانٹتے ہوئے واپس آتے۔ آکر نماز ادا کرتے اور کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتے۔ پھر نماز عصر کے بعد دوبارہ ڈسپنسری چلے جاتے اور ہر خاص و عام کے لئے شفا کا ہاتھ بڑھاتے۔ جبکہ خود ظالموں نے عصر کے وقت ہی آپ کی گردن کی طرف ظلم کا ہاتھ بڑھایا آج کوئی خاص و عام ہاتھ آپ کے بچانے کے لئے آگے نہ بڑھا۔ آپ سڑک کے کنارے تڑپ تڑپ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کرتے رہے۔ اور لوگ گھروں کو بھاگ بھاگ کر اپنی جانیں بچاتے رہے کسی شاعر نے کتنا بڑا خیال کتنی قناعت سے بیان کر دیا۔

یونہی ہمیشہ ظلم سے الجھتی رہی ہے خلق	نہ اِن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول	نہ انکی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

تعلیم و تربیت

تعلیم کو حاصل کرنے کے مواقع تو آپ کو اپنے والدِ محترم کی قیادت میں ہی میسّر آگئے تھے۔ تربیت بھی مشفق اور مربیانہ ہاتھ نے کر دی تھی۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ وجعلنا للمتقین اِمَامًا کے مطابق انعام الرحمان صاحب اپنی اولاد کی تربیت کرتے۔ اپنے اہل و عیال کے امام بنتے۔ سکھر، شکار پور اور جیکب آباد کی تنظیموں کو فعال بنانے چنانچہ ان گرم خشک میدانوں میں مشعل نور لے کر اُترے۔ تو ہر جہت سے ان کی تربیت کی۔" اور ۱۹۶۲ء میں جب اپنی عائلی زندگی میں داخل ہوئے تو خدا تعالیٰ نے امت الحفیظ شوکت صاحبہ جیسی دردمند، محبت کرنے والی اور دین کی راہوں پر قدم مارنے والی ساتھی عطا کر دی ہنسی خوشی شب و روز گزرتے رہے۔ خدا تعالیٰ نے محمود الرحمان انور، اور امت النصیر انور سے اس جوڑے کو مزین کیا۔ اور یہ ننھا سا قافلہ کچھ عرصہ تک عبد و گوٹھ (سکھر) کی سرزمین میں احمدیت کا سچا نمونہ پیش کرتا رہا۔ اتفاق کی بات ہے کہ قریب قریب کوئی احمدی نہیں تھا۔ پھر بھی یہ یکتا و تنہا گھرانہ خشک زمین پر پُر مسرت زندگی گزارتا رہا۔ امت الحفیظ شوکت صاحبہ کا معمول تھا کہ کھانا و چائے وقت پر تیار کر کے ذہنی طور پر اپنے ساتھی کی خبرگیری کرتیں۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم خود دیتیں اور گاہے گاہے سیر و تفریح کے لئے لے کر بھی جاتیں۔

ڈاکٹر انعام الرحمان صاحب بھی اپنی رفیقۂ حیات کے لئے سچے عاشق اور مثالی رفیق تھے وہ ہمیشہ ان کے احساسات و جذبات کا احترام کرتے تھے اور جان و دل سے ان کی قدر کرتے۔ مثال کے طور پر آخری گھڑی یعنی وقتِ رخصت بھی ان جانے میں بیوی کو انتظار میں رہنے کے لئے کہا۔ اور ساتھ ہی ایک دوکان سے اسٹول لا کر دے دیا۔ "کہ آپ یہاں بیٹھیں۔"

یہ اس بات کی دلیل تھی کہ کبھی یہ گوارہ نہیں کرتے تھے کہ ان کی بیوی کھڑی

ہو کر بے آرامی کی صورت میں ان کا انتظار کرے۔ بلکہ جاتے جاتے واپس لوٹ کر اس سچے ہمدرد کی طرح ہاتھ بھی ملایا۔ اور بزبانِ حال اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ "اے میری رفیقِ حیات! میں اگر خدا کی رضا کے باعث تجھ سے رخصت بھی ہو رہا ہوں تو خدا گواہ ہے کہ میں تجھ سے قطعی خوش ہوں اور گواہی دوں گا کہ میں تجھے جنت کا حقدار سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تو نے ہمیشہ میری دل جوئی کی ہے۔ خبر گیری کی ہے۔ اور راحت و سکونت عطا کی ہے۔ جیسے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے۔ جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ کوئی عورت اس وقت تک خدا تعالیٰ کا حق ادا کرنے والی نہیں سمجھی جا سکتی جب تک کہ وہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی۔"

(ابنِ ماجہ)

اس حدیث کی تشریح میں قمر الانبیاء حضرت مرزا بشیر احمد (اللہ آپ سے راضی ہو) فرماتے ہیں کہ گھر کی حقیقی سکینت اور حقیقی برکت صرف اس صورت میں قائم ہو سکتی ہے کہ خاوند اپنی بیوی سے بہترین سلوک کرنے والا ہو۔ اور بیوی اپنے خاوند کے حقوق پوری وفاداری کے ساتھ ادا کرے یہ کہ وہ اس کی فرمانبردار ہو۔ اس کا واجبی ادب ملحوظ رکھے۔ اس سے محبت کرے اس کے مال کی حفاظت کرے۔ اس کی اولاد کی تربیت کرے اور جہاں تک ممکن ہو اُس کی خدمت بجا لائے۔"

ایک دوسری حدیث میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سردرِ کائنات محبوب خدا فرماتے ہیں کہ:۔

"جس مسلمان عورت کا خاوند ایسی حالت میں فوت ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے خوش تھا۔ تو ایسی عورت خدا کے فضل سے جنت میں جائے گی۔"

پس بشارت ہو کہ "اے دخترِ نیک اختر، سید عبدالعزیز شاہ صاحب" آپ تو انعام الرحمان صاحب کی نصیب اور قرۃ العین ہیں۔ اور وہ اپنی خوشنودی سے جنت کی بشارت آپ کو دے گئے ہیں۔ کیونکہ رسولِ خدا صادق القول ہیں۔

محترمہ امت الحفیظ شوکت صاحبہ سے میں معذرت خواہ ہوں کہ کسی سابقہ عبارت میں جذبات بے تکلفی سے متاثر ہو کر میں نے لکھا کہ" بزبانِ حال اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ " اے میری رفیق میں ...... تجھ سے ...... تو نے ہمیشہ میری دلجوئی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس عبارت میں تو .... تجھے، تمہیں استعمال کرنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ آپ نے تو لکھا ہے کہ " خلیفۃ المسیح الثالث (اللہ آپ سے راضی ہو) نے جب احمدی خاوندوں کو بیوی کے لئے لفظ " آپ " استعمال کرنے کے لئے فرمایا تو انعام الرحمان صاحب نے اس ارشاد کو مستقل عادت بنا لیا۔" بیشک آپ کے شوہر انہیں اطاعت کی راہوں پر چل کر انعامِ شہادت کے حقدار ہوئے ہیں۔

احساس ذمہ داری

چونکہ ڈاکٹر صاحب ایک فعال جماعت کے فعال رکن تھے۔ اس لئے سرکاری ڈیوٹی ہو یا کچی ذمہ داری یا جماعتی مصروفیت ہر جہت سے اپنے فرائض کو با احسن ادا کرتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا خود پڑھتے اور دوسروں کو پڑھاتے۔ جماعتی امتحانوں میں شمولیت کی اور ہمیشہ اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ گھر میں بیوی بچوں کو تحریک کرتے کہ عہدہ لے کر جماعتی فرائض کو سرانجام دیا جائے تاکہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہو۔ بیٹی کو تعلیم کے زیور سے مزین کرنے کے لئے ایک عرصہ اپنے والدین کے گھر ربوہ بھیجے رکھا تاکہ احسن طریقے سے تعلیم مکمل کی جا سکے۔ بیٹے کو بھی یہی تاکید کرتے

کہ اخراجات کی پرواہ کئے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور تعلیم ہی تمہیں بہترین انسان بننے میں مدد دے گی۔

یاد رہے کہ اسلام میں سچے علم کا وہ مقام تسلیم کیا گیا ہے جو ایمان کے بعد کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں۔"

ہاں مرکز کی آواز پر لبیک کہنا بھی ڈاکٹر صاحب کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مرکز سے دُوری ایمان کی کمزوری کو راستہ دکھاتی ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر مرکز میں خود حاضر ہوتے اور اپنے غیر از جماعت دوستوں کو جلسہ سالانہ کے موقعوں پر مرکز ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اور مرکز کا بھرپور تعارف کرواتے تھے۔

احساسِ ذمہ داری کا جہاں تک تعلق ہے۔ ڈاکٹر انعام الرحمان صاحب اپنے آخری سانس تک اس فرض کو نبھاتے رہے مثلاً جب وہ اپنی جان رفیق اعلیٰ کو پیش کر رہے تھے تو اپنے فرض اور احساسِ ذمہ داری سے غافل نہ تھے۔ اور جیسا کہ ہجوم نے جو لاش کے گرد کھڑا تھا بیگم صاحبہ کو بتایا کہ خون میں تڑپتی ہوئی لاش نے اپنی انگلیاں اپنے ہی خون میں ڈبو کر قاتلوں کے نام لکھے جب کہ انہی قاتلوں کے خلاف درج شدہ ایک F.I.R بھی لاش کی جیب میں محفوظ موجود تھی۔

سبحان اللہ کیسا دلیر سپوتِ احمدیت تھا کہ جان دیتے وقت بھی احساسِ ذمہ داری نبھایا کہ لواحقین کے لئے مجرموں کی نشان دہی کر دی۔ یہ سانحہ کئی لوگوں سے کئی بار پیش آتا ہے مگر حواس اس طرح جواب دے جاتے ہیں کہ سوائے چیخ و پکار اور ہائے دہائی کے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلتا۔ ہاں ایک دن اولین پر بھی مشرکینِ مکہ نے ایسے ہی عذاب و مصائب کے ابواب کھول دیئے تھے۔ اُنہیں بھی صرف توحید کی وجہ سے اذیتوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ مگر وہ مقابلہ نہیں تھا۔ بلکہ سختی کے بدلے احد احد کا اقرار نامہ ان کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ یاد رہے کہ کس طرح حضرت بلالؓ اور

حضرت عمارؓ، حضرت ال یاسرؓ، حضرت سمیہؓ اور حضرت خبابؓ اور باقی اسلام کے دوسرے شیدائی دکھوں کی بھٹی میں ڈال دیئے گئے تھے۔ مگر اُن کا خدائے واحد اور قدوس کی توحید کا اقرار اور تپتی ہوئی پتھریلی زمین پر دہکتے ہوئے پتھر کے نیچے لیٹ کر بھی اَحد کے ساتھ چمٹے رہنا انہیں مبشرین بنا گیا۔ اسی طرح آج آخرین پر بھی یہ دن آیا کہ ایک کلمہ گو شہید کیا جا رہا ہے۔ اور ضربِ شہادت کے بعد وہ خون کی زبان سے اَحد، احد کہہ رہا ہے۔ اس کا خون تصویر بنا رہا ہے۔ یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ کی تصویر بناتا ہے اور اپنے خون کا رنگ اس میں بھر دیتا ہے۔ وہ چیختا نہیں۔ وہ آہ بکا نہیں کرتا وہ پچھتاوے کی نظر سے قصاب کی طرف نہیں دیکھتا۔ اور وہ مدد کے لئے عوام کو نہیں پکارتا بلکہ جان دیتا ہے کہ مخالفین کے نزدیک اس کا قصور صرف اور صرف کلمۂ توحید کا اقرار ہے جو جان کی قیمت ادا کر کے خدائے لم یزل کی واحدانیت کی شہادت اپنی شہادت سے دے رہا ہے۔ وہ زبانی اقرار کے بعد اور آگے بڑھتا ہے اور اپنے خون میں اپنی انگلیاں ڈبو کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی ابدی تحریر کو نوشتۂ دیوار بنا دیتا ہے بیشک کلمۂ توحید کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ لیکن اے ناعاقبت اندیش گروہ تمہاری بدنصیبی کہ تمہیں تو یہ بھی نصیب نہ ہوا کہ آگے بڑھ کر دیکھتے کہ خون کیا بول رہا ہے جب کہ تمہیں مرتے وقت کلمہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ دیکھو حسرت سے دیکھو کہ یہ خونِ شہادت، شہید احمدیت کی شہادت دے رہا ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

آپ صرف مرزائی ہیں

انعام الرحمان صاحب کا معمول تھا کہ دوستوں اور پڑوسیوں کو اکثر و بیشتر چائے پر مدعو کرتے اور چائے سے خاطر و مدارت کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کی تسکین و تشفی کا سامان بھی مہیا کرتے ۔ عام دُنیا میں یہی دستور ہے کہ پارٹیز وغیرہ کے لعد میوزک کا اہتمام ہوتا ہے اور کوئی تفریحی پروگرام ہوتا ہے مگر ایک جماعت ایسی بھی ہے۔ جو چائے اور کھانے کے لعد اپنے مہمان کے لئے وُہ ساز چھیڑ دیتی ہے جو سوز و روحانیت کی تاروں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ ان کی سعی ہوتی ہے کہ مادی غذا کے ساتھ ساتھ روحانی غذا کا بھی دور چلے۔ یہ کوئی نئی ریت نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ اپنے آقا و مولیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوہ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے یہ قدم اُٹھاتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا وہ دعوت جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے دعویٰ نبوت کے معاً لعد اپنے عزیز و اقارب کے اعزاز میں کی تھی وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ[1] کے مطابق آپ نے سب سے پہلے اپنے ہی چچا اور دوست احباب مدعو کئے تھے اور پھر دعوت طعام کے ساتھ توحید کا تحفہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ آپ کی غرض طعام و پیغام ساتھ ساتھ تھی۔

پس ! اس مبارک ریت کو نبھانے کے لئے یہ آخرین بھی اپنے ملنے والوں کو۔ یار دوستوں کو ہمسایوں کو اور حق کے متلاشیوں کو اکثر و بیشتر دعوتوں پر بلاتے ہیں سُنّتِ محمدیّہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ دعوت الی اللہ کرتے ہیں گو لعد میں حق کی جستجو کرنے والے حق جان کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ مگر لبا اوقات ان کی BLOOD

---

[1] ۲۱۵/الشعراء

انہیں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ اور وہ یہ تبصرہ کر کے اُٹھ جاتے ہیں کہ واللہ آپ نے کیا باتیں کیں۔ آپ کتنے اچھے انسان ہیں۔ آپ میں کتنی خوبیاں ہیں۔ آپ تو مثالی مسلمان ہیں۔

مگر

افسوس آپ صرف مرزائی ہیں۔ وگرنہ تو..... اور انعام الرحمٰن کے پاس اس کا یہی جواب تھا۔" اگر مرزائی نہ ہوتا تو آپ جیسا ہوتا۔

کیونکہ

انعام الرحمان صاحب جانتے تھے کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ ہمارا نام تو خدا تعالیٰ نے ہی مسلمانوں میں رکھ دیا ہے۔ مگر زمانے کی روایات و بدعات کا ساتھ دیتے ہوئے۔ ہم اسلام کے محور سے ہٹ گئے تھے۔ کلام خدا کو مہجور کر کے چھوڑ دیا تھا۔ طاق اس کا مقام تھا۔ ہاں البتہ جمعرات اور جمعہ کو ہم ضرور اس پر پھول چڑھاتے تھے یا کسی کے مرنے پر پڑھ پڑھا دیا کرتے تھے۔ تعویذ گنڈے ہمارے اعتقاد کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ ریاکاری ہمارا نصب العین تھا۔ عبادت بڑھاپے کا معمول تھا۔ وگرنہ جوان سال کیا جانے روزہ، زکوٰۃ اور نماز کے کیا ماحصل ہیں۔ ہاں روزہ ہمارا شعار دین تھا۔ اسی لئے تو ہم ۵، ۷ سال کے بچے کو بھی روزہ رکھوا دیا کرتے تھے۔ خود بھی ہم روزہ رکھ کر نہ نماز، نہ عبادت اور ذکر نہ اذکار محض ایک نمود و نمائش تھی۔ ہاں پیری، فقیری، چہلم، بدعات و رسومات بگڑے ہوئے عقائد کے طوق ہمارے گلے میں ضرور تھے جس سے مزین ہو کر ہم اسلام کے علمبردار کہلاتے تھے۔

البتہ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہم امام مہدی اور نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انتظار میں تھے کہ کب وہ دن آئے کہ دمشق کی مسجد کے مینارہ پر حضرت

عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زندہ اُتر کر ہماری راہ نمائی کریں۔ جنگیں کریں۔ عیسائیوں کو قتل کریں خنزیر کو مارتے پھریں۔ یہودیوں کا قلع قمع کریں اور ہمارے ہاتھ میں دین محمد کا جھنڈا تھما کر اُمتِ محمدیہ کے لقب سے نواز دیں۔ یہی ہمارا ایمان تھا اور ہم سیدھے سادھے لوگ اللہ رسول کی باتوں کا یہیں تک احاطہ کئے ہوئے تھے۔

ناگہاں

وہ مہدی جس کا میرے باپ دادا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دن آگیا اور اُس نے آئینہ کی طرح اسلام کا چہرہ میرے سامنے کر دیا اُس مصفا شفاف چہرہ میں سے جب میں نے اور میرے باپ دادا نے اسلام کو دیکھا تو میرے ہوش گم ہو گئے کیونکہ میں بہت پراگندہ، بگڑے ہوئے، فرسودہ عقائد پر گامزن تھا۔ میں حیران ہوا کہ میرے راستے جن پر میرے اسلاف مجھے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قطعی نہیں تھے۔ فرسودہ روایات کی گرد اُن پر جمی ہوئی تھی آسانی اور سہولتوں سے وہ بہت دُور تھے۔ فطرت سے وہ نابلد تھے حالانکہ میرا دین تو فطری دین کہلاتا ہے۔ میرے اسلاف تو عیسیٰ علیہ السلام کا بنفسِ نفیس انتظار کر رہے تھے اور کہتے تھے۔ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اُٹھا لئے گئے ہیں۔ میں بھی اسی کا قائل تھا اور اسی نظریہ پر جان دیتا تھا۔ مگر جب وقت کے موعود امام مہدی (آپ پر سلامتی ہو) نے مجھے یا میرے باپ دادا کو محمدی شاہراہ کا راستہ دکھایا اور نورِ محمدی سے مجھے روشن و منور کر دیا تو ایک مصفا آئینہ میں سے خدا کا چہرہ مجھے نظر آنے لگا۔ اب میرے لئے کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اس امام زمان کی اتباع کرتا اور اس کے پیچھے چلتا۔ ان کے ساتھ چلتا۔ ان کے دائیں چلتا بائیں چلتا۔ میں نے باہوش و حواس اپنے دینِ محمدی کو قرآن مجید کے اوراق میں دیکھ

لیا۔ وہ قرآن جو کبھی میرے گھر کے کسی طاق میں خوبصورت جز دان میں بند پڑا رہتا تھا۔ میرے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔ مجھے میرا دین میری کتاب کے اوراق میں سے ہی مل گیا۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ میری کتاب بولتی نہیں تھی۔ کسی بولنے اور سمجھانے والے کی ضرورت تھی سو وُہ پوری ہوئی اور خدا اور اس کے رسولؐ کا چہرہ شفاف و اجلی میرے سامنے آگیا۔ اور یہ سب کچھ اس موعود مہدی کے طفیل ہوا۔ سولے میرے معزز مہمانوں! جو بھی خوبیاں تمہیں مجھ میں نظر آتی ہیں وہ سب اس محبوب کی بدولت ہیں جن کا نام نامی میرزا غلام احمد قادیانی ہے وہ میرزا خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک اولوالعزم فرستادہ ہے۔ اس لئے لوگ مجھے مرزائی کہتے ہیں اور اگر میں مرزائی نہ ہوتا تو یقیناً تمہارے جیسا ہوتا۔

نعم العبد

یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ ○

(۷/الانشقاق)

یعنی اے انسان تیرے لئے اپنے رب سے ملنے کا راستہ تو ہر وقت کھُلا ہے۔ مگر متواتر محنت اور جد و جُہد شرط ہے یعنی لقائے الٰہی کے لئے قربانیوں کی ایک آگ میں سے تمہیں گزرنا پڑے گا۔ ان قربانیوں میں جان کی قربانی مال کی قربانی، وقت کی قربانی۔ نفس کی اولاد اور آرام و خواہشات کی قربانی شامل ہے۔ جناب انعام الرحمان صاحب کی شخصیت میں یہ تمام قربانیاں نمایاں مقام رکھتی ہیں مگر بخوف طوالت ایک دو کا ذکر کر کے آگے چلتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سورہ فرقان میں عبادالرحمان کی شناخت کے لئے کئی علامات

کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ (۶۵/الفرقان)

کہ رحمان کے بندوں کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ اپنی راتیں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ و قیام کرتے ہوئے گزار دیتے ہیں اور بہ خصوصیت شہید انعام الرحمان کی ذات میں نمایاں طور پر پائی جاتی تھی۔ جیسا کہ آپ کی بیگم امت الحفیظ شوکت صاحبہ فرماتی ہیں کہ "یوں تو وہ بچپن ہی سے نماز باجماعت کے پابند تھے اور نماز بروقت ادا کرتے تھے اور اگر مسجد میں نہ جا سکتے تو اپنے گھر والوں کو ساتھ شامل کرکے نماز باجماعت کر لیتے تھے اور عموماً رات سونے سے قبل سب گھر والوں سے نماز کی ادائیگی کی تفصیل طلب کرتے تھے حد تو یہ ہے کہ وہ دعاؤں سے کام لیتے اور راتوں کی تنہائیوں میں خدا تعالیٰ کے سامنے جھکے رہتے اور اپنے آرام و آسائش کی قربانی تواتر سے کرتے۔ نمازِ تہجد کی باقاعدگی ان کا شعار تھا اور بیوی کو بھی اس کی تلقین کرتے اور اکثر اٹھا کر اپنے ساتھ شامل کرکے باجماعت نمازِ تہجد ادا کرتے تھے۔ یہ بڑی خوش کن علامت ہے کہ انسان اپنے ساتھ ساتھ اپنی جدوجہد میں اپنی اولاد اور بیوی کو شامل کرے۔ وگرنہ عموماً کئی لوگ ساری ساری رات خود اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور بیوی بچے خراٹے بھرتے ہوئے آرام فرما رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی نفس کی قربانی کے لئے ایک نسخہ کامیاب تلاش کر رہے ہوتے ہیں جبکہ اپنے اہل و عیال سے بے خبر ہوتے ہیں۔

لیکن

یاد رہے کہ خدا کا عاشق و صادق بندہ خود بھی جنت کی راہوں پر گامزن ہوتا ہے

اور چاہتا ہے کہ میرے بچے جو میرے وجود کا حصہ ہیں وہ بھی ان رستوں پر اپنی زندگیوں کو ڈال دیں۔ یہی وہ راستے ہیں جن پر چل کر وہ خدا تعالیٰ کو پالیں گے۔ اس کا لقا ان کا انعام ہوگا اور اُن کا انعام اُس کی رضا ہوگی مگر جدوجہد اور قربانی ضروری ہے۔
اور رحمان کے بندے اس جدوجہد اور قربانی میں اپنے بیوی بچوں کو پیروکار بناتے ہیں حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں کہ اگر مرد کوشش کرے کہ میری بیوی دین سے واقف ہو۔ نماز روزہ کی پابند ہو۔ دینی کاموں میں حصّہ لینے والی ہو۔ بچوں کی نیک تربیّت کرنے والی ہو۔ تو مرد امام ہوگا اور بیوی ماموم۔ اسی طرح اگر ماں اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت کرے تو وہ امام ہوگی اور اولاد ماموم ہوگی اور اولاد کے نیک کام بھی اس کی طرف موسوم کئے جائیں گے۔ عورت قبر میں سورہی ہوگی مگر جب اس کے بچے فجر کی نماز پڑھیں گے تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اس بی بی نے نماز پڑھی۔ اسی طرح اگر اس نے اپنی اولاد کو تہجد کی عادت ڈالی ہوگی تو فرشتے لکھ رہے ہوں گے کہ اس نے تہجد کی نماز پڑھی۔ یہی مردوں کا ہے وہ بھی جتنے لوگوں کی ہدایت کا موجب بنیں گے ان سب کے نیک اعمال کے ثواب میں وہ بھی شریک ہوں گے۔ اس طرح وہ امام ہوگا اور دوسرے لوگ ماموم۔

امام اور ماموم ایمان اور اعمال

امام اور ماموم کے فلسفے کے بعد اگر یہاں تھوڑی دیر کے لئے ہم ایمان اور اعمال کے فلسفہ کو سمجھ لیں تو ہمیں یقیناً سہولت ہوگی کہ کس طرح اور کیوں ایک مومن راتوں کو رات کے اندھیروں میں گوشوں اور خلوتوں میں خدا کو یاد کرتا ہے آخر کیوں؟

یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور ہمارا مقصدِ حیات عبادت ہی ہے مگر ایک بندۂ خدا اس حد تک کیوں پہنچ جاوے

کہ خدا کے وصل ہی کے راستے تلاش کرنے لگ جائے یہ کہ خدا کے دیدار اور "درشن" کے لئے سبیل ڈھونڈنا پھرے آخر کیوں ؟

"تو آیئے پہلے اعمال اور ایمان کا رشتہ جان لیں۔"

حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت ہے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں یعنی کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا۔ بہتی ہوئی نہروں کا ازبس ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح کوئی ایمان زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ کوئی نیک اعمال سر انجام نہ دیئے جائیں۔ اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں تو اعمال ہیچ ہیں۔ اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہوں تو وہ اعمال ریا کاری ہے۔ پس جوں جوں کسی انسان کا ایمان کامل اور پختہ ہوتا جائے گا۔ اس کے اعمال نکھرتے جائیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اعمال کے پانی سے اپنے باغ کو سرسبز کرتا جائے گا۔ گویا کہ رشتہ ایمان و اعمال لازم و ملزوم ہوتا جائے گا۔

پس وہ شخص جو دن کی عبادت، کارِ خیر، حسنِ اخلاق، امر معروف روزہ، زکوٰۃ نماز و قربانی کی ادائیگی کے علاوہ راتوں کے اندھیروں میں اس نور کو تلاش کرتا ہے۔ (اور حقیقت میں وہ نور ملتا بھی راتوں کی تاریکیوں میں ہے) تو وہ خلوت کے گوشوں میں اُسے پالیتا ہے۔

میرا خون مانگتی ہے سرزمینِ سندھ

کچھ ایسی ہی کیفیت اور تلاش لے کر ڈاکٹر انعام الرحمان صاحب جہدِ مسلسل میں لگے رہے۔ ہر مشکل دیلا کو مستقل مزاجی سے سہتے رہے۔ کبھی امتحانوں سے تنگ آکر راستہ نہیں بدلا۔ کبھی عاجز آکر مقام نہیں چھوڑا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کہتے ہیں کہ

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ [1]

کہ اے خدا اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر کہ جس سے صبر آ جائے اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو۔ پس ایسے مشکلات کے لمحوں میں خدا تعالیٰ کا ایک نورانی کو قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ نہایت اطمینان سے دکھوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

اور جب ایک دن لوگوں نے آپ کو حالات کے خراب ہونے اور اس کے نتیجے میں خطرات سے آگاہ کیا۔ تو آپ نے اس بات کو تسلیم کیا۔ مگر یہ کہہ کر علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ یہ علاقہ احمدیت سے خالی ہو جائے گا۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۳ء کے موقعہ پر ربوہ میں آپ کے تمام بہن بھائیوں اور عزیز و اقارب نے بھی سندھ کو چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس وقت بھی حامی نہ بھری۔ بلکہ کہنے لگے کہ شاید سندھ کی زمین میرا خون مانگتی ہے۔ اور پھر سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگے کہ میں اس کے لئے تیار ہوں۔

اور واضح ہو کہ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے خدا کے تابع ہوتے ہیں اور حلاوتِ ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں جو اس کی راہ میں ان کے پیروں میں پڑی ہیں اور جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ربّ کریم سے خواہ مخواہ کا جھگڑا شروع نہیں کرتا کہ مجھے ان بلاؤں سے بچا۔ کیونکہ اس وقت عافیت کی دعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقت تامہ کے مخالف ہے۔ بلکہ سچا محبّ بلا کے اترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ

[1] (۷ - ۱۲۷)

کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولیٰ کی مرضی کا بکلی تابع ہو جاتا ہے اور اس کی رضا چاہتا ہے اور خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دے دیتا ہے۔ اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے۔"

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۴)

بیشک شہادت ایک بہت بڑا انعام ہے۔ جو انسان کو ہمیش کی زندگی دے دیتا ہے اور تو اور حکمت و معرفت سے پُر کلام نے بھی اقرار کیا کہ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ

نوٹ فرمائیں! شہید کو اپنے کلام میں خدا تعالیٰ کتنی عظمت و رفعت عطا کرتا ہے۔ کہ اموات کا لفظ اس کے لئے استعمال نہیں فرماتا۔ اور شہید وہ بھی کہلائے گا جو انجانے میں اچانک شہید کر دیا جائے اور اس کا مقصد اعلیٰ مذہب یا عقیدہ کی خاطر جان قربان کرنا ہو۔

مگر

وہ شخص عظمت کی بلندیوں کو آسمان تک جا چھوئے گا جس کو للکارا گیا ہو اور ہر للکار، ہر وار، ہر پکار اس کے لئے بے معنی ہو۔ وہ اپنے مقصد پر اٹل کھڑا ہو ایک لمحہ یا ایک قدم بھی اُسے اپنے مقصد اعلیٰ سے پرے نہ ہٹائے تو ایسا شخص شہادت کا معراج پانے والا ہو گا۔ کیونکہ اُسے مطلع کیا گیا ہو گا کہ آنے والی سرگھڑی اُس کی آخری گھڑی ہو گی۔ پھر بھی وہ آخری گھڑی میں ہی برکت تلاش کرنے لگے اس تلاش میں یقیناً قطعی یقیناً اُسے رضائے الٰہی نصیب ہو جائے گی وہ بے خوف و خطر آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ اپنی جان کے عوض خدا

کی مرضی خرید رہا ہے۔ سودا بہت مہنگا ہے۔ مگر کرنے والا بھی یکتا و بے مثال ہے۔ انعام الرحمان صاحب بھی ہر آنے والی گھڑی خطرات و دھمکیوں سے پُر دیکھتے تھے مگر سینے پر ہاتھ مار کر ہر خطرہ کو سامنے سے لبیک کہتے تھے وہ جانتے تھے کہ اپنے وجود سے بالکل محو و فنا ہو کر ہیں اپنے مولیٰ کریم کو پا سکتا ہوں اس لئے ہر قدم ان کا خوشنودیٔ مولیٰ کریم کے لئے اٹھتا تھا پھر ایک دن ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء وہ گھڑی آگئی جس کے لئے لمحہ لمحہ وہ آزمائے جاتے تھے۔ اور

میرے لوگو! ذرا غور تو کرو کہ فرشتے آسمان پر آج ایک بار پھر کتنا خوش ہوئے ہوں گے۔ ایک دن وہ بھی تھا کہ حضرت بلالؓ کا لوگ اَسْھَدُ پڑھنے پر مذاق اڑاتے تھے تمسخر کرتے تھے لیکن خدا تعالیٰ آسمان پر ہنس رہا تھا اور آج پھر ایک محبوب رسول اپنے اُبلتے ہوئے خون کے ساتھ اَشْھَدُ لکھ رہا تھا۔ انہوں نے کیا لکھا؟ کیسے لکھا؟ کتنا لکھا؟ یہ سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے نہم عبارت ادا کی جبکہ فرشتے منکر نکیر حاضر ہو چکے تھے زندگی اور شہادت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا کہ دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے مگر اس ایک لمحہ میں انہوں نے اسلام کی تصویر کشی کر دی اور یہی ان کی فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری تھی جو انہیں ہمیشہ کی زندگی دے گئی۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اور کلمۂ توحید کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے وہ سَو بار شہید ہوں گے اگر انہیں ۱۰۰ زندگیاں بھی پیش کی گئیں تو . . . . .

(حوالہ) انکی بیگم صاحبہ لکھتی ہیں کہ :-

"ڈاکٹر صاحب جب تک ہوش میں رہے انہوں نے اپنی انگلی اپنے خون میں ڈبو کر کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تک لکھا اور قاتلوں کے نام بھی لکھے۔"

(امۃ الحفیظ شوکت اہلیہ ڈاکٹر انعام الرحمنؒ)

بحوالہ الحزیک جدید ربوہ مئی ۱۹۸۵ء صفحہ نمبر ۵

جماعت احمدیہ سکھر کے ایک مخلص دوست مکرم انعام الرحمان صاحب انور ابن مکرم مولوی عبدالرحمان صاحب انورؓ مرحوم (سابق پرائیویٹ سیکرٹری) کو مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء کو سکھر میں قتل کر دیا گیا۔ اُن کی عمر ۴۹ سال تھی۔ وہ ناظم انصار اللہ ضلع سکھر و شکارپور کے عہدہ پر فائز تھے۔

مرحوم ۱۵ مارچ کو جمعہ کے روز نماز جمعہ سکھر کی بیت الاحمدیہ میں ادا کرنے کے بعد اپنی اہلیہ کے ہمراہ گوشت خریدنے کے لئے کورٹ مارکیٹ سکھر گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ باہر کھڑی تھیں کہ مارکیٹ کے اندر ۲ یا ۳ افراد نے ان پر حملہ کیا اور کاربین کا ایک فائر ان پر کیا۔ اور چاقوؤں سے ان پر حملہ کیا۔ مرحوم موقع پر ہی انتقال کر گئے۔

مرحوم کا جنازہ تھانے لے جایا گیا۔ اس کے بعد سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم ہوا۔ اگلے روز ۱۶ مارچ کو بذریعہ ویگن دن کے گیارہ بجے جنازہ ربوہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور اسی رات (۱۶ اور ۱۷ مارچ کی درمیانی رات) ڈیڑھ بجے جنازہ ربوہ پہنچا۔ ۱۷ مارچ کی صبح نماز فجر کے بعد بیت المبارک ربوہ میں محترم صوفی غلام محمد صاحب ناظر اعلیٰ ثانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مرحوم موصی تھے لیکن ان کو قبرستان نمبر ا میں امانتاً دفن کیا گیا۔ تدفین مکمل ہونے پر محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب ایڈیشنل ناظر اعلیٰ نے دعا کرائی۔

مرحوم انعام الرحمان صاحب ۱۴ جون ۱۹۳۶ء کو قادیان میں پیدا ہوئے۔ بوقت وفات گورنمنٹ اور ل ڈسپنسری گوٹھ عید و میں انچارج ہیلتھ انسپکٹر کے طور پر سرکاری ملازمت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مرحوم جمعہ پڑھنے سکھر آیا کرتے تھے۔ ان کی رہائش گوٹھ عید و میں ہی تھی۔ مرحوم نہایت پرہیزگار، نیک، متقی نماز روزہ

کے پابند تھے۔ ہر سال جلسہ سالانہ پر آیا کرتے تھے۔ اور جماعتی خدمات میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ مرحوم نے ۲۳ سال کی سرکاری نوکری کا عرصہ اندرونِ سندھ میں گزارا۔ اس سے قبل مرکز سلسلہ میں بھی ملازمت کرتے رہے تھے۔

مرحوم کے پسماندگان میں ان کی بیوی کے علاوہ ایک بیٹی عزیزہ امتہ النصیر اہلیہ فضل الرحمان صاحب مقیم ہمبرگ جرمنی ابن مکرم لطف الرحمان صاحب فضل عمر اسپتال اور ایک بیٹا عزیزم مکرم محمود الرحمان صاحب شامل ہیں۔

(بحوالہ تحریک جدید ربوہ ۵ رمئی ۱۹۸۵ء صفحہ ۵)

واقعاتِ شہادت

جناب انعام الرحمان صاحب انور (امتہ الحفیظ شوکت صاحبہ اہلیہ انعام الرحمان صاحب)

واقعات یوں ہوئے

واقعۂ شہادت

پہلا حملہ ! جمعہ کا دن تھا۔ اور فروری ۱۹۸۵ء تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے دوست نے دوپہر کے کھانے پر سکھر دعوت کی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ آپ پہلے جائیں میں اور محمودؔ جمعہ پڑھ کر بعد میں آجائیں گے۔ ہم جب ان کے گھر پہنچے تو تھوڑی دیر بعد محمود مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر آگیا۔ دونوں باپ بیٹا اکٹھے سکوٹر پر بیٹھے گوٹھ عبدو سے سکھر شہر جمعہ پڑھنے آئے تھے (گوٹھ عبدو سکھر سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے جہاں ڈاکٹر صاحب سرکاری ہیلتھ انسپکٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے اور ہماری رہائش بھی وہیں پر تھی) جب محمودؔ نمازِ جمعہ پڑھ کر آیا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا تو

میرے پوچھنے پر کہنے لگا کہ امی جان خیر نہیں ہے۔ ملاؤں نے ابو جان پر حملہ کروایا
ہے۔ مگر خدا نے بال بال بچا لیا ہے۔ جب دونوں باپ بیٹا گاؤں سے سکھر موٹر
سائیکل پر آ رہے تھے۔ تو تین دشمن لڑکے جو ۱۸/۲۰ سال کے لگ بھگ تھے۔
سڑک کے کنارے چھپے ہوئے تھے اور ان کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب
تقریباً اس وقت جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے وہاں سے گزریں گے۔ انہوں نے
سڑک کے کنارے درخت سے رسی کا ایک سرا باندھ کر سڑک کے دوسرے
کنارے دوسرا سرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ جب ڈاکٹر صاحب قریب آئے تو انہوں نے رسی
کھینچ لی تاکہ ان کو گرا کر ان پر حملہ کر دیا جائے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے موٹر سائیکل سنبھال
لیا۔ اور اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا اس پر ایک لڑکا قریب آیا۔ اور چار پانچ مرتبہ
کاربین چلایا۔ مگر کارتوس ہر مرتبہ مس کر گیا۔ اور نہ چلا۔ ان میں سے ایک لڑکا چادر تھامے
سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس میں کیا تھا۔ کلہاڑی یا خنجر۔
معلوم ہوتا تھا کہ ان کا پروگرام موٹر سائیکل سے گرا کر خنجر یا کلہاڑی سے حملہ کرنا تھا۔
مگر اس روز خدا نے محض اپنے فضل سے بچا لیا۔ اس واقعہ کے بعد دونوں باپ بیٹا
جمعہ پڑھنے بیت الذکر سکھر گئے۔ نماز جمعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹے سے
کہا کہ وہ اپنی امی جان کے پاس چلا جائے اور وہ مشورہ کر کے بعد میں پہنچ جائیں گے۔ بیٹے
کو بھیجنے کے بعد آپ نے مربی صاحب ضلع اور امیر صاحب ضلع سے ضروری مشورے
کئے۔ اور پھر ان غیر از جماعت دوست کے ہاں جہاں دعوت تھی تشریف لے آئے۔
میں سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ ان کو دیکھ کر رونے لگی۔ لیکن ان کے چہرے پر کوئی پریشانی
نہ تھی۔ جب میں نے واقعہ پوچھا تو ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ خدا نے نہ جانے کس
کے بدلے میری زندگی بخش دی ہے۔
جماعت کے مشورہ پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے ضلع کے میڈیکل آفیسر سے بات

کی تو آفیسر نے ایس پی سے بات کی۔ ایس پی نے متعلقہ تھانے سے انکوائری کروائی۔
اور تھانے والوں نے حملہ آور تینوں لڑکوں کو گرفتار کر لیا۔ اور حوالات میں بند کر دیا۔
جہاں وہ چند دن بند رہے۔ مگر ملاؤں نے ضمانت دے کر ان کو رہا کروا لیا۔ اس کے
بعد ڈاکٹر صاحب کے خلاف دشمنی اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور دشمنوں نے دھمکی آمیز خط لکھنے
شروع کر دیئے۔ کہ تمہارے گھر والوں کو اغوا کر لیں گے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حملہ اور واقعہ شہادت

یہ واقعہ ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء بروز جمعہ پیش آیا۔ ہم ہر جمعہ دس، گیارہ بجے گاؤں
سے سکھر نماز جمعہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ لیکن اس دن ڈاکٹر صاحب گوٹھ عبد و کے
مہر زمیندار محمد شفیع کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ میں نے جمعہ پڑھنے سکھر جانا
ہے۔ کوئی خطرہ تو نہیں؟ اس لئے کہ دشمنی حد سے زیادہ بڑھ جانے کی وجہ اس
سے پوچھنا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے کہا کہ آپ چلے جائیں۔ آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔"
کم از کم میری حدود میں کوئی خطرہ نہیں۔ اپنی حدود سے باہر کا میں ذمہ دار نہیں (یہ مہر
اندر ہی اندر ہمارا دشمن بھی نکلا) اس پر ڈاکٹر صاحب گھر آئے اور مجھے کہا کہ تیاری کریں
آج جمعہ پر جانا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ نے زمیندار مہر سے پوچھ لیا ہے کہ کوئی
خطرہ تو نہیں اس پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ زمیندار نے کہا کہ اس کی حدود میں کوئی
خطرہ نہیں۔ میں نے تیاری کی اور چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب
سے کہا کہ نوکر نے پینٹ شرٹ استری کر دی ہے۔ آپ پہن لیں۔ لیکن انھوں نے
پہننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اکثر پہنتے تھے اور کہا کہ آج میں شلوار قمیض پہن کر جمعہ
پڑھنے جاؤں گا۔ کیونکہ اس لباس میں نماز پڑھنے میں آسانی رہتی ہے۔ تیار ہو کر باہر
نکلے اور گھر کو تالا لگایا تو یاد آیا کہ پستول تو اندر بھول آئے ہیں۔ اور پھر تالا کھولا

اور پستول لے کر آئے اور دوبارہ تالا لگا دیا۔ جب ہم موٹر سائیکل پر سکھر جمعہ پڑھنے جا رہے تھے تو راستہ میں وہی دو لڑکے نظر آئے جنہوں نے پہلے حملہ کیا تھا۔ اس وقت میں بہت خوفزدہ سی ہو گئی۔ جب ہم سکھر نماز پڑھنے جا رہے تھے تو اس وقت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ موسم تو بہت اچھا ہے مگر طبیعت کیوں اداس ہے؟ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ پت جھڑ کی وجہ سے ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ جب سکھر پہنچے تو ایک لیٹر بکس کے سامنے موٹر سائیکل کھڑا کیا تو میں نے پوچھا کہ کس کو خط پوسٹ کرنا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ حضور پُر نور کو خط لکھا ہے اور دوسرا اپنی بیٹی کو (جرمنی) لکھا ہے۔ حضور والے خط میں میں نے حضور سے مشورہ لیا ہے کہ حضور حالات بہت خراب ہو گئے ہیں دشمنی بہت بڑھ گئی ہے۔ حضور مناسب مشورہ دیں۔ (شہادت کی خبر حضور پُر نور کو اسی دن مل گئی تھی۔ مگر یہ خط آٹھ دن بعد ملا تھا) نمازِ جمعہ سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کرامت النصیر کا جرمنی سے فون آنا ہے۔ اس لئے آپ نجم الحق صاحب ایڈووکیٹ کے گھر چلیں اور کہا کہ میں نے انصار اللہ کا اجلاس اٹینڈ کرنا ہے۔ آپ جائیں جب فون آئے تو مجھے اطلاع دے دینا۔ آپ تین اضلاع (سکھر، شکارپور، جیکب آباد) کے ناظم انصار اللہ تھے۔ اور اسی دن آپ نے ان کا اجلاس بلایا ہوا تھا۔ میں نے کافی دیر فون کا انتظار کیا۔ مگر نہ آیا۔ اور ادھر ڈاکٹر صاحب بھی اجلاس سے فارغ ہو کر آ گئے تھے۔ لہٰذا کافی دیر ہو چکی تھی اور شام کے پونے چار بج رہے تھے۔ اس لئے ہم وہاں سے چلے آئے۔ یہ سوچ کر کہ مخالفت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ مزید دیر کرنے کی گنجائش نہیں اور جلدی گھر پہنچ جائیں۔ ہمارا بیٹا محمود الرحمان انور بھی ساتھ تھا۔ اس کو بس پر گاؤں روانہ کر دیا اور ہم موٹر سائیکل پر بازار کو روانہ ہو گئے۔ تو راستہ میں بتانے لگے کہ میں نے ہفتہ (کل) چوہدری منیر صاحب ایس ڈی ایم اور چوہدری محمد حسین صاحب کو دوپہر

کھانے پر بلایا ہے۔ ہم شاپنگ کرنے گھنٹہ گھر پہنچے تو ایک بیکری کے سامنے موٹر سائیکل کھڑا کر دیا۔ اور مجھے کہنے لگے کہ آپ کل کے لئے اپنی پسند کے بسکٹ خرید لیں پیسے میں خود آکر ادا کر دوں گا۔ میں اخبار ڈان اور گوشت خرید کر ابھی آتا ہوں اور پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ بیکری سے اسٹول لاکر مجھے دے دیا کہ اس پر بیٹھ جائیں تو میں نے کہا کہ یہ اچھا لگے گا بازار میں اس پر بیٹھی ہوئی تو کہنے لگے کوئی بات نہیں ہیں بس ابھی آجاؤں گا۔ اور دو قدم چل کر واپس مڑ کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر پھر آگے بڑھ گئے اور کہہ رہے تھے کہ گھبرانا نہیں میں ابھی آجاؤں گا۔ سب سے پہلے انہوں نے دوکان سے ڈان اخبار خریدا جو اکثر وہ وہیں سے خریدتے تھے۔ اس کے بعد گوشت مارکیٹ سے گوشت خریدنے گئے۔ وہاں سے بکرے کا گوشت خریدا۔ اور جب جیب سے پیسے نکال کر دے رہے تھے تو دشمنوں نے پیچھے سے حملہ کر دیا اور پے در پے کئی وار خنجروں سے کئے۔ جو گردن، کمر، اور بازوؤں پر ہوئے۔ جبکہ سب سے پہلے کاربین سے کارتوس کا فائر کیا گیا تھا۔ اس واقعہ کے فوراً بعد ساری مارکیٹ بند ہو گئی۔ اور موقعہ پر موجود تمام لوگ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ میں بیکری کے پاس کھڑی ہوئی آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے اتنی دیر کیوں کر دی اور میرا سارا چہرہ پسینے سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ مارکیٹ جا کر خود پتہ کر دوں مگر یہ سوچ کر کہ ڈاکٹر صاحب یہ نہ کہیں کہ میں کتنی بزدل ہوں کہ پیچھے پیچھے دیکھنے چلی آئی۔ تو بیکری والے بابا کو بھیجنے کا خیال آیا۔ مگر اسی دوران ہی وہاں سے چند آدمی آپس میں باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے کہ مارکیٹ میں خون ہو گیا ہے۔ عبدو کا ایک مہر ہے۔ یہ سن کر میں چونکی اور پوچھا کہ بھائی وہ کون ہے۔ تو اس نے پوچھا تم کون ہو اور پھر مجھے بتایا کہ عبدو کا ایک مہر ہے اور اس کی جیب سے پہلے ایک حملہ کی F.I.R (ایف آئی آر) بھی نکلی ہے۔ یہ سن کر میری چیخ نکل گئی اور میں نے کہا کہ

وہ تو میرے میاں ہیں۔ اس پر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو اور مجھے سہارا دے کر مارکیٹ تک پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا تو وہ میرے ڈاکٹر صاحب تھے۔ گوشت اور نوٹ بکھرے پڑے تھے۔ آپ کا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ اور چہرہ ساکت اور ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کسی نے میرے ڈاکٹر صاحب کی کوئی مدد نہیں کی۔ یہ وہ مارکیٹ تھی جہاں رش اتنا ہوتا تھا کہ کندھے سے کندھا چلتا تھا۔ مگر اس وقت مارکیٹ ویران ہو گئی تھی۔ تاہم ایک سبزی والا قریب آیا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کو پہچان لیا اور کہنے لگا کہ یہ تو گوٹھ عبدو کا سرکاری ڈاکٹر ہے۔ جو مجھ سے سبزی خریدتا تھا۔ اور قادیانی ہے۔ اس نے رکشہ کرایا اور مجھے اس پر بٹھا کر احمدیہ مشن ہاؤس سیشن کورٹ روڈ لے گیا۔ مشن ہاؤس کے باہر حمید اللہ صاحب مربی سلسلہ کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے روتے اور چیختے ہوئے اپنے خون آلود ہاتھ مربی کے سامنے کئے۔ مجھ پر سکتہ تھا۔ اور برقعہ سر سے اُترا ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجھے پہچان نہ سکے تو سبزی والے نے بتایا کہ یہ گوٹھ عبدو کے ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہیں۔ مربی صاحب حیران ہو گئے کہ ڈاکٹر صاحب تو ابھی جمعہ پڑھ کر گئے ہیں اور مجھے سہارا دے کر اندر لے گئے۔ محمود الرحمان گوٹھ عبدو پہنچ چکے تھے۔ اس واقعہ کا علم نہ تھا۔ چند احمدی دوست عبدو گئے اور جب اُسے بتایا تو اُس نے بات ماننے سے انکار کر دیا کہ کوئی میرے ابّو کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ اور وہ لوگ اُسے بھی سکھر لے آئے۔

دوکاندار بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب جب تک ہوش میں رہے انہوں نے اپنی انگلی اپنے خون میں ڈبو ڈبو کر کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تک لکھا۔ اور قاتلوں کے نام بھی لکھے۔ وہ تین اشخاص کا گروہ تھا جن کا بعد میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ اس واقعہ میں مولویوں کو پولیس والوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔

نفقط

امت الحفیظ شوکت
اہلیہ ڈاکٹر انعام الرحمان انور (شہید سکھر) کوارٹر نمبر ۸ صدر انجمن احمدیہ ربوہ پوسٹ کوڈ نمبر
۳۵۴۶۰

ذاتی معلومات و معروف واقعات

۱۔ نام: ڈاکٹر انعام الرحمان انور صاحب (شہید راہِ مولیٰ سکھر)
۲۔ جائے پیدائش: قادیان (بھارت)
۳۔ پیدائشی احمدی
۴۔ ولدیت: حضرت مولوی عبدالرحمان صاحب انور

(i) ملازمت صدر انجمن احمدیہ، موصوف حضرت خلیفۃ المسیح الثانی والثالث ایدہ اللہ تعالیٰ کے پرائیویٹ واسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری کے طور پر عرصہ تقریباً ۲۰ سال خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ تحریک جدید کے ابتدائی ایام میں اس کے انچارج بھی رہے۔ درمیانی عرصہ میں مربی سلسلہ کے طور پر خدمات انجام دیں۔

(ii) قادیان، لاہور، احمد نگر، ربوہ (پہلے کوارٹر صدر انجمن، پھر قصر خلافت اور آخر پر دارالرحمت وسطی ربوہ)

(iii) ۱۔ لطف الرحمان صاحب شاکر (واقف زندگی) ۲۔ حلیمہ سعدیہ ۳۔ امینہ خالدہ ۴۔ احسان الرحمان انور ۵۔ نعیم الرحمٰن طارق ۶۔ حفیظ الرحمان انور ۷۔ حبیب الرحمان انور ۸۔ انیسہ فاضل ۹۔ سلیمہ جمیل۔

۵۔ حصولِ علم کا بہت شوق تھا۔ امتحانات ہمیشہ نمایاں نمبروں میں پاس کرتے رہے۔ خصوصاً مرکزی جماعتی امتحانات ۔

۶۔ مادری زبان پنجابی

۷۔ میڈیکل پروفیشن (گورنمنٹ ہیلتھ انسپکٹر)

۸۔ قرآن پاک سے بہت لگاؤ تھا۔ روزانہ قرآن پاک کی تلاوت ترجمہ کے ساتھ کرتے قرآن کریم باترجمہ جانتے تھے۔

۹۔ احادیث سے بہت لگاؤ تھا۔ گھر پہ اکثر سب کو احادیث کے حوالہ سے تربیت کرنے کی سعی کرتے ۔

۱۰۔ کتب حضرت مسیح موعود کا مطالعہ گھر پہ باقاعدہ کرتے

۱۱۔ شادی ۱۳ر جنوری ۱۹۶۲ء (امت الحفیظ شوکت)

۱۲۔ سید عبدالعزیز شاہ (سسر کا نام) اور ان کے بچے

(۱) محمد اکبر فضل (۲) مبارک احمد (۳) امت الرشید (۴) امت الحفیظ شوکت

۱۳۔ (۱) محمود الرحمان انور ۔ انٹرمیڈیٹ کے دوران ہی باپ کی شہادت کے باعث تعلیم چھوڑ کر ملک سے باہر چلے گئے تھے ۔

(۲) امت النصیر انور ۔ میٹرک

۱۴۔ ناظم مجلس انصار اللہ ضلع سکھر، شکارپور اور جیکب آباد

۱۵۔ جماعتی کاموں سے بہت لگاؤ تھا۔ کام بڑی لگن سے کرتے اور اس میں خوشی محسوس کرتے ۔

۱۶ ہر سال جلسہ سالانہ (ربوہ) پر کسی نہ کسی غیر از جماعت کو ہمیشہ ساتھ لانے کی کوشش کرتے اور ان کو مرکز کا بھرپور تعارف کرواتے ۔آپ سندھ میں جہاں (گوٹھ عیدو نزد سکھر) مقیم تھے قریب قریب کوئی احمدی نہ تھا۔ لوگوں نے

حالات خراب ہونے اور اس کے نتیجے میں خطرات سے آگاہ کیا تو آپ نے اس بات کو تسلیم کیا۔ مگر یہ کہہ کر علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ یہ علاقہ احمدیت سے خالی ہو جائے گا۔ جلسہ سالانہ ۱۹۸۳ء کے موقعہ پر ربوہ میں آپ کے سب بہن بھائیوں نے بھی سندھ چھوڑنے کو کہا تو آپ نے اس وقت بھی حامی نہ بھری اور کہنے لگے کہ شاید سندھ کی زمین میرا خون مانگتی ہے اور پھر سینہ پر ہاتھ مار کر کہنے لگے میں اس کے لئے تیار ہوں۔

اسباق محبّت کے زمانہ کو پڑھائے

خود ہو گئے وہ نخل ثمر بار محبت

ہاتھوں میں لئے کاسۂ دل آئے ہیں مولا

خالی نہ پھریں ترے طلب گارِ محبّت

جناب ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر

اکتوبر ۱۹۲۲ء تا ۱۹۸۵ء

ایک محترم شاعر نے کسی عظیم شخص کی عظمتوں کا جب ایک ہی شعر میں احاطہ کیا تو مجھے وہ شعر سنتے ہی ڈاکٹر عقیل شہید بن عبد القادر کی دن اور راتیں جو حیدر آباد میں گزرتی تھیں یاد آنے لگیں۔ ان چند حروف نے ان کے شب و روز کی تصدیق کی تو مجھے یقین سا ہونے لگا کہ بے شک اشعار بھی سرمایۂ کائنات ہوتے ہیں۔ اس وقت چونکہ میں اپنے کام کی نسبت سے چند حقیقتوں میں کھوگئی اس لئے وزن بھی صحیح یاد نہ رکھ سکی۔ مگر یہ شعر کام میرا آسان کرگیا۔ شعر کچھ اس طرح تھا۔

تپتی دھوپ میں انسانیت کے لئے سایہ تھا وہ شخص

بیشک ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر ظلمتوں، رنج و غم اور دکھوں کے آگے ایک فصیل تھا۔ انسانیت کو جب بھی اخلاقی پستیوں نے چھوا تو رفعتوں کی ڈھال بن کر عقیل بن عبد القادر سامنے آگئے اور جب بھی ظلمتوں اور اندھیروں نے آنکھوں کے نور کو ڈسا تو ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر نے اس نور کو واپس لانے کا چیلنج قبول کر لیا۔ یہ تھی اس کی عظمت اور یہ تھا اس کا سایہ جو انہوں نے سندھ کے غربار کو ہر لحظ عطا کیا۔ بیشک وہ انسانیت کے لئے ایک سایہ تھا جو سندھ کی تپتی دھوپ میں خود تپتا رہا لیکن لوگوں کو ٹھنڈک مہیا کرتا رہا۔

مگر

پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر شہید کی تراشیدہ راہوں کو
نئی نسل کے لئے سامنے لائیں۔ سب سے پہلے آپ کے شجرہ و نسب پر غور کریں.
تو ہمیں سہولت ہوگی۔ کیونکہ دیکھا ہی گیا ہے۔ جب بھی کسی شجر کی روٹس ہی دینی لحاظ
سے تناور ہوں تو شاخوں اور پھلوں پر خوب رنگ الوہیت چڑھ جاتا ہے۔ اسی
طرح ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر کے دادا مولانا عبدالماجد بھاگلپوری صاحب ایک
جید عالم دین تھے اور بڑے علماء میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ اور انہوں نے عبدالحیٔ
فرنگی علی لکھنوی کی شاگردی کا فیض بھی حاصل کیا تھا۔ اور وعظ کے سلسلہ میں ہی انجمن
اسلامیہ لاہور کے جلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں وہ اکثر و
بیشتر پنجاب کے عُلماء دین سے رابطہ رکھتے تھے۔ جہاں تک رابطہ کا تعلق ہے۔
یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ حضرت اقدس مسیح موعود مہدی معہود (آپ پر سلامتی
ہو) کے دور میں محمد حسین بٹالوی اپنے قیمتی اوقات ضائع کر کے عموماً بٹالہ اسٹیشن
پر کھڑا رہتا تھا تاآنکہ ہر حق کے متلاشی کو قادیان جانے سے روک سکے۔ وہ
اکثر لوگوں کو مسیح دوراں کے دیدار اور ملاقات سے منع کرتا تھا اور مکر و طبع پر
حاوی ہو جاتا تھا۔ کچھ اسی قسم کی مصدقہ خبر محترم مولوی عبدالماجد صاحب بھاگلپوری
بھی سناتے ہیں کہ ایک دفعہ بہار سے وہ نکلے اور عزم سفر قادیان تھا مگر جب
بٹالہ اسٹیشن پر پہنچے تو ان کی ملاقات مولوی محمد حسین صاحب سے ہوئی جنہوں نے
ہر ممکن کوشش کی کہ وہ قادیان نہ جاسکیں۔ اس وقت دادا جان کے ہمراہ مولوی
عبدالغفار اور مولوی محمد ابراہیم صاحب اروی بھی تھے جنہوں نے ان کو راضی کر لیا۔
کہ اب کی دفعہ واپس چلتے ہیں پھر آجائیں گے لیکن افسوس کہ دوبارہ آنا نصیب

نہ ہو سکا۔ اور دادا جان کو تمام عمر اس بات کا رنج اور قلق رہا گو انہوں نے دوبارہ واپس جا کر خط کے ذریعے بیعت کر لی لیکن اس غم کا ذکر اکثر آب دیدہ ہو کر دادا جان کیا کرتے تھے۔ مگر خدا کا فضل ہے کہ بعدہٗ خدا تعالیٰ نے ان کے درد کو قبول کر لیا اور انعام کے طور پر ان کی چھوٹی لڑکی سیدہ سائرہ بیگم کی شادی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ آپ پر راضی ہو) سے ہو گئی اور اس طرح خدا تعالیٰ نے ان کو نواز لیا۔"

ممچھر

ڈاکٹر عقیل صاحب کے والد محترم پروفیسر عبد القادر صاحب بھاگلپوری چونکہ دادا جان کی بڑی اولاد تھے۔ اس لئے انہیں بھی سفر و حضر میں تربیت و تعلیم کے تمام اصولوں کو مدِ نظر رکھنا پڑا۔ کما حقہٗ ان پر توجہ دی گئی اور تعلیم و تعلم میں وہ اس حد تک کوشاں رہے کہ ہمیشہ بیٹے کو اپنے ساتھ رکھتے۔ پروفیسر عبد القادر سناتے ہیں کہ ایک دفعہ دوران سفر ہاتھی کی پیٹھ پر ہی انہوں نے کتاب پوری ختم کرا دی۔ ہاتھی کی پیٹھ پر درس لینے والے سید عبد القادر صاحب کو جب نور کی کرن نصیب ہوئی تو خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ جب وہ نوازتا ہے تو مخالف طاقتیں بعض اوقات تبلیغ و تلاش حق کا کام کر جاتی ہیں۔ پروفیسر سید عبد القادر صاحب نے ۱۹۰۲ء میں بیعت کی تھی اور بعد میں اپریل ۱۹۰۳ء میں عازم قادیان ہوئے اور وہاں جا کر دستی بیعت کی وہ سناتے تھے کہ میرے والد محترم نے عبد اللہ ٹونکی کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے شاہی مسجد لاہور کے مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایک حجرہ میں رہائش اختیار کی دورانِ درس و تدریس عبد اللہ ٹونکی حضرت اقدس بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے متعلق بہت بدزبانی کیا کرتا تھا۔ یہاں مجھے جستجو پیدا ہوئی کہ کیا صورتِ حال ہے چنانچہ حقیقت کی تلاش کے لئے سید عبد القادر صاحب

نے خواجہ کمال الدین صاحب جو کہ ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے تھے رابطہ قائم کیا اور ان کے ذریعے قادیان پہنچے وہاں جا کر حضرت امام مہدی (آپ پر سلامتی ہو) سے شرف باریابی کا موقع نصیب ہوا۔ اور بعد میں حضور کے منشا کے مطابق باقی تعلیم حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل سے حاصل کی پھر مولوی فاضل پاس کیا۔ اور بعد میں علی گڑھ کالج سے ایم اے ہسٹری میں اول پوزیشن حاصل کر لی۔

الغرض ڈاکٹر سید عقیل بن عبدالقادر صاحب کے والدِ محترم وہ خوش نصیب انسان تھے کہ جنہیں حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی محبت و صحبت بھی حاصل ہوئی اور شرفِ شاگردی کے لئے بھی حضرت اقدس (آپ پر سلامتی ہو) نے حضرت خلیفۃ المسیح الاول مولانا مولوی نورالدین صاحب کو منتخب کیا۔ حضرت مولانا نورالدین کے شاگردِ رشید جب عملی زندگی میں داخل ہوئے تو ہر جا تنظیم، ایمان، سادگی، پختگی عہد اور فراست و بصیرت تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے سب سے بڑا مرحلہ جو تربیت اولاد ہے۔ حقیقت میں یہی TARGET ہے جس پر انسان کو اپنی صلاحیتوں کو کماحقہٗ استعمال کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سید عبدالقادر صاحب نے اپنی اولاد کو تعلیم و تعلم کے میدان میں کہاں تک اولیت دلائی۔

چنانچہ

اس کنبہ کے ۹ افراد تھے، ۵ بیٹے، دو بیٹیاں اور دو میاں بیوی۔ جو اپنی زندگی سکون و راحت سے ہندوستان میں گزار رہے تھے۔ مگر مقصد ان کا ایک ہی محور کے گرد گھومتا رہا کہ اولاد کو دین و دنیا میں امتیازی مقام حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عقیل صاحب کو دادا جان کی سرپرستی میں بیشتر حصہ تربیت کا میسر آ گیا۔ کیونکہ خود پروفیسر صاحب اپنی ملازمت کے سلسلہ میں

کبھی کٹک، کبھی الہ آباد وغیرہ رہا کرتے تھے۔

"ہمارے دادا جان کا زیادہ وقت مذہبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ اور وہ زمانہ مناظرہ اور مباحثہ کا تھا۔ زندگی کی غرض و غایت ہی احمدیت کی تعلیم و تبلیغ تھی۔"

زمانہ طفلی میں جب آنکھ کھلے تو ایک ایسے انسان کی صحبت میسر آئے جو اصول پرست ہو باقاعدگی اس کی زندگی کا قاعدہ ہو۔ جھوٹ سے اُسے نفرت ہو اور وقت کا زیاں اس کو سخت ناپسند ہو تو ہیرے کی تراش خراش والی مثال قطعی اور نہایت واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔ یہی حال ڈاکٹر سید عقیل بن عبدالقادر کا تھا۔ کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم قرآنِ مجید با ترجمہ اور دینی معلومات اپنی والدہ محترمہ سے گھر پر ہی حاصل کر لی تھی اور کلکتہ میں چھٹی کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ہی میٹرک پاس کی اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ یہ اس والدہ کی ہی تربیت کا نتیجہ تھا جو دینی تعلیمی زندگی میں یکے بعد دیگرے چھ مرتبہ اوّل پوزیشن حاصل کرتے رہے اور دس اشرفی ہر مہینہ وظیفہ بھی لیا کرتے تھے۔ جبکہ وہاں پر کلرک مذاق کیا کرتے تھے کہ" لوگ تو دے کر جاتے ہیں اب آپ لینے آجاتے ہو۔

ایسے باپ کا بیٹا جب ایم۔بی۔بی۔ایس کر کے عملی زندگی میں داخل ہو گا تو خدا کے فضل اور اطاعتِ والدین کی بناء پر اس کی زندگی کا ہر لمحہ کامیاب و کامران ہو گا۔

بحیثیت عورت مجھے والدہ صاحبہ کی محنت اور قربانی کے پہلو کو بھی دیکھنا چاہیئے کہ عقیل صاحب کی زندگی میں ان کا کتنا عمل دخل تھا۔ امامہ صاحبہ کہتی ہیں کہ ہماری" والدہ صاحبہ ہمارے والد محترم کی سگی پھوپھی زاد تھیں اور بفضل تعالیٰ دین کو دنیا پر مقدم رکھنے والی۔ صابرہ شاکرہ، صدقہ و خیرات میں ہمیشہ آگے آگے رہتیں۔ بچوں کو ہر وقت فرمانبرداری اور خوفِ خداوندی اور دینی باتوں کی ترغیب دلاتی رہتی

تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کاوشوں کا ثمر خدا تعالیٰ نے ان کو دو شہید بچوں کی صورت میں عطا کیا۔ الحمدللہ وہ بلاشبہ ایک متقی، پرہیزگار، محبت کا مجسمہ، خداترس خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔ محترمہ والدہ صاحبہ کی دی ہوئی بچپن کی تربیت ایک ایسا بنا بنایا سانچہ تھا جس میں ڈھل کر ہر بیٹا اپنی اپنی جگہ اعلیٰ صلاحیتیں اور مثالی اقدار لیئے ہوئے تھا۔ جناب محترم عباس شہید بھی دین کی تعلیم و تبلیغ میں اتنا جوش رکھتے تھے کہ ہمیشہ تبلیغی جلسے اجلاس منعقد کراتے رہتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے حقیقی معنوں میں داعیات۔ اکثر جب دعوت حق لے کر اُٹھتے ہیں تو عموماً مخالفین کا ایک حلقہ تیار ہو جاتا ہے۔ اور نتیجہ میں وہ شہادت پر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عباس شہید کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ اس طرح ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر بھی ہمیشہ دینی کتب کو زیرِ مطالعہ رکھتے اور حوالہ جات تیار کرتے تاکہ موقع پر اپنے مباحثہ میں وزنی دلائل دے سکیں۔ وہ ہمیشہ وزنی اور مدلل بات کرتے اور یہ دلیل اور وزن ہی ان کا آخری ہتھیار تھا جو مخالفین کو بے وزن کر جاتا تھا۔

عشق قرآن

عشق قرآن ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر نے ابتدائی تعلیم ایک ایسی عظیم ہستی سے پائی جو درد اور صبر کے ساتھ اپنے بیٹوں کی رگوں میں قرآن الحکیم کا نور اتارتی تھیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ماں قرآنِ حکیم کے نُور سے منوّر ہو تو وہ ایسی گہری اور پختہ روشنی اپنے بچوں کی رگوں میں تحلیل کرتی ہے کہ کوئی استاد اور حافظِ قرآن کم ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ماں کے پاس بچے کے لئے ایک درد ہوتا ہے۔ بشرطیکہ قرآن سے سچی محبت ہو اور مکمل طور پر ادراکِ قرآن حاصل ہو اور صبر کی طبیعت میں چاشنی ہو۔

پھر خدا کے فضل سے ماں سے بہتر کوئی مکتب تعلیم نہیں دے سکتا۔

ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر بچپن سے لے کر تا دمِ حیات قرآن مجید کی تلاوت سے اپنے دن کا آغاز کرتے تھے۔ اگر دو بجے رات بھی بستر پہ لیٹتے ہیں تو صبح کی نماز کے لئے بہر حال وقت پر اُٹھ جاتے تھے۔ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا ہو گا کہ تلاوتِ قرآنِ پاک کا ناغہ ہو۔ پھر قرآنِ پاک پر غور و تدبر ان کا شغل تھا۔ وہ ہمیشہ قرآنی علوم کو پڑھانے میں کوشاں رہتے وہ مخالفین کی کتب کا مطالعہ بھی ضرور کرتے اور خاطر خواہ جواب بھی ضرور دیتے۔ روزے بھی ہمیشہ پابندی سے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ مولیٰ کریم کے حضور بھی روزے کی حالت میں حاضر ہوئے۔

واقفِ زندگی

واقفِ زندگی زندگی کو خدا کی راہ میں وقف کر دینے والے ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر ہی اپنے لمحات، مہارت، وقت، مال اور مشورہ کو عوام کے لئے وقف کئے رکھا۔ ایم۔بی۔بی۔ایس۔ آر۔ایم۔پی۔ فزیشن اینڈ سرجری کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے مبارک مشورہ سے آنکھوں کے معالج کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ چونکہ آپ وقف تھے اس لئے اپنے آقا کی اطاعت میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی بنیادی فرمانبرداری اور اطاعت پر رکھی۔ خدا تعالیٰ نے اتنا فضل فرمایا کہ پاکستان میں ایسی مہارت کم ڈاکٹروں کو حاصل ہے۔ بہت دُور دُور سے لوگ بگڑے ہوئے کیس لے کر آتے اور ہمیشہ کامیاب اور منوّر واپس جاتے تھے۔ گو ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹر صاحب کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب کو وقف سے عارضی چھٹی لینی پڑی۔ مگر آپ کی جڑوں میں یعنی آپ کی طبیعت کے اندر ہی قربانی داخل ہو چکی تھی۔ اس لئے بموجب فرمانِ امام فرقان فورس میں شامل ہو گئے۔ اور کچھ عرصہ فرقان فورس میں خدمات سرانجام

دیتے رہے۔ بعد میں ربوہ آ گئے اور فضل عمر ہسپتال میں جو اس وقت ابتدائی مراحل میں تھا کام شروع کر دیا۔ اس عارضی رخصت وقف کے زمانہ میں بھی ملازمت کی۔ اور جناح ہسپتال میں ملازمت کے دوران ڈاکٹر صاحب کو مزید تعلیم جاری رکھنے کا شوق تھا۔ اور بنگال گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ بھی منظور ہو گیا تھا۔ مگر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے منشا کے مطابق اس وظیفے کو بروئے کار نہ لایا گیا کیونکہ وظیفہ کی صورت میں ایک بانڈ بھرنا پڑتا ہے جو ایک واقف کا کام نہیں۔ بہرطور آپ انگلینڈ گئے اور D.O کیا

مگر

حقوق العباد فرمانبردار بیٹا اور اطاعت شعار خادم وطن واپس آ گیا اور باپ کی خواہش کے مطابق خود کو سندھ کی سرزمین کے حوالے کر دیا۔ اس وقت ۵۵۔۱۹۵۴ء کا وقت تھا۔ اور لیاقت میڈیکل کالج کا ابتدائی دور تھا اور انہیں آنکھوں کے اسپیشلسٹ کی ضرورت تھی۔ تو اس طرح عقیل بن عبدالقادر نے اپنی خدمات سندھ کے لوگوں کے سپرد کر دیں اور پھر شیفلڈ ہسپتال سے منتقل ہو کر سرزمین ریگستان گرمی دگرد کے ٹیلے کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور ساری حیاتی یہاں بسر کر دی۔ دن اور رات کا فرق مٹا دینے والے ڈاکٹر صاحب کا شعار تھا کہ میرے مطب کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اور مجھے یاد ہے کہ اس بات پر اکثر ناراضگی کا اظہار کیا کہ احمدی احباب ہسپتال میں کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ وہ میرے پرائیویٹ پریکٹس کے وقت کیوں نہیں چیک کرانے۔ یہ ایک جذبہ عقیدت تھا۔ ورنہ کون اپنا وقت دیتا ہے اور مفت علاج کرتا ہے۔ وہ احمدیوں سے چیکنگ فیس کبھی نہیں لیا کرتے تھے۔ سندھ حیدرآباد میں ۳۰ سال کا عرصہ بڑی محنت اور صعوبت کا گزارا۔ ان کی احمدیت اور اصول پرستی کے باعث ایک طرف تو دوست احباب پیدا ہوئے اور دوسری

طرف مخالفتیں بھی ہوئیں۔ لیکن وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں
رضا کارانہ خدمات سرانجام دیں۔ جبکہ ایوب صاحب اور پھر بھٹو صاحب کے زمانہ
اقتدار میں ان کو ملازمت سے بھی علیحدہ کر دیا گیا۔ اور بالآخر حق کی فتح ہوتی ہے
اور وہ ہوئی۔ اور جب خدا تعالیٰ نے غلبہ عطا کیا تو خود حکومت کے ایک اہم کارندے
میر رسول بخش تالپور آپ کے گھر پر حاضر ہوئے اور اظہار افسوس کیا۔ اور اس طرح قدردانی
کی مثال قائم کی۔ اسی طرح طالب المولیٰ صاحب اور دیگر معززین سندھ نے آپ
کی بحالی کے لئے تگ و دو کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غرباء کا نقصان ڈاکٹر صاحب
کی علیحدگی سے ناقابلِ تلافی ہے۔ دوسری بار اسکریننگ کی گئی تو معززین شہر کا وفد
ڈاکٹر صاحب سے ملا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں میں
نے پریکٹس پر زیادہ توجہ شروع کر دی ہے اور مالی طور پر فائدہ میں ہوں۔ اس پر
لوگوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو نقصان نہیں ہے۔ مگر غریب لوگ جو آپ کی
مہارت سے فائدہ اُٹھاتے تھے ان کا نقصان ہو گیا ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے جواب
دیا کہ یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں یعنی سیاسی راہنماؤں نے بحالی
ملازمت کے لئے خود بھاگ دوڑ کی۔

گویا مخالفت برائے مخالفت بھی زوروں پر رہی۔ ثابت قدمی اور حق پرستی
بھی اپنے عروج پر رہی۔ احمدی اور خصوصاً داعی الی اللہ کے لئے بھی کٹھن راستے ہیں
جن پر ساری زندگی چلتا رہنا ہے۔ اور حق ایک دن اُن کا راستہ روشن کر دیتا ہے۔
اور منزل قریب تر آجاتی ہے۔ بداندیش اپنا کام کرتا ہے اور کلید کامیابی و لقاءِ الٰہی
شہید کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہ پگڈنڈیاں ہوتی ہیں جن پر وہ تمام زندگی چلتا رہتا ہے۔
اور آخر شاہراہ پر ایک دن آملتا ہے۔ کبھی اپنے بھائی عباس شہید سے اور کبھی
اپنے دوست بابو عبدالغفار شہید سے اور کبھی ڈاکٹر عبدالقدیر شہید اور کبھی ڈاکٹر انعام الرحمٰن

شہید سے۔ غرض کہ تمام شہداء ایک ہی منزل کے راہی ہوتے ہیں ان کی زندگی کے اوراق پلٹ پلٹ کر دیکھیں تو یہ گمان گزرتا ہے کہ اصولِ زندگی اور طرزِ زندگی میں سب یکجا ہیں کیونکہ تمام نفوس کے دل میں درد کی کسک ایک ہی ہے۔ حقوق العباد میں وہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ دشمنِ انسانیت کی آنکھ میں خار لگتے ہیں۔ حقوق العباد اور عوامی خدمت کے جذبہ کے متعلق ان کی ہمشیرہ لکھتی ہیں۔

"آنکھوں کے علاج میں بھائی صاحب کو اتنی مہارت تھی کہ اکثر بگڑے ہوئے کیس اُن کے پاس آتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو بڑی بصیرت عطا کی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انسانی محبت، ہمدردی، جانفشانی اور پوری لگن ان کے کام میں کامیابی کی ضمانت تھی۔ مختلف دیہاتوں میں اَن گنت کیمپ لگا کر مریضوں کا علاج اور آپریشن کرتے تھے۔ سندھ کے چپہ چپہ پر ان کے قدموں کے نشان۔ ان سے محبت کرنے والے ان کے علاج سے فائدہ اٹھانے والے ان کے لئے دُعاگو اور اُن کو یاد کرنے والے آج بھی موجود ہیں جو ان کو یاد کر کے روتے ہیں ان کی خدمتیں اس قدر تھیں کہ ہر شخص ان کا اسیر تھا۔ ان کا کوئی دشمن اور بُرا چاہنے والا نہیں تھا۔ خاص طور پر سندھ کی مقامی آبادی کے ساتھ ان کا بڑا واسطہ قائم تھا۔ اور یہاں کے غرباء کا علاج مفت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ غرض سندھ والوں کے لئے ان کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ اور یہی ایک واقفِ زندگی احمدی کا معراج ہے کہ وہ خدمتِ خلق میں امتیازی مقام رکھتا ہو۔

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

عشق رسولؐ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عشق کا جہاں تک تعلق ہے ایک متقی اور سچا احمدی آپ سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ خدائے قادر و توانا کا چہرہ دکھانے والا صرف وہی ایک وجود ہے اور آپ کا یہ ایک احسان عظیم ہے کہ مخلوق کو خدا تعالیٰ سے ملا دیا۔ لہٰذا ملانے والے بابرکت وجود کے احسان کے نتیجہ میں اس سے محبت لازمی ہے چنانچہ مومن تو دبخود محبت رسولؐ میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے جب ایک بندۂ خدا اپنے مولیٰ کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت و پیار کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اپنے خالق کی محبوب ہستی کو لامحالہ پیار کرنے لگ جاتا ہے۔ اور ان باریکیوں میں جانے کی بجائے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کی محبت کا سچا دعویدار حضرت محمد مصطفٰے سرور کائنات فخرِ موجودات احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں خود بخود مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیوں اور کیسے؟ اس طرح کہ اس عاشق صادق کا دل چاہتا ہے کہ میں سوؤں تو اس کو دیکھ کر جاگوں تو؟ اس پر نظر ہو۔ ہر کام جو بھی کروں وہ آپ کے فرمان کے مطابق ہو۔ اگر آپ نے فرمایا ہے کہ کھانا اس لئے نہ کھاؤ کہ تمہیں بھوک لگی ہے بلکہ اس لئے کھاؤ کہ نیکی کے کام کر سکو۔ اور پھر عقیل صاحب نے ایسا ہی کیا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے گھر اس لئے نہ جاؤ کہ اس نے بلایا ہے۔ بلکہ اس لئے جاؤ کہ رسولِ خدا نے دعوت قبول کرنے میں شرف نعمت کو مدِ نظر رکھا ہے اور قبول کرنے کا ارشاد فرمایا ہے تو ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر نے اسی بات کو ہی ترجیح دی ہے۔ والدین کی اطاعت اس لئے کرو کہ پیارے خدا کا فرمان ہے۔ اور تمہارے رسولِ خداؐ کا احسان

ہے کہ آپ نے واضح حدیثوں سے والدین کے مقام رفعت کی نشاندہی فرمائی ہے وعلیٰ ھذا القیاس والدین کی محبت اور فرمانبرداری میں بھی ایک مثالی مقام رکھتے تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو حد درجہ خدر جان خیال کرتے اور کبھی کسی موقعہ پر یہ تن آسانی نہ کرتے کہ والدین کے حقوق سے کوتاہی کر جائیں۔ جب ڈاکٹر صاحب اپنے پیشہ میں

SPECIALIZATION

کے لئے انگلستان گئے تو D.O کرنے کے بعد آپ کو انھوں نے وہیں ملازمت دے دی اور آپ خواہشمند تھے کہ F.R.C.S پورا کرلیں۔ مگر عبد القادر صاحب نے لیاقت میڈیکل کالج میں آپ کے لئے کوشش کر کے ملازمت حاصل کر لی اور اس طرح ڈاکٹر صاحب کو اپنی تمام تر خواہشات اور امیدیں ختم کر کے والدین کی خاطر وطن مراجعت کرنی پڑی۔

آپ نے شفلیڈ ہسپتال سے کام چھوڑا تو انھوں نے باقاعدہ لکھ کر دیا تھا کہ آپ جب بھی واپس آئیں گے ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب نے تمام سختیوں اور مخالفتوں کے باوجود اپنا عہد قائم رکھا اور والدین کا ساتھ نہ چھوڑا وہ کہا کرتے تھے کہ خداتعالیٰ کا فرمان ہے

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ (۲۵/ بنی اسرائیل)

وہ کہتے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے والدین کو اپنے زیرسایہ رکھو جیسا کہ بچپن میں انھوں نے ہمیں رکھا تھا۔

"بیشک والدین کے لئے بھائی صاحب کی ذات سراپا خدمت عاجزی اور محبت تھی۔ ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی کہ اپنے ہاتھ سے ہی ان کی خدمت کریں چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اگر والدین کریں تو ان کو گراں گزرتا تھا۔ کھانے پینے رہنے سہنے میں

ہمیشہ اپنی ذات پر تکلیف اٹھایا کرتے تھے۔ انکساری ان کا شعار تھا۔ مہمان نوازی میں ہمیشہ پیش پیش رہتے۔ کوئی بھی ان کے گھر چلا جائے۔ بغیر کھلائے پلائے ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ عزیز رشتہ داروں سے بھی محبت کا سلوک رکھتے تھے۔ بھائی بہنوں کے لئے تو ان کا وجود گھنا پھل دار درخت تھا۔ ہمیشہ محبت کے ساتھ دکھ درد میں ہمارے کام آتے۔ اگر نصف شب کو بھی کوئی ان کے پاس چلا جاتا تو کھلے بازوؤں سے خوش آمدید کہتے اور ہر ممکن تعاون کرتے تھے۔ دوست احباب کے لئے ان کا سینہ کشادہ تھا۔ بے دھڑک ان کے پاس جاتے خدمت سے فائدہ اٹھاتے اور بھائی صاحب کی خوشی اسی میں ہوتی کہ خواہ ان کی جان پر کتنی ہی بے آرامی کیوں نہ ہو۔ بس بزرگوں کی صحبت سے محبت کرنے والا وجود ہمیشہ ہی مدنظر رکھتا کہ میرے پیارے محبوبؐ کا فرمان کہیں نظر انداز نہ ہو جائے۔ ہر وقت یہ کوشش کرتے کہ والدین اور بزرگوں کی خدمت سے راحت کے علاوہ تعلیم و تعلم میں بھی مدد لی جائے۔ کچھ نہ کچھ اُن سے سیکھنے کی کوشش کرتے رہتے اور ہر کام حتیٰ الوسع فرمانِ نبویؐ کے مطابق ہی سرانجام دیتے۔ ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر کی محبت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے کچھ ایسے ہی عشق کے اصولوں پر مبنی تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے پیارے محمدؐ کا نام کوئی شخص (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لکھے بغیر لکھ دے۔ انتہائی مصروفیت میں بھی جب کوئی شخص اپنا نسخہ یا پرچہ لاتا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کی اصلاح کئے بغیر پرچے کو آگے نہ پڑھتے ہمیشہ نسخہ پکڑتے ہی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تحریر فرماتے۔ اگر نسخہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام درج ہوتا۔

اطاعتِ امام

اطاعتِ امام | خلافت سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ سیکھنے کے دور سے لے کر سکھانے کے ایام تک ہمیشہ خلیفہ وقت کے ارشاد کو اولین جگہ دی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں پٹنہ کالج سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور بنگال گورنمنٹ سے وظیفہ منظور ہو جانے کے باوجود بھی خلیفہ وقت حضرت مصلح موعود کے ارشاد پر مزید تعلیم حاصل نہ کی جبکہ تعلیم میں اسپشلسٹ ہونے کا آپ کو بہت شوق تھا۔ مگر اس شوق کے آگے اطاعت کا شوق بلند درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح برصغیر کی تقسیم کے بعد فرقان فورس میں کام کیا، اور پھر فضل عمر ہسپتال میں جو ابتدائی مراحل میں تھا۔ از خود جانفشانی سے خدمات سرانجام دیں۔ ربوہ رہائش کے دوران ہی شادی ہوئی۔ چونکہ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے انتہائی عشق تھا۔ اس لئے کوئی بات اگر کسی سے نہ مانتے ہوں تو خلیفہ وقت کے حکم پر فوراً تسلیم کر لیتے۔ اور ایک لمحہ کے لئے پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ باوجود مخالفتوں کے وہ بے دھڑک تبلیغ کرتے تھے۔ دنیاوی نقصان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمیشہ حق کا ساتھ دیتے تھے۔ مظلوم کی حمایت کرتے۔ غلط بیانی اور حیلے بہانے ان کو سخت ناپسند تھے۔ اور بے اصول زندگی پر انتہائی طور پر برافروختہ ہوتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں اپنی خدمات بعد از ریٹائرمنٹ پیش کر کے بے حد مطمئن تھے اور سلسلہ کے کاموں میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اور اکثر جلسہ اور مشاورت میں حصہ لینے کی کوشش کرتے تھے۔ اور ضمناً ایک بات جو مجھے پسند آئی اور بے حد پسند آئی وہ آپ کا ایثار قربانی تھا۔ آپ نے سادگی میں اطاعت خلیفہ کو اس درجہ اپنایا کہ اپنے بیٹے کی شادی

کی تقریب دارالذکر حیدر آباد میں کی اور دلہا صاحب اور محترمہ دلہن صاحبہ نمازیوں میں شامل تھے۔ خاص و عام سب کو کھانا تقسیم ہوا اور صلوٰۃ کے علاوہ طعام پر بھی ایک دفعہ پھر محمود و ایاز کا سماں دیکھنے میں آیا۔ بے حد سکون ہوا۔

خلافت سے وابستگی اور اطاعتِ امام کے بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے یہاں تک فرمایا ہے کہ دعا کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہا جائے۔ کامل اطاعت کا حق ادا نہ کرنے والے کے حق میں خلیفۂ وقت کی دعا بھی قبول نہیں ہوگی۔"

اس طرح خلافت کی اطاعت و برکات کے بارے میں حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب فرماتے ہیں۔

"میں بتانا چاہتا ہوں کہ خلافت سب سے بڑا انعام ہے۔ اور ہم نے اس کا ۱۹۰۵ء سے لے کر اب تک مسلسل تجربہ کیا ہے۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ بات محسوس کرتا ہوں کہ یہ خلافت رابع بھی انتہائی اہم ہے۔ انتہائی غلبہ اور انتہائی ترقیات کا دور ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں ہی ہم نے یہ ایک بڑی تبدیلی دیکھی ہے اور ایک نیا دور دیکھا ہے۔ اور ہم کو خلافت پر نیا ایمان حاصل ہوا ہے۔ پس میں آخری نصیحت کرتا ہوں کہ خلیفہ وقت سے پوری کوشش کے ساتھ مسلسل رابطہ کریں اور اس رابطہ سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ وقت جس بات کی تحریک کریں جو تقریر یا خطبہ ارشاد فرمائیں اس کو غور سے پڑھیں اور ہر وہ بات جو خلیفۂ وقت کے منہ سے نکلتی ہے۔ اس کا کامل علم حاصل کریں۔ کیونکہ عمل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے علم حاصل ہو جب تقاضوں کا علم ہی نہیں ہوگا تو انسان ان تقاضوں کو کیسے پورا کرے گا۔"

(انصار اللہ صفحہ ۶ دسمبر ۱۹۸۳ء)

حضور امام وقت کے جذبات محبّت عقیدت

برموقع شہادت ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر

فرمایا :-

"گزشتہ کچھ عرصہ سے یہ ظلم وستم کا رُخ سندھ کی طرف پھیر دیا ہوا ہے اور اُسے خاص طور پر علماء وقت نے منتخب کرلیا ہے احمدیوں پر مظالم کے لئے اور نواب شاہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور بعض مولوی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہم ضامن ہیں تمہیں جنت کی خوشخبریاں دیتے ہیں اور ایسی ناپاک باتیں ان کے دماغ سوچتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم ذمّہ داری لیتے ہیں کہ جب تم قیامت کے دن پیش ہوگے (نعوذ باللہ) محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم تمہارے استقبال کے لئے جنّت کے دروازے تک پہنچیں گے کہ تم نے ایک مرزائی کو قتل کردیا۔ یہ ان کا علم ہے۔ یہ ان کی غیرت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے۔ یہ مقام مصطفٰے ہے جو اُن کے ذہنوں نے ایجاد کر رکھا ہے۔ کوئی بھی تعلق ان کو محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم سے نہیں ہے۔ ان کو تصور تک نہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کیا ذات تھے۔ کیسا پاک وجود تھا۔ کیسی رحمت تھے بنی نوع انسان کے لئے اپنوں کے لئے اور غیروں کے لئے۔ نور کا ایک جاری سوتہ تھا نہ خشک ہونے والا۔ ہمیشہ ہمیش کے لئے جاری رہنے والا۔ کل عالم کو سیراب کرنے کے بعد بھی خشک نہ ہونے والا۔ ایک ایسی سلسبیل تھی جو خدا کی طرف سے نازل فرمائی گئی تھی۔ ایسی کوثر تھی جو رحمتوں کا پیغام لے کر ساری دنیا کے لئے ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ہمیش کے لئے جاری رہنے کی خوشخبری دی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی طرف منسوب ہوکر یہ ظالم اس ظلم کی تعلیم

سے باز نہیں آ رہے اور ابھی حیدر آباد سے ہمارے ایک بہت ہی بزرگ اور معزز بھائی عقیل بن عبد القادر کی شہادت کی اطلاع ملی ہے۔ ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر بہت ہی اعلیٰ صفاتِ حسنہ سے متصف تھے۔ بارہا انہوں نے غرباء کے لئے آنکھوں کے مفت علاج کے لئے کیمپ لگائے۔ غریب آدمی جو آتا تھا اُس سے فیس لینے کا تو سوال ہی کوئی نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں نے بکثرت مجھے یہ بتایا کہ ان کی غربت کی وجہ سے اپنے پاس سے خرچ کرتے تھے اور ان کے بچوں کے لئے اخراجات دیا کرتے تھے۔ نہایت بےنفس بے لوث انسان تھے۔ اپنوں کی بھی خدمت کی اور غیروں کے بھی دل موہے۔ اور کوئی جزا نہیں چاہی کسی سے کبھی۔ یکطرفہ احسان کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ ان کو بھی ظالمانہ طریق پر چند دن ہوئے شہید کر دیا گیا۔ یہ جو شہادتیں ہیں۔ ان شہادتوں کے نتیجہ میں وہ پاکیزہ لوگ وہ پیارے وجود پاکستان سے رخصت ہو رہے ہیں۔ جو دراصل پاکستان کی بقا کے ذمہ دار ہیں۔ ایسے وجود ہیں جن پر نظر پڑتی ہے **خدا کی رحمت کی تو باقی لوگ بھی بخشے** جاتے ہیں۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع)

مجلس خدام الاحمدیہ کے ممبران عاملہ نے گل ہائے عقیدت یوں نچھاور کئے

ان محبت بھرے جذبات کا نقشہ

قرار داد تعزیت

خوش نصیب ہے وہ شخص کہ جسے راہ مولیٰ میں جان دینے کی سعادت نصیب ہو کیونکہ وہ جان کا نذرانہ دے کر قرب الٰہی کی منازل طے کر کے شہید جیسی شیریں رضا کی جنتوں سے لذت یاب ہوتا ہے۔ بادی النظر میں اس کو عارضی فوائد سے محروم کیا جاتا ہے۔ لیکن بصیرت کی آنکھ اس کے تابناک مستقبل کو دیکھ رہی ہوتی ہے اور خدائے ذوالجلال والاکرام کی ابدی مہمان نوازی کا مشاہدہ کر رہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی ہمارے ایک بہت ہی پیارے خوش قسمت دوست محترم ڈاکٹر عقیل صاحب ہیں جنہیں ۹ جون ۱۹۸۵ء بوقت ساڑھے گیارہ بجے ان کے گھر کے قریب چاقو کے پے در پے وار کر کے ابدی نیند سلا دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

محترم ڈاکٹر عقیل صاحب مرحوم کا تعلق صوبہ بہار کے ایک ادبی خاندان سے تھا۔ آپ کے والد محترم ابوالفتح عبدالقادر صاحب مرحوم پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ اور محترمہ حضرت سارہ بیگم صاحبہ حرم حضرت مصلح موعود کے برادر اکبر تھے بحیثیت ماہر امراض چشم محترم عقیل صاحب مرحوم کی اس ملک کے لئے خدمات قابل تحسین تھیں۔ پریکٹس کے ابتدائی ایام فوج میں گزارے لیکن بعد ازاں سول ہسپتال حیدرآباد میں مستقل

ملازمت اختیار کرلی ۔ نیز لیاقت میڈیکل کالج میں لبطور پروفیسر بھی کام کرتے رہے۔
صوبہ سندھ میں اکثر ڈاکٹر ماہرین چشم آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں ریٹائر
ہوکر آپ اپنے گھر کے معالج میں مریضوں کو دیکھتے تھے ۔ ہمدردی کے جذبہ سے
سرشار تھے۔ فری آئی کیمپ اکثر لگاتے رہتے۔ غریبوں اور نادار مریضوں کا مفت
علاج کرتے ۔ بلکہ مالی مدد بھی فرماتے ۔ آپ نہایت منکسر المزاج، جوشیلے داعی
الی اللہ اور سلسلہ کا درد رکھنے والے وجود تھے۔ بڑے دعا گو، مخلص اور بے نفس
انسان تھے۔ بوقت وفات اپنے حلقہ کے صدر بھی تھے۔ ہم ممبران مجلس خدام الاحمدیہ
مرکزیہ اس سانحہ عظیم پر حضور، محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اہلیہ محترمہ، دونوں صاحبزادگان
اور صاحبزادی کے ساتھ گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
آپ کی اس قربانی کو قبول فرماتے ہوئے آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔
اور آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق سے نوازے ۔ آمین

ہم ہیں ممبران عاملہ
مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ

کبھی ذکرِ عقیلِ حیدر آباد اِن پر ملتا ہے
کہیں نوابشاہ کا دکھ بھرا افسانہ آتا ہے

ایک نظر میں

اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جون ۱۹۸۵ء تک

نام	ڈاکٹر سید عقیل بن عبد القادر
بیعت	پیدائشی احمدی
تعلیم	ایم بی بی ۔ ایس ۔ آر ۔ ایم ۔ پی ۔ ڈی ۔ ڈی
ریٹائرڈ	سنہ ۱۹۸۲ء (آئی اسپیشلسٹ)
مقام شہادت	حیدر آباد
عہدہ بروقت شہادت	صدر حلقہ ہیرا آباد حیدر آباد سندھ
آلہ قتل	چھری نیزہ نما
لواحقین	بیوہ ، ۲ صاحبزادے ، ایک صاحبزادی
تدفین	بہشتی مقبرہ ربوہ
شمائل	قرآن پاک سے حقیقی عشق تھا ۔ کتب مسیح موعود کا مطالعہ ان کا شغف تھا ۔ ہمدرد ، والدین کے فرمانبردار تھے ۔ غریبوں کا مفت علاج کرتا ، سنجیدہ و پختہ ذہن ، باوقار شخصیت ، بدعات سے قطعی پرہیز ، قول سدید پر قائم تھے ۔ وابستگی جماعت میں اعلیٰ معیار رکھتے تھے ۔ بحیثیت داعی الی اللہ ہمیشہ ہر میدان میں بے دھڑک داخل ہوتے تھے ۔ امام وقت کی سچی اطاعت ان کا جزو ایمان تھا ۔

محترم جناب قمرالحق صاحب شہید

۱۹۲۶ء سے ۱۹۸۶ء تک

"اے احمدی! اُٹھ اپنوں سے بھی اسلام کے لئے لڑ اور غیروں سے بھی اسلام کی خاطر لڑ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ہر تیر جو تیری طرف چلایا جاتا ہے اُسے خوشی سے قبول کر کہ اس سے بہتر کوئی موت نہیں ہے جو میرے آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں آئے۔" .....

جناب سید قمرالحق صاحب نے اپنے محبوب خلیفۃ المسیح الرابع کے ۲۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کے افتتاحی خطاب کے مطابق اپنا اختتام قبول کرکے موت کو بخوشی گلے لگالیا اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو مرنے نہ دیا۔ آج آپ نے فرمایا تھا "اسلام کے نام پر ہر موت کو قبول کرلیں لیکن محمد مصطفےٰ کے دین کو مرنے نہ دیں۔ نہ مرنے دیں، نہ مرنے دیں۔ خدا آپ کے ساتھ ہو۔ خدا آپ کے ساتھ ہو۔"

خدا تعالےٰ نے قمرالحق شہید کا ساتھ دیا۔ اور ایک استاد کو جو پر امن مبلغ مولیٰ ہوتا ہے۔ قلم کا مجاہد ہوتا ہے۔ اور آشتی و امن اس کا پیغام ہوتا ہے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر شہادتوں کی بلندیوں تک لے گیا۔ اور اس سے بڑا انعام فی زمانہ کیا ہو سکتا ہے کہ قمرالحق ایک ٹیچر ہیں جو صبح ساڑھے سات بجے اپنے ڈیوٹی پر چلے جاتے ہیں اور ننھے ننھے پھولوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ انہیں نیکی و بدی کا فرق بتاتے ہیں۔

انہیں زمین و آسمان کی پیدائش کی غرض و غائیت سمجھاتے ہیں۔ اور حساب و جغرافیہ پڑھاتے ہیں۔ اپنے فرائض کی واپسی پر گھر میں ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور معاشی ناہموار یاں کو پورا کرنے کے لئے اکثر شام کو بھی پڑھانے چلے جاتے ہیں۔ گویا ان کا اوڑھنا بچھونا تعلیم و تعلم ہی ہے۔

لیکن جب خدا تعالیٰ کسی کا ساتھ دے اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنا چاہے تو اس سے بڑے بڑے کام لے لیا کرتا ہے اور انعام بھی اپنی عظمت و بزرگی کے مطابق ہی عطا کرتا ہے۔ یہ اس کی شان ہے کہ قمر الحق صاحب جن کے پڑدادا نے ۱۸۹۴ء میں یہ نشاندہی کی تھی کہ اُن کا پوتا امام مہدی کو مانے گا۔ صحیح معنوں میں ۱۹۸۶ء میں یہ نشاندہی اپنی سچائی کو پہنچ گئی۔

چونکہ

حدیث شریف میں یہ وضاحت سے درج ہے کہ ہمارے مہدی کی یہ علامت درج ہے کہ ان کے زمانے میں چاند کو اس کے گرہن کی تاریخوں میں پہلی تاریخ میں گرہن لگے گا اور اُسی مہینے کے آخر میں سورج کو اس کے گرہن کی تاریخوں میں سے درمیان کی تاریخ میں گرہن لگے گا اور جب سے زمین و آسمان پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے نشانات اور کسی مدعی کے لئے ظاہر نہیں ہوئے۔ گویا اس نشان کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں۔

اول:۔ ایک مدعیٔ مہدیت پہلے سے موجود ہو۔

دوم:۔ رمضان کا مہینہ ہو۔

سوم:۔ اس مہینے کی تیرہویں تاریخ کو (کیونکہ چاند کے گرہن کے لئے یہی پہلی تاریخ ہے) چاند کو گرہن لگے گا۔

چہارم : اسی مہینے کی اٹھائیسویں تاریخ کو (کیونکہ سورج کے گرہن کے لئے یہی درمیانی تاریخ ہے) سورج کو گرہن لگے گا۔ گویا کہ سورج اور چاند کے معین اوقات اور معین تاریخ بتادی گئی۔

پنجم : مدعی مہدویت کا شریعت محمدیہ کے تابع ہونا جس کی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُسے "مہدینا" کے پیارے الفاظ سے یاد فرماتے ہیں، ضروری ہے

ششم : عوام و خواص کا اِس مدعیٔ مہدویت سے سورج گرہن کے نشان کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔

ہفتم : مدعی مہدویت کا سورج اور چاند گرہن کے نشان کو اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرنا یہ ساری وہ باتیں ہیں جن کی یکجائی کا وقوع پذیر ہونا سوائے اللہ کے خاص تصرف کے ہرگز ممکن نہیں۔

چنانچہ

ان شرائط کے ساتھ یہ نشان ایک عظیم الشان نشان قرار پاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ۱۸۹۴ء کے رمضان میں عین انہی شرائط کے ساتھ چاند اور سورج کو گرہن لگا اور حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) نے تحدی کے ساتھ اس دعویٰ کو پیش کیا کہ ان سات شرائط کے ساتھ یہ نشان اس سے پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوا اور آپ نے اپنے مخالفوں کو چیلنج دیا کہ اگر ایسا نشان پہلے کبھی گزرا ہے تو اس کی مثال پیش کرو۔ مگر کوئی شخص اس کی مثال پیش نہیں کرسکا۔

پھر اس نشان کی طرف قرآن شریف نے بھی سورۃ قیامت میں اشارہ کیا ہے کہ آخری زمانے میں چاند سورج کو خاص حالات میں گرہن لگے گا اور انجیل میں بھی

حضرت مسیح ناصری اپنی دوسری آمد کا ذکر کرتے ہوئے اس نشان کو پیش کرتے ہیں کہ اس وقت چاند و سورج تاریک ہو جائیں گے ۔ (متی باب ۲۴)

پس

وضاحت بعض باتیں بے موقعہ ہو جاتیں ہیں مگر بے وجہ نہیں ہوتیں مثلاً اس جگہ موقع نہیں ہے کہ میں کسوف و خسوف کا ذکر کروں مگر وجہ ضرور ہے اور وجہ یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ ہر اس چیز کو سامنے لائے جو اس کے پیارے کی صداقت کا سبب بنی تھی۔ ہر وہ حقیقت جو نکھر کر سامنے آئی تھی۔ کیونکہ اپنی نسل اور اپنے بچوں کو ذہن نشین نہ کرادی جائے۔ کیونکہ یہی تو زمینی و آسمانی حقیقتیں تھیں جنہوں نے بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی گواہی دی تھی ۔ دراصل میں کسوف و خسوف کی تشریح و تفصیل میں اس لئے داخل ہوئی ہوں کہ یہ وضاحت کر دوں کہ قمر الحق صاحب کے پڑدادا کو بموجب حدیث شریف مہدی کا انتظار تھا ۔ وہ بے چینی سے پیشگوئی کسوف و خسوف کا انتظار کرتے تھے اور جب گرہن (چاند و سورج) کا ایک ہی ماہ میں وقوع پذیر ہوا تو وہ فکر مند ہوئے کہ یہی زمانہ ؟ ور مہدی ہے آپ کے یقین کے مطابق انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ۱۸۹۴ء بمطابق ۱۳۱۱ھ رمضان کے مہینہ میں چاند و سورج کو گرہن لگ گیا ہے اور یہ خصوصیت ہے کہ متعین تاریخوں میں یہ گرہن لگا ہے اور چونکہ حدیث شریف میں مہدی کی علامت یہی بتائی گئی ہے ۔ اس لئے مہدویت کا مدعی کہیں نہ کہیں ظاہر ہو گیا ہو گا۔ تم لوگ پتہ تو کرو کہ ان کا ظہور کہاں ہوا ہے ۔ ظہور کا وقت تو بموجب پیشگوئی یہی ہے ۔ جگہ کونسی ہے ؟ تم مجھے پتہ کر دو تاکہ میں اُسے جا کر مان لوں اور

مہدی علیہ السلام کے قدموں میں حاضر ہو جاؤں ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اظہار کیا کہ اگر میں زندہ نہ رہوں تو میرا یہ پوتا (جس کی عمر اس وقت چھ ماہ تھی) ہاتھوں میں اٹھا کر بڑی تہدی سے فرمایا کہ ضرور بہ ضرور مان لے گا۔ محترم کے دل میں حق شناسی کی تڑپ تھی اور اس تڑپ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ اپنے پھول وپھل (چھ ماہ کے پوتے) کے لئے بحضور خالقِ کل دُعا کر گئے کہ وہ مہدویت پر فدا ہونے والا ہو گا۔ اُن کے اس پوتے نے حق کی آواز کو دل و جان سے مانا۔ اور یہی پوتا سید عبد الہادی صاحب نے اپنے بچوں کی تربیت اس رنگ میں کی کہ آپ کے دو بیٹے سید نجم الحق صاحب اور سید قمر الحق صاحب دین کی راہ میں مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ گو کہ سید نجم الحق صاحب بفضلِ ایزدی زندہ سلامت ہیں مگر اپنے داہنے ہاتھ کی محرومی سے ایک زندہ نشان بن گئے ہیں ۔ وہ اس وقت کا انتظار کر رہے کہ کب دوسرا ہاتھ راہ حق میں کام آئے گا ۔

۱۰۰

سیّد عبد الہادی صاحب آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ کے دونوں بیٹے خدمتِ دین کے لئے میدانِ آزمائش میں اتارے گئے تھے۔ سید قمر الحق صاحب شہید اور سید نجم الحق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ دونوں بھائیوں کو آزمائش کے لئے دنیا نے اپنا ہدف بنایا اور مختلف مواقع پر حملے کئے۔ خدا تعالیٰ نے نجم الحق کو معجزانہ طور پر نئی زندگی عطا کی وگرنہ وہ بہت زیادہ زخمی ہوئے تھے اور حالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ مگر خدا تعالیٰ نے سلامتی عطا کر دی گو زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن کسی باپ کے اخلاص و نیک تربیت کا یہ بات ثبوت ہوا کرتی ہے کہ اس کے دو بیٹے خدمت دین کے لئے سینہ سپر ہوں اور داعی الی

اللہ کے طور پر میدانِ تبلیغ میں داخل ہوں ۔ دونوں خدا کے فضل سے آواز حق کو، نگر نگر پھیلانے والے ہوں ۔ اعلیٰ اخلاق و اعمال صالحہ سے لیس خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے گھر سے نکلیں اور جام شہادت نوش کرنے کی سعادت نصیب ہو تو یقیناً وہ فدائی اس مقدس امانت کی حفاظت میں آگے سے آگے بڑھتے ہوئے محمد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی جا ملتے ہیں

شجاعت

عطیہ بنت سید قمر الحق صاحبہ لکھتی ہیں کہ اُن کے ابا جان میں ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے ۔ خواہ اپنی سروس سے علیحدگی جیسی قیمت ادا کرنی پڑے ۔ مگر کبھی کسی سے حق بات کہنے سے رکتے نہیں تھے ۔ حالانکہ طبیعت بہت خاموش اور سنجیدہ تھی مگر جب دین کی بحث کرتے تو بہت احسن پیرائے میں سمجھا دیا کرتے اور حضرت بانیٔ سلسلہ سے انہیں بے حد محبت تھی ۔ اس عقیدت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ابو جان کے اسکول میں ایک ٹیچر احمدیوں کا بہت مخالف تھا ۔ وہ ہر کلاس میں جا کر احمدیوں کے خلاف باتیں کرتا تھا ۔ پھر لڑکے آکر ابا جان کو بتاتے ۔ ابو جان ہمیشہ لڑکوں کو سمجھا بجھا دیتے لیکن ایک دفعہ ابو جان نے ایک ہفتہ کی رخصت لی ہوئی تھی ۔ پھر جب اسکول گئے تو دیکھا کہ کلاس روم میں حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی شان میں گستاخانہ الفاظ لکھ کر لگا دیئے ہوئے ہیں تو ابا جان کو بہت دکھ ہوا ۔ انہوں نے وہ کلاس نہیں لی ۔ اور کہا کہ جب تک یہ بینرز نہیں اتارے جائیں گے اس وقت تک میں کوئی بھی کلاس نہیں لوں گا ۔ پھر خود سارے بینر اتار دیئے

جب اس ٹیچر کو پتہ چلا تو خوب چیختا چلاتا ہوا آیا اور کہا کہ آج آپ کی لاش یہاں سے جائے گی جس نے یہ بینرز اتارے ہیں ۔ ابا جان کلاس میں ہی نڈر ہو کر بیٹھے رہے اور وہ چیخ چیخ کر چلا گیا لیکن ابا جان نے خاموشی سے اپنا حق لے لیا اور

کلاس پڑھانی شروع کردی ۔

۱۹۸۴ء کے آرڈی نینس کا بہت غم ہوا مگر اتنی ہمت کی کہ بہت مخالفت کے باوجود اسکول سے ناغہ نہیں کیا اور سکھر میں مخالفت کے بیحد بڑھ جانے کے باوجود ثابت قدم رہے اور سکھر کو چھوڑنے کا ہرگز ارادہ نہیں کیا ۔ وہ شخص ایک استاد تھا اور عموماً استاد شجاع ہوتا ہے ۔ قمر الحق صاحب نے بھی شجاعت کا ثبوت دیا اور کہیں بھی کمزوری کا پہلو داخل نہیں ہونے دیا بلکہ پہلے سے زیادہ محبت الٰہی میں سرگرداں ہوئے ۔ وہی آرڈی نینس جو تقویٰ کی راہوں پر چلنے والوں کو پابند سلاسل کرتا تھا ۔ آزادی ضمیر کو زنجیر نہ پہنا سکا ۔ لہٰذا خدا کی رضا اور محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متلاشی سر پر کفن باندھ کر پھرنے لگے ۔ اور ان کے دلوں میں خدا کی محبت کے رنگ بھرنے لگے ۔ اور جب خدا کی محبت کا رنگ بھر جائے تو کون ہے جو منزل کو ڈھونڈتا پھرے ۔ سید قمر الحق صاحب شہید بھی صبح و شام اس نور کو لے کر بانٹتے تھے ۔ وہ صبح درس دیتے اور شام نمازیں پڑھاتے دوستوں کے گھروں میں ملنے جاتے غیروں سے رابطہ قائم کرتے اور ان سے ذاتی واقفیت پیدا کر کے ان کے مسائل حل کر کے خوشی محسوس کرتے کہ شاید میری باتیں سنیں اور کان دھریں ہو سکتا ہے کہ مٹی کہیں سے نم ہو جائے ۔ لہٰذا مالی لحاظ سے بھی غریبوں ناداروں کی مدد کرتے ۔ بچوں کو اکثر مفت تعلیم دیتے تھے ۔ مغرب کی نماز کے بعد سلسلہ ٹیوشن جاری رہتا اور سلسلے کے کام بھی حتی المقدور جاری رکھتے اور باحسن سرانجام دیتے ۔

جاہل وہ ہے جسے خدا کی معرفت نہ ہو

ایک مقام پر حضرت مصلح الموعود اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں ۔

”سستیاں بہت ہو چکیں اب وقت ہے تم میں سے چھوٹا ۔ بڑا ۔ بے پڑھا

اور عالم سب خدمتِ دین کے لئے کھڑے ہو جائیں. تم میں جاہل کوئی نہیں۔ بے پڑھے لکھے ہونا جہالت نہیں۔ جاہل وہ ہے جس کو خدا کی معرفت نہ ہو۔ پس تمہیں عرفان حاصل ہے تمہیں خدا کی طرف سے ایک دولت ملی ہے۔ اور تمہیں ایک قوت اور ہتھیار دیا گیا ہے ....

پس ہمت کرو اور بڑھتے چلے جاؤ اور دُنیا کے کناروں تک جا کر خدا کے نام کو پھیلا دو۔ اس راستہ میں تمہیں جو بھی قربانی کرنی پڑے اس سے مت گھبراؤ اور نہ رکو۔ اگر تمہیں اس راہ میں عزیز سے عزیز چیز قربان کرنی پڑے تو کرو۔ اور صرف ایک مقصد لے کر کھڑے ہو جاؤ اور اس عرفان کے خزانے کو دنیا میں پہنچا دو۔

(خطبات عیدین صفحہ ۲۰۹ - ۲۱۲)

یہ خدا کا فضل و احسان تھا کہ خلافت کی آواز ہر سعادت مند کے روح میں اُتر جاتی تھی۔ اور جب ایک بے نفس انسان کی روح کو ہی یہ آواز بے چین کر کردے تو وہ بے چینی کا علاج پیروی و فرمانبرداری میں ہی پاتا ہے۔ چنانچہ قمر الحق صاحب صبح و مسا کا فرق ختم کر کے اُس آواز کو لے کر قریہ قریہ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہیں۔ پھر گھر والوں کو تلقین بھی کرتے ہیں خصوصاً بچوں کو ساتھ لے کر دارالذکر جاتے ہیں۔ اور ہر اجتماع کے موقع پر انہیں یاد دلاتے ہیں کہ وہ از خود جماعت ہیں۔ اور انہیں انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی جماعت کے لئے زندہ رہنا ہے۔

عطیہ صاحبہ لکھتی ہیں کہ نمازِ فجر کے بعد درس دینا ان کا معمول تھا۔ واپسی پہ تلاوت کرتے اور بچوں کو ساتھ لے کر پارک جاتے تھے۔ وہاں دوران گفتگو بہت سہل اور آسان لفظوں میں ہمیں کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور کرتے تھے۔ واپسی پر ناشتہ کرتے اور ساڑھے سات بجے ڈیوٹی پر چلے جاتے تھے۔ اور پھر ایک دن

حسب عادت بی بی سی کا پروگرام سُنا اُس کے بعد سکول جانے کی تیاری شروع کردی۔ آپ گورنمنٹ فارن ہائی اسکول (انگلش میڈیم) میں بطور نائب ہیڈ ماسٹر سروس کر رہے تھے۔ صبح ، بجے تیار ہو کر آپ سکول جانے لگے تو اپنی بچی جو پودوں میں پانی ڈال رہی تھی اُسے خدا حافظ کہا اور ساتھ ہی کہا بیٹا اگر زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے۔ نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے آپ کی زبان سے وہ الفاظ ادا کروائے شائد وقت آنے والے خطرے سے پہلے ہی آگاہ کرنا چاہ رہا ہو... اور ابھی ۹ بھی نہیں بجے تھے کہ آپ کی وفات کی اطلاع آگئی بلکہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ چند نامعلوم اشخاص نے سکول جاتے ہوئے راستے میں گھیر کر اُنہیں قتل کر دیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ سکتے میں آ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پوری دُنیا ہمارے ساتھ جام ہوگئی ہو۔ گھنگریلے بال اور سیاہ آنکھوں والا انتہائی ذہین شخص پلک جھپکتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہزاروں خوبیوں کا پیکر انتہائی معصوم ہر کسی کے دُکھ کی کسک اپنے سینے میں محسوس کرنے والا.... نہ جانے اُس نے اتنے زخم اور چھریوں کے وار اپنے سینے پر کیسے برداشت کئے.... مگر نہیں وہ تو انتہائی صابر شخص تھا۔ انتہائی اطاعت گذار تھا۔ امام وقت کی آواز پر لبیک کہنے والا اُس کے اس جذبے کی خدا نے بھی قدر کی اور اس کو موت بھی وہ دی جس نے اُس کے نام کو زمانے کی پیشانی پر کندہ کر دیا۔

اِس عظیم شخص کے لئے ہر لمحہ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ اے اللہ تو اُس کی اِس قربانی کو قبول فرما اور اپنی بارگاہ میں اعلیٰ مقام عطا کر۔

آسماں اس کی لحد پر نُور افشانی کرے
رحمتِ حق یاں ہماری بھی نگہبانی کرے

داعی الی اللہ

داعی بھی ایسا خطاب ہے جو اپنی ذات میں ہی عظمت کی دلیل ہے یعنی دعوت دینے والا یا پکارنے والا کوئی شخص پہلے خود نکھرے گا پھر کسی کو پکارے گا کہ "آؤ" ایک نور کا تمہیں پتہ دوں۔" جب تک کہ پکارنے والا خود خدا کو نہ پالے وہ کسی کو کیا راستہ دکھائے گا۔ اس لئے داعی الی اللہ صرف اور صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سنورے اور سنورے ہوئے وجود ہوتے ہیں وہ ہر شعبہ زندگی میں تراشیدہ ہوتے ہیں۔ ان میں صبر ہوتا ہے میٹھے اور ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ہمدرد اور حلیم ہوتے ہیں۔ عالم اور نبض شناس ہوتے ہیں۔ غرض بہت ساری خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ تبھی تو وہ خدا تعالیٰ کی طرف بلانے کے لئے میدان میں نکلتے ہیں۔ آئیے قمر الحق صاحب کو بحیثیت داعی الی اللہ دیکھتے ہیں۔

شہید قمر الحق صاحب چونکہ ایک استاد تھے اور اُستاد کی جیب عموماً خالی ہوتی ہے مگر وہ ہیرے جواہرات بانٹتا پھرتا ہے۔ اسی طرح استاد کا پیٹ خالی بھی ہو تو دماغ و دل بھرا ہوا ہوتا ہے وہ ہر کس و ناکس کو اپنی ناصحانہ باتیں سناتا ہی رہتا ہے۔ قمر الحق صاحب جب اسکول جاتے تو کئی بار ان سے بحث و تمحیص میں اُلجھے ہوئے دماغ کی نفرتوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ کئی کئی دن وہ تنہا کلاس میں آتے یک و تنہا بیٹھ کر چلے جاتے۔ کلاس STRIKE پر رہتی کہ قمر الحق سے نہیں پڑھیں گے۔ کیونکہ معصوم ذہنوں کو اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں نے زہر آلود کیا ہوتا۔

محترمہ نصرت جہاں صاحبہ ہمشیرہ قمر الحق صاحب لکھتی ہیں کہ:۔

بھائی صاحب انتہائی رحمدل تھے۔ بچپن میں بھی کسی کی ذراسی بھی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی گلی میں کسی جانور کو بھی مارتا تو آزردہ ہو جاتے تھے۔ ان کی رحم دلی آخر وقت تک قائم رہی۔ بیوی کے لئے انتہائی محبت کرنے

والے ساتھی اور بچوں کے لئے بہت ہی شفیق اور قربانی کرنے والے باپ تھے۔ اُن کی ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے۔ آپ اس بات کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے کہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے یا انہیں کبھی کسی تنگی کا احساس ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مکرم بھائی صاحب کو تین بچیاں اور ایک لڑکا عطا کیا۔ آپ عید سے قبل ان بچوں کے لئے ایک ایک چیز منگواتے حتٰی کہ چوڑیوں اور مہندی تک کا خیال رکھتے۔ ہر بچے کی پسند کے کپڑے انہیں لے کر دیتے پھر بار بار پوچھتے کہ انہیں کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں یا جو کچھ وہ لے کر آئے ہیں انہیں ناپسند تو نہیں۔ زیادہ تر خریداری بچیوں ہی سے کرواتے جس حد تک ان کی دنیاوی ضرورتوں کا خیال رکھا اسی حد تک ان میں دینی جذبہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی اور یہ انہیں کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ بچے انتہائی عبادت گزار، وفا شعار اور فرمانبردار ہیں۔

محترمہ لکھتی ہیں کہ :

والدین کے ساتھ سلوک انتہائی مشفقانہ تھا میں نے والدہ کو اکثر کہتے سُنا کہ میرا یہ بچہ فرمانبرداری اور اطاعت میں انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ ابھی ان بھائیوں کا سکول کا زمانہ ہی تھا کہ والدین ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ یہاں آکر انہیں کافی مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت میرے اس بھائی نے والدین کا بہت ساتھ دیا۔ وہ اس طرح کہ میٹرک کے بعد انہوں نے کالج میں داخلہ نہیں لیا۔ بلکہ سروس شروع کر دی۔ لیکن حصولِ علم کے شوق نے انہیں بے چین رکھا پہلے اُنہوں نے ادیب عالم کا امتحان دیا۔ اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد سکھر آکر نوکری کی اور دورانِ نوکری پرائیویٹ طور پر ایف اے، بی اے، ایم اے اور بی ایڈ کیا۔ رشتہ داروں میں ان کی شخصیت بطورِ نمونہ کے پیش کی جاتی تھی۔ آپ ہر ایک کے ساتھ انتہائی حُسنِ سلوک سے پیش آتے۔ طبیعت میں نرمی اور رحمدلی بہت زیادہ

تھی۔ عفو اور درگزر کا مادہ بہت زیادہ پایا جاتا تھا۔ اگر کوئی ان کے خلاف کوئی بات بھی کرتا تو بھی بُرا نہ مانتے اور اُسے کچھ نہ کہتے بلکہ صرف مسکرا کر رہ جاتے ہم چھوٹی بہنوں کے ساتھ رویہ انتہائی مشفقانہ ہوتا ہمیشہ بیٹا کہہ کر بلاتے۔"

احترام جمعۃ المبارک

جمعۃ المبارک کا دن ایک رحمت کا دن ہے خدا تعالیٰ نے خود اپنے کلام میں اس کے متعلق ہدایت فرمائی ہے۔ کہ اے مومنو! جب جمعہ کے دن تمہیں اذان الصلوٰۃ سنائی دی تو اس پکار کے جواب میں تم پر لازم ہے کہ

فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ

کیونکہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں غیر معمولی برکتیں رکھی ہیں۔ اور یہ دن مومن کے لئے اس قدر برکتوں اور رحمتوں کا موجب ہوتا ہے کہ وہ اس کی برکت سے اپنے کھوئے ہوئے مقامات دوبارہ حاصل کر لیتا ہے اور اس دن میں بعض ایسی ساعتیں بھی آتی ہیں کہ مومن کی ساری دعائیں قبول ہو جاتی ہیں.............. جمعہ کے احترام کو قائم کرنا، جمعہ کی عبادت کے نظام کو از سر نو مستحکم کرنا اور ہر ایک احمدی کو عادی کر دینا ہے کہ وہ جمعہ پڑھے یہ اس دور اور اس سال کی خصوصی مہم بن جانی چاہیئے۔ اگر آپ لوگ ایسا نہیں کریں گے تو آپ کی اولادوں کے ایمان اور ان کے اعمالِ صالحہ کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ فرمایا جماعت احمدیہ کے افراد نے اگر اپنے بچوں کی حفاظت کرنی ہے اور ان کو دیندار بنانا ہے۔ تو جمعہ کی اہمیت ان پر واضح کئے بغیر ان کو جمعہ کا عادی بنائے بغیر دیندار نہیں بنا سکو گے..... ایسے احمدی بچے جن کو یہ علم ہی نہ ہو کہ ان کے ہاں عبادت کا ایک خاص دن بھی ہے۔ ایسی نسل جب بڑی ہو گی تو اس کے متعلق یہ

توقع رکھنا کہ وہ احمدیت پر کاربند رہے گی۔ یا کاربند ہوگی یا ان کے اندر دین کی اہمیت باقی رہے گی۔ دیوانے کی خواب سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔

اقتباس خطبہ جمعہ یکم فروری ۱۹۸۸ء

چونکہ دارالذکر قریب تھا اس لئے تقریباً تمام نمازیں باجماعت ادا کرتے تھے۔ بلکہ بچوں کو بھی لے کر ہی جاتے تھے۔ خصوصاً جمعہ کا احترام تو ابا جان کا ایک امتیازی شوق تھا۔ وہ اس دن کو عید کی طرح مناتے تھے۔ اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع کی آواز تو ان کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ وہ اس آواز پر ہمیشہ لبیک یا سیدی کہتے تھے۔

زرّاع احمدیت

قدرت ثانیہ نیک نصیحتوں کا بیج ڈالے اور لوگ محبت اور نیک تمنائیں لے کر لبیک کہتے ہوئے آگے نہ بڑھیں یہ تو قطعی ناممکن ہے ہاں ممکن یہ ہے کہ مشرق و مغرب سے۔ شمال و جنوب سے خوش قسمت آگے بڑھتے ہیں۔ اور خدا کی راہ میں کھیتی اگاتے ہیں اور نئے نئے روحانی بچے پیدا کرتے ہیں اور پھر ایک دن ایسا آجاتا ہے کہ وہ روحانی بچے روحانیت کی کھیتی میں ڈلے ہوئے بیج ہزاروں کی نفری کو لاکھوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ یقین کامل کے ساتھ اُٹھے تھے کہ دعوت الی اللہ کے دروازے اور راستے کھلے تھے سو انہیں بفضلہ تعالیٰ ہمیں عطا کی گئیں۔

اسی طرح

ایک زرّاع قمر الحق صاحب یہی نعرہ لے کر اٹھے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کو زراع یعنی کھیتی لگانے والا قرار دیا ہے۔ اس لئے میں خدا کی راہ میں کھیتی اگاؤں گا۔ اور روحانی اولاد پیدا کروں گا۔ وہ دعوت الی اللہ کی اس مہم پر

صبح و شام نکلتے اور پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے اپنا موقف پیش کرتے گو کہ عملی مشکلات سے وہ قطعی واقف تھے۔ مگر ایک جنون تھا یہ کہ سرزمین سندھ کیوں روحانی کھیتی سے خالی رہے۔ اسلئے ہر سندھی کے دروازے پر دستک دینے اور اپنا موقف بیان کرتے تھے۔ اور لیسا اوقات حیرت انگیز ترقی بھی ہوتی۔ گو کہ زراع احمدیت اس میدانِ دعوت الی اللہ کے نشیب و فراز سے قطعی طور پر واقف بھی تھے۔ تاہم مخالف طاقتیں اپنے عروج پر تھیں۔ محض خدا تعالیٰ کے سہارے پر تمام لوگوں کے سامنے سالہا سال دعوت الی اللہ کرتے رہے اور اس فریضہ کو احسن رنگ میں انجام دیتے رہے اور ایک دن خلافت کی آواز گونجی کہ

فصرھن الیک

پس ہر مربی، ہر امیر، ہر صدر، اور متعلقہ عہدیدار کو خواہ وہ عہدیدار سیکرٹری اصلاح و ارشاد ہو یا جس حیثیت سے بھی اس کام سے اس کا تعلق ہو اس کو چاہیے کہ جماعت کے بعض افراد کو پکڑے اور فصرھن الیک کے تابع ان کو اپنے ساتھ وابستہ کرے۔ پیار اور محبت کے ساتھ ان کی تربیت کرے۔ پھر ان کے سپرد کام کرے۔ پھر ان کو دنیا میں پھیلا دے۔ اور ان کے ذریعہ احیائے موتیٰ کا کام لے۔

(اقتباس خطبہ جمعہ ۲۸ راگست ۱۹۸۸ء)

اک درد ہی تو متاعِ حیات ہے
جاؤ کہ مجھ کو درد کا درماں نہیں قبول

(عبدالمنان ناہید)

"شہادت اپنی ذات میں ایک انعام ہے"

یہ نوید سناتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے فرمایا کہ احباب جماعت کو پاکستان سے آنے والی دو خبروں کی اطلاع مل چکی ہو گی۔ ان میں سے ایک تو سکھر سے تعلق رکھتی ہے جس میں ہمارے دو نہایت ہی پیارے بھائیوں اور نہایت مخلص دوستوں کو جن میں سے ایک کا نام قمر الحق تھا جو امیر ضلع محترم نجم الحق کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور ایک اور مخلص نوجوان خالد سلمان کو ۱۱ مئی ۱۹۸۶ء کو سکھر میں شہید کر دیا گیا۔ دوسری خبر کوئٹہ سے متعلق ہے کہ وہاں پولیس کی معیت میں ایک ڈیڑھ ہزار کے مجمع نے (بیت الحمد... ناقل) کوئٹہ پر حملہ کیا....

خطبہ جمعہ میں سے ایک دو اقتباس پیش کرتی ہوں۔ ان خبروں کی تفصیل میں جائے بغیر حضور پُر نور نے قمر الحق صاحب کی شہادت پر جو اظہار عقیدت فرمایا صرف اس وقت اس کا ذکر کرتی ہوں۔ فرمایا:

"سب سے پہلی بات جو بیان کرنی ہے وہ قربانی کرنے والوں کے متعلق ہے پیچھے رہنے والوں کے متعلق نہیں ہے۔ جو قربانی میں سے گزر رہے جن کو قربانی کرنے کی سعادت ملتی ہے۔ ان کو کوئی خوف نہیں ہوتا اور کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ وہ قربانی دیتے ہیں اور قربانی کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ جس شخص کو نقصان یا ضیاع کا احساس ہوا ہو وہ دوبارہ قربانی دینے کی خواہش نہیں کر سکتا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس کے پسماندگان پر اللہ تعالیٰ اپنے فضل نازل فرماتا ہے۔ ان کے غم کو عارضی کر کے دکھاتا ہے اور پھر ایسے فضل ان پر نازل فرماتا جاتا ہے کہ وہ غم اس کے مقابلہ پر کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور چھوٹے ہو کر نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ مثلاً

خدائی راہ میں ایک نقصان ہوا۔ پھر اس کے مقابلے میں اس کثرت سے فضل نازل ہونے شروع ہوئے کہ وہ نقصان اُن فضلوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

چنانچہ

اس مضمون کو قرآن مجید نے اجتماعی رنگ میں اس طرح فرمایا ہے کہ اگر ایک تم میں سے ارتداد اختیار کرے گا تو اس کی جگہ کثرت سے خدا دوسری جماعت عطا فرما دے گا۔ ایک جان کو شہادت نصیب ہو گی تو اس کثرت سے بڑھائے گا کہ اس شہادت کی برکت سے مومنوں کی جماعت کا نہ صرف ایک نقصان پورا ہو گا بلکہ بے انتہاء منافع میں تبدیل ہو جائے گا۔ پس مومن کی ساری زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہی مضمون جاری و ساری دیکھائی دیتا ہے۔ جو مال وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ تو اسی دنیا میں باقی دنیا کا تو الگ معاملہ ہے اسی دنیا میں اتنا بڑھا چڑھا کر اس کو اور اس کی اولاد کو لوٹایا جاتا ہے کہ وہ شکر کے گیت گاتے گاتے تھک جاتا ہے۔ مگر شکر ادا نہیں ہوتا۔

حضور پُر نور نے مزید آیت کریمہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا

جہاں " ولا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون " فرمایا تو وہاں لا خوف علیھم کی تو پوری کھلی کھلی سمجھ ایک مومن کو آجاتی ہے۔ آج سارے پاکستان کے احمدی بلا امتیاز خوف سے بالکل عاری ہیں اور جن پر ابتلاء کا یہ دور گزر رہا ہے ان کی طرف سے بار بار بڑی شدت کے ساتھ اور اصرار کے ساتھ یہ اطلاعیں پہنچی ہیں کہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہمارے دل پر کیا گزر رہی ہو گی تو بالکل ہرگز کسی قسم کا غم نہ کریں۔ بعض احمدی دوستوں نے لکھا ہے کہ اتنے کمزور ایمان والے لوگ جو معمولی باتوں سے بھی بعض اوقات ڈر جایا کرتے تھے ان کے دلوں کی یہ کیفیت ہے کہ دل وجد میں آجاتے ہیں دیکھ کر۔ وہ دندناتے ہوئے خطرہ کی گلیوں میں پھر رہے ہیں اور ذرہ

پھر بھی انہیں پرواہ نہیں۔ وہ سارے فیصلے کر چکے ہیں اور یہ عزم بٹھا چکے ہیں دلوں میں کہ خدا کی راہ میں جو کچھ قربان ہوتا ہے وہ ہم سب قربان کر دیں گے۔ اور جب ایک دفعہ کوئی قوم قربانی کے اس معیار پر پوری اُتر چکی ہو کہ ہر قسم کے خطرات کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت رکھتی ہو۔ اور اپنے دل میں تہیہ کر چکی ہو کہ جو کچھ بھی اس راہ میں گزرے گی ہم اس کو اپنے سر پر لیں گے اور ہرگز پیچھے نہیں رہیں گے۔ ان کے مرد کیا۔ اُن کی عورتیں اور ان کے بوڑھے کیا اور ان کے بچے کیا۔ اب اس عہد میں یک جان اور یک قالب ہو چکے ہوں تو ان کو موت یا کوئی خوف کیسے ڈرا سکتے ہیں ؟؟

جہاں تک حُزن کا تعلق ہے فرمایا شہید ہونے والے بھائیوں کے لئے کوئی غم نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شہادت کی جو معرفت رکھنے والی قومیں ہیں وہ اس غم کو دل کو لگا کر نہیں بیٹھ جایا کرتیں۔ وقتی طبعی تقاضے بہرحال ہوتے ہیں۔ جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک بچپن میں فوت ہونے والے بچے کو قبر میں اتارتے وقت آنسو بہائے تو ایک صحابی نے نادانی میں یہ عرض کیا۔ یارسول اللہ۔ آپؐ اور یہ آنسو!! آپؐ نے فرمایا یہ تو رحمت ہے اور مجھے رحمت سے حصّہ دیا گیا ہے اور جس بدقسمت کو رحمت کا علم نہیں اس کے لئے میں کیا کر سکتا ہوں۔ دل کا نرم ہونا اور آنسو کا بہنا اپنے پیاروں کے لئے یہ وہ حُزن نہیں جس کی نفی یہاں فرمائی گئی ہے وہ حُزن ہوتا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے یا دل کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے ان کے ساتھ مایوسیاں چمٹ جاتی ہیں حسرتیں ان کے وجود کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ شہادت پانے والوں کے لئے اس قسم کا غم نہ کوئی مومن محسوس کر سکتا ہے نہ مومن کی شان ہے کہ ایسے غم میں مبتلا ہو۔ بہت ہی بڑا انعام ہے۔ بہت ہی بڑا مرتبہ ہے۔ جو شہادت پانے والوں کو نصیب ہوتا ہے

اس لئے ان کے لئے جدائی کا غم یا پسماندگان کا احساس یا بعض دفعہ یہ احساس کہ ہم کیوں نہیں تھے ان کی جگہ یا یہ احساس کہ ان کی بیوی بچوں کی بجائے ہمارے بیوی بچے کیوں ان قربانیوں سے محروم رہے یہ ایسے غم ہیں جو ولایحزنون کی نفی نہیں کرتے۔ یہ آیت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اور اس کے باوجود اس قسم کے غم مومنوں کے وجود پر قبضہ نہیں کر لیتے۔ لیکن بالآخر یہ غم خوشیوں میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔

حدیث قدسی

ایک اور معنی حُزن کے اس طرح فرمائے۔ فرمایا کہ :-

اللہ تعالیٰ خوشخبریاں دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کس حال میں ہیں اور بہا ان کا حال تو یہ ہے کہ وہ بے انتہا خوش ہیں جن کو نعمتیں مل گئیں ان کے لئے جن کو خوشیاں عطا ہو گئیں ان کے لئے تم کیوں غم کرتے ہو؟ اپنے رب کے حضور حاضر ہیں بلکہ وہ لوگ جو ابھی قربانیاں نہیں کر سکے۔ جن کی قربانیوں کا ابھی وقت نہیں آیا وہ تو ان کی قربانیوں کی راہ میں نظریں بچھائے بیٹھے ہیں۔ وہ تو راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب ہمارے اور بھائیوں کو شہادتیں نصیب ہوں اور وہ ہمارے ساتھ آکر ملیں یہ کیفیت ہے جس کی تفصیل ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں ایسے ملتی ہے

یہ واقعہ جو حضور فرماتے ہیں حدیثِ قدسی کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ آپ کی اپنی حدیث نہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے آپ کے سامنے بیان کی۔

ترمذی میں جنگِ اُحد کے متعلق ایک روایت آتی ہے کہ ایک نوجوان صحابی جابرؓ آپ کے سامنے آئے اور آپؐ نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اپنے باپ کی شہادت کی وجہ سے مغموم ہے فرمایا۔ کیا میں تمہیں ایک خوشی کی خبر سناؤں۔ جابرؓ نے عرض کیا ہاں یا رسولؐ اللہ۔ آپؐ نے فرمایا جب تمہارے والد شہید ہو کر خدا کے حضور پیش ہوئے تو

اللہ تعالیٰ نے اُن سے بے حجاب ہو کر کلام فرمایا۔ جو مانگنا چاہتے ہو مانگو تمہارے باپ نے عرض کیا اے میرے اللہ تیری کسی نعمت کی کمی نہیں لیکن خواہش ہے پھر دنیا میں جاؤں اور پھر تیرے دین کے راستے میں جان دے دوں۔ خدا نے فرمایا ہم تیری اس خواہش کو ضرور پورا کر دیتے لیکن ہم عہد کر چکے ہیں کہ انھم لا یرجعون کہ کوئی مردہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آسکتا۔ جابرؓ کے والد نے عرض کیا کہ میرے بھائیوں کو اطلاع دے جاوے تاکہ ان کے جہاد کی رغبت ترقی کرے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ "جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوتے ہیں انہیں مردہ نہ خیال کیا کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے خدا کے پاس خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس قربانی میں بے انتہا لذت ہوگی اور یہ پتہ چلتا ہے کہ شہادت اپنی ذات میں ایک انعام ہے۔ شہادت کا انعام اور جو ہوگا وہ ہوگا لیکن شہید کے لئے شہادت خود انعام ہے اور اس انعام کے ساتھ اس کو ایسا پیار ہو جاتا ہے کہ بار بار اسی انعام کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرے جو کر پیچھے رہنے والوں کو غم سے اُسے دُور کرنے کی خاطر ہیں۔ شہدا خود خدا سے عرض کرتے ہیں کہ انہیں اس بات کی اطلاع کر دی جاوے۔ اگر غم ہونا ہی کوئی نہ، اور غیر فطری بات ہوتی تو شہدا کو خدا کے حضور یہ عرض کرنے کی ضرورت کیا تھی اور کیوں اللہ تعالیٰ ان کی اس التجا کو قبول فرما کر ہمیں ان حالات سے مطلع فرماتا۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۶ مئی ۱۹۸۶ء)

ایک نظر میں

۱۹۲۶ء ——— ۱۹۸۶ء

نام	سیّد قمر الحق شہید ابن سیّد عبد الہادی صاحب بہار ضلع مونگھیرہ
تعلیم و تربیت	ایم اے بی ایڈ، ابتدائی مرکز تدریس قادیان تعلیم الاسلام اسکول
شغل و پیشہ	تعلیم و تعلم اور صبح بعد نماز فجر درس دیا کرتے تھے۔
لباس	شلوار قمیص، کوٹ اور ٹوپی پہنتے تھے اور نظر کی عینک استعمال کرتے۔ فاؤنٹین پن استعمال کرتے۔
قد و جسم	جسم سڈول اور قد ۱۱" ۔ ۵' تھا۔
چال	پُر وقار تھی اور تیز تیز قدم اُٹھاتے تھے۔
موصی	
نمازِ جنازہ	محترم سلطان محمود انور صاحب نے پڑھائی۔
آلہ قتل	چھریاں
عہدہ بوقت شہادت	امیر جماعت سکھر
وقت و تاریخ	صبح سات بجے یکم رمضان المبارک مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۸۶ء
مقام شہادت	سکھر
تدفین	بہشتی مقبرہ
لواحقین	۳ بیٹیاں، ایک بیٹا اور بیوہ

قرآن مجید با ترجمہ جانتے تھے اور درس دیا کرتے تھے۔ نماز با جماعت ادا کرتے

زیادہ تر معمول روزانہ بحیثیت داعی الی اللہ تبلیغ کے لیے لوگوں سے ملتے تھے۔ صبح نماز سے پہلے جاگتے اور جلدی رات کو سو جاتے تھے۔

رخسانہ پروین

اگست ۱۹۶۴ء تا جولائی ۱۹۸۶ء

سب سے پہلے میں عزیزہ رخسانہ پروین صاحبہ آپ کو سلام پیش کرتی ہوں کہ آپ نے عظمتِ نسوانیت کو سربلند کر دیا۔ خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے دور میں کچھ لوگوں کی زندگی اتنی قیمتی اور قدر و منزلت کی حامل ہو گئی کہ میرے جیسے کم علم لوگ بھی ان کے شب و روز سے آگاہ ہو گئے۔ نہ صرف وہ لوگ خود انکے لمحہ لمحہ سے واقف ہوئے بلکہ آگہی کے لئے وہ لمحے قرطاس پر سجا کر آئندہ نسلوں کو پیش کرنے لگے تو یہ تمام نگینہ لوگ تقریباً ۲۰ ۱۸ تھے مگر اے شہیدِ وفا رخسانہ تم نے عورتوں کی صف میں کھڑی ہو کر مجھے یقین دلا دیا کہ عورت کبھی کمزور نہیں ہوا کرتی وہ بھی سینہ پر گولی کھاتی ہے اور جب وہ معرفت کے اس مقام تک پہنچ جاتی ہے کہ میرے پیارے خالق و مالکِ حقیقی کا ارشاد ہے کہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عملا تو وہ فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول کے بلند مقام پر سینہ سپر ہو کر اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتی ہے اور جان راہِ حق میں قربان کر دیتی ہے اور کبھی ہار نہیں مانتی کیونکہ وہ ایک بلند اور سچا اور حقیقی مقصد لے کر کھڑی ہوئی ہے اس لئے وہ کبھی ڈگمگاتی نہیں۔ ہاں وہ صبح و شام مخالفت کا سامنا کرتی ہے۔ وہ تیر پہ تیر برداشت کرتی ہے۔ اور ہر تیر پہلے سے زیادہ اُس کے ایمان کو پختہ کر جاتا ہے۔ اور یہی معراج ہے حق الیقین کی منزل کا۔ سو عزیزہ رخسانہ آپ کو یہ منزل حاصل ہو گئی۔ آپ کے والدین

کو مبارک ہو کہ ان کی نیک تربیت یہ رنگ لے آئی۔

اور یہ رنگ اللہ تعالیٰ کا رنگ تھا

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ

عٰبِدُوْنَ ○ (سورۃ البقرہ آیت ۱۳۹)

اور اللہ نے انسان کو اسی غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صفات الٰہیہ کا مظہر بنے اور اس کی قابلیت خدا نے خود انسانی فطرت کے اندر ودیعت کر دی ہے تو پھر فرماتا ہے کہ دین سکھانے میں اللہ سے زیادہ بہتر کون ہے " پس جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں معزز بنایا ہے۔ اور بڑی بڑی طاقتیں عطا کی ہیں۔ اور وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا اور بڑے بڑے انعام دینے والا ہے وہ خالی نہیں رہتے بلکہ اپنے ظرف کے مطابق اپنا حصہ لے کر رہتے ہیں۔

(سورۃ البقرہ تفسیر کبیر ص۲۱۷)

پس یہ یقین کرنا کہ انسان انعامات کا حصہ اپنے ظرف کے مطابق پا لے گا قرب کے راستوں کی طرف لے کر جاتا ہے اور بالآخر وہ اُس وقت قرب خداوندی حاصل کر لیتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کی اتباع کرتا ہے اور دین کی اتباع کرنا ہی تو فطری رنگ ہے جو اصل میں اللہ تعالیٰ کا رنگ ہے۔ اور یہ رنگ کیا ہے۔ خدا کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرنا۔ یعنی خدا رحیم ہے تو انسان رحم کا جذبہ پیدا کرے اور خدا شکور ہے تو انسان شکر و احسان کا جذبہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیدا کرے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا مظہر بن سکے۔ سو پیاری رخسانہ آپ نے اِن صفات کو اپنے اندر اپنے ظرف کے مطابق جذب کیا۔ اور خدا تعالیٰ کا رنگ اختیار کیا۔ آپ نے چھوٹی سی عمر میں دکھی انسانیت کی ہر جا۔ ہر آن اور ہر ممکن مدد کر کے اپنے محبوب خدا کی صفت رحمانیت کو اجاگر کر دیا۔ آپ نے یہ رنگ اپنے طور پر اختیار کر کے ہمیشہ کے لئے یہ

ثابت کر دیا کہ کوئی صنف کمزور نہیں ہوتی۔ اور کوئی ماہ وسال اثر انداز نہیں ہوتے پس خدا تعالیٰ کی راہنمائی کے ماتحت چلنے والا/ والی غیر معمولی انعامات سے نوازا جا سکتا ہے سو آپ کو یہ انعام "شہادت" مبارک ہو۔ آپ نے سینے پر گولی کھا کر شجاعت و بہادری کا ثبوت دیا۔ آپ آج کے زمانے کی پہلی شہید خاتون ہیں۔ آپ کے محبوب خلیفہ نے آپ کو قابل تحسین قرار دیا ہے۔ حضور پُر نور نے دائمی زندگی کی بشارت دے کر عورتوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں

رخسانہ جنگ پاکستان سے پہلے پیدا ہونے والی بیٹی پیدائشی احمدی تھیں۔ ان کے والد محترم کا نام مرزا خان صاحب تھا جو سرگودھا میں سکونت پذیر تھے۔ اور کچھ ابتدائی ایام افواج پاکستان میں بھی خدمات سر انجام دیتے رہے۔ بعد میں وہ ذاتی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں اُن کے گھر میں جو بیٹی پیدا ہوئی۔ ان کا نام انہوں نے رخسانہ پروین تجویز فرمایا۔ اپنے بہن بھائیوں کے جھرمٹ میں وہ پلی بڑھی اور زندگی کی انیس بہاریں والدین کے مبارک و بابرکت وجود کے سایہ تلے گزار دیں۔ اوامر و نواہی کے اس مقدس رشتے سے وہ بہت کچھ سیکھتی رہیں۔ عزیزہ ایف اے پاس تھیں اور تعلیمی لحاظ سے ایک باشعور احمدی بیٹی تھیں۔ جو ناصرات کے بعد لجنہ اماء اللہ کی تربیتی کلاسز کے لئے ربوہ بھی تین دفعہ گئی تھیں۔ گویا دینی علم کے ساتھ ساتھ عزیزہ نے جماعتی وابستگی کو پختہ اور محکم نمونہ دے رکھا تھا۔ اور اپنے پیاروں سے روحانی رشتہ کو استوار کرتی رہی تھیں۔ اجتماعات اور جلسے اجلاس میں شمولیت کسی بھی قوت کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لئے ضروری امر ہے۔ اور رخسانہ ہمیشہ یہ ذہن نشین رکھتی کہ مجھے اپنی تربیت کے تمام پہلوؤں کو مکمل کرنے کے لئے جو لائحہ عمل صدر لجنہ تیار کرتی ہیں ان پر عمل کرنا ازبس ضروری ہے۔ ان کے والدین ان کو اجازت بھی دیتے کہ بصد شوق ربوہ کی تربیتی

کلاسز میں شامل ہو کر مستفید ہوں۔ اس لئے وہ شدید گرمی کے باوجود ربوہ جاتی رہیں اور جہاں تک میرے تجربے کا تعلق ہے۔ یہ کلاس جو تربیتی و تعلیمی کلاس کہلاتی ہے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بچی کے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ ایک صحت مند جسم کے لئے موزوں و مناسب خوراک و غذا ضروری ہے کیونکہ روحانیت کی غذا قرآن مجید ناظرہ و با ترجمہ احادیث و کلام تفسیر و تشریح سے مل سکتی ہے اور یہ غذائیت یہاں سرزمین ربوہ میں خدا تعالٰے کے فضل و کرم سے وافر مقدار میں میسّر آجاتی ہے۔ اور اگرچہ کچھ بے قاعدگی بھی درپیش آتی ہے۔ مگر یہ چیزیں سوسائٹی کا ایک حصّہ بن چکا ہے۔ جہاں مختلف خیالات، تمدن، طبقہ کے نیچے آئیں گے کچھ اختلافات پیدا ہوں گے جو قابلِ ذکر نہیں ہوتے۔ مگر وہ روشنی اور علم کی چاٹ جو ان کلاسز میں نصیب ہوتی ہے۔ کسی بھی دوسری کلاسز میں ان کا تصوّر کرنا بھی مشکل ہے۔ خیر سے رخسانہ کو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے چند سال یہ کلاسز میسّر آتی رہی تھیں۔ اس لئے خدا کے فضل سے وہ بہت بصیرت و بصارت سے متمتع رہیں۔ یہ خاندان جو پانچ بہنوں اور ایک بھائی پر مشتمل تھا ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ احسان اللہ مربی عفت یاسمین صاحبہ، عصمت طاہرہ صاحبہ۔ فرزانہ مرزا صاحبہ اور مبارکہ مرزا صاحبہ کی چہیتی بہن اپنے بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتی تھی۔ اصل میں یہ ایک مجسمہ محبت تھا جو خدا تعالیٰ نے مرزا خاں صاحب کو عطا کیا ہوا تھا۔ اپنی عادتوں اور حسن سلوک کی وجہ سے وہ اپنے پرائے میں ہمیشہ چاہی جاتی تھی دل کی بہت حلیم تھی۔ اسی لئے ہمیشہ دکھی کے لئے درمند ہو جاتی اور اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کر غریب کی مالی مدد کرتی بلکہ جسمانی خدمت بھی ایسی کرتی کہ دیکھنے والے اس کی ہمت پر حیران ہو جاتے۔ مثلاً کنیز بی بی ایک دیوانی عورت گلی میں سے گزرتی جس کو بچوں نے پتھر مار کر زخمی کیا ہوا تھا۔ رخسانہ نے جب دیکھا تو گھر کے اندر بلا لیا۔ دُکھی اور رنجیدہ ہوئی۔ اس کی مرہم پٹی کی نہلایا کپڑے

خود دھو کر دیئے کھانا وغیرہ کھلایا اور ایک بڑے درد کے ساتھ کہا کہ تم کنیز بی بی ہمارے ہاں رہ جاؤ تو بہت اچھا ہو۔ وہ دیوانی وہیں ٹھہر گئی۔ اور ایک محفوظ چھت اُسے نصیب ہو گئی اور اب بھی وہ مرزا خان صاحب کے گھر پہ ہی مقیم ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ویسے حالت قدرے بہتر ہے۔ وہ رخسانہ کی یادیں ہیں جو ماں باپ سینے سے لگا کر بیٹھے ہیں۔ کوئی تو دیوانے کی شکل میں ہے اور کوئی معذور بچے کی صورت میں ہے اور یہ تمام سوز و رحم کی علامات ہیں۔ جو خدا تعالیٰ نے رخسانہ کو ودیعت کی ہوئی تھیں۔

حقوق اللہ

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ آپ سے راضی ہو) نے فرمایا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو جب تک ایک منظم رنگ میں ادا نہ کیا جائے اس وقت تک انسان نیکی کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔
(تفسیر کبیر سورۃ البقرہ صفحہ ۳۵۶)

چنانچہ حقوق اللہ کو منظم رنگ میں ادا کرنے کا طریق یہی ہے کہ انسان ایمان باللہ، ایمان آخرت، ایمان ملائکہ، ایمان کتب اور ایمان انبیاء کے بعد اعمال کی طرف جب قدم مارے تو سب سے پہلے اللہ کی محبت اور رضا حاصل کرنے کے لئے قدم اُٹھائے۔ یعنی نماز اور مال خرچ کرنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اعمال کا درجہ جب شروع ہوتا ہے تو نماز اور زکوٰۃ کے لئے مومن بڑھ چڑھ کر قدم مارتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے۔

رخسانہ پروین کی زندگی کے شب و روز کو ہم سامنے لائیں تو ان حقوق کی ادائیگی میں رخسانہ ایک مثالی مقام رکھتی تھیں۔ وہ نماز کی اتنی پابند تھیں کہ اپنے شوہر سے بھی جب کبھی جھگڑا ہوا تو صرف اور صرف نماز کی ادائیگی پر ہوا۔ اور ہمیشہ تاکید ہی کرتی رہتی تھی۔ ان کے شوہر طارق صاحب کا کہنا ہے کہ اس نے کبھی نماز میں غفلت نہیں کی بلکہ رخسانہ کا دعویٰ تھا کہ میں نے کبھی کوئی نماز بھی ترک نہیں کی۔ یعنی نماز کی عادت اسے

بچپن سے تھی۔ اور یہ غذا اُس کی روحانیت کے لئے تازگی و زندگی کا کام کرتی رہی جب تک وہ زندہ رہی نماز ادا کرتی رہی اور جب وہ فوت ہوئی تو یہ نماز اُس کو زندگی دے گئی۔ وہ بظاہر فوت ہو چکی ہے لیکن اُس کی نمازوں کا ذکر اس کی عبادت کا ذکر اور اس کی ہمدردی، خیر خواہی کا ذکر ہم اور آپ آج بھی کرتے ہیں تو یہ ذکر اسکو زندہ رکھے گا اور خدا تعالیٰ نے بھی اُس کے نیک اعمال و افعال کی وجہ سے اُسے انعام عطا کیا ہے۔ وہ انعام جو اسے ہمیشہ کے لئے زندہ کر گیا۔ خدا تعالیٰ نے شہداء کے لئے کتنا واضح فرمایا ہے کہ انہیں "مُردہ مت خیال کرو بلکہ وہ احیاء ہیں۔" احیاء کا لفظ قرآن مجید میں جس انداز سے بولا گیا ہے۔ اُس کے مختلف مطالب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) نے ہمارے سامنے رکھے ہیں مگر بخوفِ طوالت میں ایک دو کا ذکر کرتی ہوں۔

۱۔ کہ وہ شخص جو راہِ خدا میں قتل کیا جائے۔ اُس کو اگلے جہان میں کیا دُکھ پہنچے گا۔ کیونکہ وہ خوش و خرم ہے اور اس سے بہتر زندگی پا چکا ہے۔ ۲۔ دوسرے شہید کو ایک اعلیٰ حیات مرنے کے بعد ہی مل جاتی ہے جبکہ دوسرے لوگوں کو عرصہ تک ایک درمیانی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ ۳۔ تیسرے خدا کی راہ میں شہید ہونے والے کے اعمال کبھی ختم نہیں ہوں گے بلکہ بڑھتے ہی رہیں گے۔ اس طرح وہ دائمی زندگی پالے گا۔[۶]

سورخسانہ پروین نے خدا تعالیٰ کی عبادت کی۔ خدا کی خاطر، اس کی رضا کی خاطر بروقت نماز ادا کی اور اپنے مقدور کے مطابق خدا تعالیٰ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خدا کا دیا ہوا مال خرچ کیا۔ بلکہ غرباء و محتاجوں کے لئے اپنے گھر میں اندھیرا کر کے دوسرے کے گھر روشنی کر دی۔

دائمی حیات

سارا جہیز لوگوں میں تقسیم کر کے اپنے خواب کے مطابق حیاتِ جاوداں حاصل کر لی۔ رخسانہ پروین کے والدِ محترم لکھتے ہیں کہ رخسانہ کو خلافت سے بہت عقیدت تھی اور اطاعت میں ہمیشہ سرگرداں رہتی تھی۔ ایک دفعہ شادی سے چند ماہ قبل اس نے خواب میں دیکھا کہ "میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں اور خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز آئے ہیں اور کمرہ کے باہر کی طرف سے کھڑکی کے راستے سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ جیسے بزرگ بچوں سے پیار کرتے ہیں۔" یہ رؤیا بیان کر کے وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ (رخسانہ کے والد صاحب لکھتے ہیں) ہمارے خیال میں یہ رؤیا اس طرح پوری ہوتی ہے کہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے رخسانہ کی شہادت کے بعد اپنے خطبۂ جولائی ۱۹۸۶ء میں رخسانہ کو موجودہ زمانے کی **پہلی شہید خاتون** قرار دیا ہے اور اس کے بعد ہر عید پر رخسانہ کی محبت میں رخسانہ کے والدین اور بھائی بہنوں کو مٹھائی، فروٹ کا تحفہ بھیجتے ہیں۔ یہ ہی رخسانہ پروین کے سر پر پیار ہے اور محبت ہے یہ بالکل بجا ہے کہ وہ اس زمانے کی پہلی شہید خاتون ہے۔ اور حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان مبارک اور دُکھی دِل اور آبدیدہ آنکھوں سے رخسانہ کو پہلی شہید خاتون قرار دیا ہے۔ بے شک اس نے خواتین کی شہادت کا باب کھول دیا ہے اور آئندہ زمانہ میں جب بھی کوئی عورت راہِ خدا میں جان دے گی اور شہید ہو جائے گی تو رخسانہ کو اُس کا حصۂ ثواب پہنچے گا۔ کیونکہ آج کی عورت کے لئے شہادت کا دروازہ رخسانہ نے کھولا ہے۔ خلافت کی برکات اور دعائیں اُسے ہمیشہ ہمیش کے لئے حاصل رہیں گی جو اُسے نیکی اور تقویٰ میں بڑھاتی چلی جائیں گی۔ اور اس طرح وہ حیاتِ دائمی پالے گی۔ جو خدا کے فرمان کے مطابق نفظ احیاء میں اُسے نصیب ہوئی ہے۔

(اللّٰھم زدنی زد آمین)

حقوق العباد

غرباء سے محبت، بچوں سے پیار، حاجت مندوں کی دیکھ بھال، بیماروں کی نگہداشت اور ہمسایوں کا دکھ محسوس کرنے والی ہستیاں بیشک خدا تعالیٰ کی محبوب ہستیاں ہوتی ہیں۔ ان کی مسکین مزاجی، دردمندی اور حلیم طبیعت کا عکس ہوتا ہے۔ جو اُن کی زندگی میں گلے گلے سامنے آتا رہتا ہے۔ انجانے میں وہ بہت سے ایسے بھلے کام کر جاتی ہیں۔ جن کا ذکر بھی اُن کے لواحقین کو یاد نہیں ہوتا۔ مگر وہ والدین قابلِ صد تحسین ہوتے ہیں جنہوں نے ایسی عمدہ اور مثالی تربیت کی ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کا احسان ہوتا ہے۔ جو ان کے دل لوگوں کے لئے پگھل جاتے ہیں۔ وہ کسی کا درد دیکھ نہیں سکتے۔ اور ہر قربانی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ عزیزہ رخسانہ پروین بھی اپنے ماں باپ کی ایسی ہی اولاد تھی۔ جو ماں باپ کے لئے بھی ایک نگینہ تھی۔ وہ غرباء کے لئے ایک حلیم دل رکھتی ہے۔ جو اکثر پگھل جاتا تھا۔ اس کا وجود غرباء کے لئے بے چین رہتا تھا۔ اس کی محبت کے ایک دو واقعات بطور نمونہ ذکر کرتے ہیں جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بیشک خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جب انعامات سے نوازتا ہے تو ان میں وہ جوہر بھی پیدا کر دیتا ہے جو انعام کے مستحق انہیں بنا دیتے ہیں کچھ عادتیں کسبی ہوتی ہیں یعنی تربیت اور ماحول سے پیدا کی جاتی ہیں۔ اور کچھ خدا کی دین ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے ہی عطا فرماتا ہے۔ اور یہ اُس کی عنایت ہوتی ہیں۔ رخسانہ پر یہ خدا تعالیٰ کی عنایت تھی کہ وہ بچپن ہی سے سوز رکھتی تھی۔ اس کے میکے میں ایک آسیہ بشیرہ تھی جو چھوٹی عمر ہی میں یتیم ہو گئی تھی۔ اور تقریباً اس وقت رخسانہ کی عمر ۱۲۔۲۰ سال ہو گی۔ جب سے اُس لڑکی آسیہ بشیر کو اپنے سینے سے لگائے رکھا آٹھ سال تک نہایت پیار و محبت سے اُسے پالا اور اُس کی حقیقی نگہداشت کرتی رہیں۔ وہ یتیم کے لئے ہمیشہ اپنے بازو کھلے رکھتی۔ کبھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی جس سے یتیم کے معاملے میں کوتاہی ہو۔ شادی کے بعد بھی رخسانہ وہ واحد

دلہن تھی جس نے اپنے جہیز کے تمام سامان کو غرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ رخسانہ کے شوہر محترم طارق صاحب کہتے ہیں کہ ایک عجیب بات جو میں نے رخسانہ میں دیکھی وہ یہ تھی کہ شادی کے چند دن بعد ہی وہ اپنے جہیز کے سامان کو بانٹنے لگ گئی تھی۔ مجھ سے اجازت دے کر سامان غریب لڑکیوں کے جہیز میں دینا شروع کر دیا۔ جب کبھی میں نے کہا کہ رخسانہ تمہیں اپنی چیزیں اچھی نہیں لگتی ؟ کیا ہوا کیوں تقسیم کر رہی ہو ؟ تو کہتی کہ میں نے تو اپنی امی جان سے کہا تھا کہ مجھے صرف دو چارپائی وغیرہ دے دیں۔ زندگی ایسی ہی فانی چیز ہے کیا بھروسہ ہے جتنی بھی خدمت غریبوں کی کر لوں مجھے راحت نصیب ہوتی ہے۔ طارق صاحب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ غریبوں، بیواؤں کی مدد کر کے اس کے چہرے پر اتنی خوشی ہوتی تھی۔ جیسے سورج نکل آیا ہو۔ میں حیران ہوتا تھا کہ آخر اتنی خوشی کیسے محسوس ہوتی ہے کہ بے ساختہ ہنس پڑتی ہیں۔ ایک دن مجھے یاد ہے کہ (LOAD SHADING) کی وجہ سے بجلی سب کی چلی گئی تھی۔ اور ساتھ کی ہمسائی اپنے بچوں سے کہہ رہی تھی کہ خدایا ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ لالٹین ہی خرید سکیں کہ اتنے میں رخسانہ نے یہ دکھی گفتگو ماں بیٹے کی سن لی۔ فوراً اپنی جہیز والی لالٹین اُن کے گھر جا کر چھوڑ آئیں۔ جب واپس آ گئی تو میں نے کہا "اپنے گھر میں اندھیرا اور دوسروں کے گھر میں اُجالا کر آئی ہو تو کہنے لگی کیا تم اس سے خوش نہیں ہوئے تو میں نے کہا کہ تم خوش ہو تو ہم بھی خوش ہیں۔ اس اندھیرے میں، میرے ان الفاظ پر وہ اتنی خوش ہوئی کہ یہ عالم تھا کہ مجھے اس وقت ایسے لگتا تھا کہ اس کے چہرہ پر کوئی سورج نکل رہا ہے۔ اس قدر روشنی اس کے چہرہ پر تھی کہ میں حیران رہ گیا۔

اصل میں یہ ردّعمل تھا اس محبت کا جو رخسانہ کے دل و دماغ میں غرباء محتاج لوگوں کے لئے تھی۔ وہ اپنی زندگی کی سب سے زیادہ خوشی اس بات میں محسوس کرتی تھی کہ میں کسی کے کام آ سکوں۔ وہ کسی کے کام کیا آئیں۔ بلکہ اپنی جان دے کر طیبۂ

نسواں کے ہی کام آگئیں۔ جہاں تک گھر کے کام کا تعلق ہے تو رخسانہ نے ہمیشہ فعال زندگی گزاری سسرال جانے سے پہلے اُس نے تنور پر روٹی پکانی سیکھی تھی۔ صرف اس لئے کہ میری ساس کو آرام رہے کیونکہ وہاں خاندان بڑا ہے اور جاٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے لوح پر روٹی پکانی بہت مشکل امر تھا۔ لہٰذا رخسانہ پروین نے اپنے ماں باپ کے گھر سے ہی سسرال کا نقشہ جان لیا تھا۔ اور تنور پر روٹی پکانی سیکھ لی۔ خاندان سسرال میں سے تمام لوگ رخسانہ کے کام کی بہت تعریف کرتے تھے۔ طارق صاحب لکھتے ہیں کہ گھر میں بہت سے افراد اکٹھے رہتے ہیں۔ اس لئے کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ جس کا ایک بڑا حصہ رخسانہ کرتی تھی مثلاً صفائی کا کام اور استری وغیرہ کا کام ہمیشہ رخسانہ کرتی تھی۔ ابا جان، امی جان اور میرے بھائیوں کے کپڑے رخسانہ استری کر کے رکھتی تھی۔ وقت پر اور بر موقع کام کرلینا رخسانہ کا کمال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ابا جان رخسانہ کو زیادہ پیار کرتے جب کہ میری دو بھاوج اور بھی ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ مگر ہماری زندگی مثالی تھی۔ لوگ رشتہ دار اور محلے والے تمام اس کی اعلیٰ عادات کی بناء پر اس کی بڑی تعریف کرتے تھے۔

مگر

ایک چیز جو وہ انہیں نہ سمجھا سکی وہ تھا اختلاف عقیدہ۔ تمام اہل خاندان اس لحاظ سے اتنا دُور تھا کہ رخسانہ باوجود انتہائی کوشش کے اُن کو قریب نہ کرسکی یہی وجہ ہے کہ جو حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ نے تاکید فرمائی تھی کہ بچی کا رشتہ دیتے وقت بعض امور کو ضرور مدنظر رکھا جائے۔ آپ کا فرمان ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم اور اس کی بزرگ عنایات سے ہماری جماعت کی تعداد میں بہت ترقی ہو رہی ہے اور اب ہزاروں تک اس کی تعداد پہنچنے والی ہے۔ اس لئے قرین مصلحت معلوم ہوا کہ ان کے باہمی اتحاد

کے بڑھانے کے لئے اور نیز ان کو اہل اقارب کے بداثر نتائج سے بچانے کے لئے لڑکیوں کے نکاح کے بارے میں کوئی احسن انتظام کیا جاوے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو شخص مخالف مولویوں کے زیر سایہ ہو کر تعصب اور عناد اور بخل اور عداوت کے پورے درجہ تک پہنچ گئے ان سے ہماری جماعت کے نئے رشتے غیر ممکن ہو گئے ہیں جب تک کہ وہ توبہ کر کے اس جماعت میں نہ داخل ہوں اور اب یہ جماعت کسی بات میں ان کی محتاج نہیں۔ مال میں، دولت میں، علم میں، فضیلت میں، پرہیز گاری میں، خدا ترسی میں سبقت رکھنے والے اس جماعت میں بکثرت موجود ہیں اور ہر ایک اسلامی قوم کے لوگ اس جماعت میں پائے جاتے ہیں۔ تو پھر اس صورت میں کچھ بھی ضرورت نہیں کہ ایسے لوگوں سے ہماری جماعت نئے تعلق پیدا کرے۔ جو ہمیں کافر کہتے اور ہمارا نام دجال رکھتے ہیں۔ یا خود تو نہیں مگر ایسے لوگوں کے ثنا خواں اور تابع ہیں۔"

حضرت مسیح موعود ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

"یاد رہے کہ جو شخص ایسے لوگوں کو چھوڑ نہیں سکتا وہ ہماری جماعت میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ جب تک پاکی اور سچائی کے لئے ایک بھائی بھائی کو نہیں چھوڑے گا۔ اور ایک باپ بیٹے سے علیحدہ نہیں ہو گا تب تک وہ ہم میں سے نہیں سو تمام جماعت توجہ سے سن لے کہ راست باز کے لئے ان شرائط پر پابند ہونا ضروری ہے۔"

(اشتہار ۷ر جون ۱۸۹۸ء)

کفو اسی طرح کفو کا خیال ضرور رکھیں۔ کفو میں ظاہری تمدن و رہن سہن کے علاوہ دینی معیار بھی برابر ہی ہو تو فریقین کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ اگر ایک فریق متقی و پرہیز گار ہو باندھ دیا جائے دوسرا ایسے ماحول میں کہ جہاں مذہبی اقدار پامال کی جاتی ہوں تو سانس لینا بھی عورت کا مشکل امر

ہو جاتا ہے۔ دوبارہ وضاحت کرتی ہوں کہ کفو کے معنی ہیں کہ اپنی حیثیت، اپنے رنگ، اپنی طرز کا آدمی ہو۔ شریف اور متقی ہو۔ مثلاً ایک شریف آدمی بڑا مالدار ہو اور وہ ایک غریب اور فاقہ کش کو لڑکی دے دے تو یہ رشتہ دین کے لحاظ سے تو جائز ہو گا مگر وہ لڑکی جس نے مالدار گھرانے میں پرورش پائی تھی جب اس کے گھر جائے گی تو ان میں رنجش اور ناراضگی پیدا ہو جائے گی کیونکہ اس کو اخراجات کی اپنی عادات کے مطابق سخت تکلیف ہو گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک لڑکی والا اپنی حیثیت کے قریب قریب لڑکے کو دیکھ لے۔ تاکہ بعد میں میاں بیوی میں لڑائی ہی نہ ہوتی رہے یا کم از کم اپنے آپ کو دُکھیا نہ خیال کرتی رہے۔

لیکن

اس احتیاط کے اس قدر پیچھے بھی نہیں پڑنا چاہیئے کہ میری لڑکی کسی امیر الامراء کے ہاں ہی جائے۔ کیونکہ اس طرح غُرباء کی شادیاں تو پھیر ناممکن ہو جائیں۔ ہر شخص اپنی حیثیت کو دیکھ لیا کرے اور اگر تھوڑا سا فرق ہو تو اُس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ فساد اسی رشتہ میں ہوتا ہے جس میں بہت بیّن فرق ہو۔[1] یہاں تو دونوں خاندانوں میں دین کے لحاظ سے ایک بیّن فرق تھا جس کے نتیجہ میں سُکھ نہیں ہوا کرتا۔ پس مختصر یہ کہ احمدیوں کا احمدیوں سے زیادہ قریبی اور کون رشتہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب رشتوں اور قرابتوں سے بڑھ کر قرب ہے۔

لقاءِ الٰہی :۔ اسلام لقائے الٰہی کو روحانیت کی جان اور اسلام کا مغز قرار دیتا ہے۔ اور رخسانہ شہید کے

---

[1] (برکات خلافت صہ ۷۶ - ۷۵)

محبّت الٰہی

تمام واقعات کو اگر بنظر غور دیکھا جائے تو ہر واقعہ اپنے اندر ایک محبت کا سمندر لئے ہوئے ہے اور کمال محبت تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موقعہ پر بھی خدا کی محبّت تلاش کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے کہ ہر مشکل و آسان کام وہ صرف اور صرف خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کرتی رہتی تھی۔ کئی بار وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوئیں کہ آپ نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ کئی بار مفلوک الحال لوگوں سے محبت کی کہ خدا خوش ہو جائے۔ مثلاً ایک معذور بچہ ان کے سسرال کے گھر کے قریب رہتا تھا۔ سب پڑوسی اس سے نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ معذور بچہ گندا رہتا تھا لیکن رخسانہ اُس بچے سے بہت پیار کرتی تھی۔ اور اس کا بہت دھیان رکھتی تھی۔ اُن کے شوہر نے کئی بار کہا کہ "رخسانہ" اس بچہ میں سے کتنی بُو آتی ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے تو رخسانہ کا یہی جواب ہوتا۔ کہ آپ کو کیا معلوم کہ خدا اس سے کتنا خوش ہوتا ہے۔ گویا وہ متلاشی تھی رضائے الٰہی کے لئے اور ہر گلی و کوچہ میں معذور، دیوانے اور یتیم لوگوں کی مدد کر کے خدا کی "لقا" کے لئے مواقع نکال لیتی تھی۔ حالانکہ وہ عمر کے لحاظ سے شہادت کے روز ۲۱/۲۲ برس کی تھیں۔ اور اتنی کم عمری میں ماں باپ اور سسرال ان کے اس پہلو کا نمایاں ذکر کرتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے ہر لمحہ متلاشی رہتی تھی۔ اور اُسے اسی میں ہی لذت آتی تھی۔ خدا تعالیٰ کی محبت میں وہ بچپن ہی سے سرشار تھی۔ اور ان جانے میں کئی بار ماں باپ کو کہہ چکی تھی کہ میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کیسے کروں گی؟ ایک بار جب وہ پانچ برس کی تھی تو اس نے اپنے والدین سے سادگی سے کیا تھا کہ میں کب مروں گی کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہو جائے۔"

یہ جملہ واضح کرتا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ سے کتنی محبت تھی۔ اور وہ جذبہ محبت کی تکمیل وصل خدا تعالیٰ ہی میں تلاش کرتی تھی۔ اصل میں بچپن میں بچے ماں

باپ سے عجیب و غریب سوال کرتے ہیں اور مائیں ان جانے میں جواب دیتی ہیں۔ کبھی کبھی کام ہاتھ میں ہوتا ہے اور ذہن بھی کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور بچہ کو جواب آسان سا دے کر بات ختم کر دیتی ہیں کہ جب ہم فوت ہو جائیں گے تو خدا تعالیٰ سے مل لیں گے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کے وصل اور لقا کے لئے بچے کو ایسے اچھے موقع پر تربیت کے اچھے پہلو سمجھانے چاہیئے۔ اور یہ سنہری موقع ہوتا ہے کہ بچہ کے سوال کو ماں محبت الہٰی کے رُخ کی طرف موڑ کر اُسے مالک اور عبودیت کا جیتا جاگتا نشان بنا دے جو بچہ خدا تعالیٰ کی محبت سے سرشار ہو گا وہ اُس کو تلاش کرنے کے راستے نکال لے گا ماں کا فرض ہے کہ ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ تمام بلند منصوبے جو قرآن مجید نے بتائے ہیں۔ بچے کے سامنے نرم اور آسان لفظوں میں گاہے گاہے بیان کر دیا کرے جو اس کی عمر اور عقل کے مطابق ہوں۔ اور یہی وہ عبادت اور قربانی کی منزلیں ہیں جن پر چل کر بچہ تعمیری اخلاق پیدا کرے گا۔ اور بڑا ہو کر تقویٰ کی راہوں پر چل نکلے گا۔ پھر تقویٰ کی راہیں تو نجات کی راہیں ہیں اور یہی راہیں خدا تعالیٰ سے ملاتی ہیں۔ چنانچہ رخسانہ پروین ان راہوں پر چل کر خدا تعالیٰ سے جا ملی۔ یوں بھی رخسانہ پروین میں بہت سی نیک عادتیں تھیں۔ احسان کرنا۔ غریبوں کے دکھ بانٹنا۔ کسی کے کام آنا۔ اطاعت والدین و اطاعت سسرال سے سچی محبت و وفا شعاری۔ عاجزی اور انکساری، اور دُکھی انسانیت سے محبت۔ الغرض وہ ایک بچا ہوا وجود تھا۔ جو راہِ وفا میں کام آگیا۔ یہاں راہِ وفا سے میری مراد راہِ خدا ہے۔ کیونکہ وہ خدا سے محبت کرتی تھی۔ اس لئے اس کی راہ میں جان دے دی اور مستقل طور پر اُس کی محبت کو پا لیا۔

رخسانہ عزیز! تم نے وہ خواہش جو پانچ سال کی عمر میں کی تھی حقیقت میں تم اپنے لاشعور میں قربِ الہٰی کی متمنی تھیں سو تمہیں مبارک ہو کہ تم اپنے مقصد میں

کامیاب ہوگئیں اور اپنے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کی۔ کیونکہ شہید جنتی ہوتا ہے اور لقاالٰہی بھی جنت کا ہی ایک نام ہے۔" اصل بات یہ ہے کہ تمام حرکات اعمال کے لئے ایمان مثل ایک انجن کے ہے۔ جب ایمان ہوتا ہے تو سب حقوق خود بخود نظر آتے جاتے ہیں اور بڑے بڑے اعمال اور ہمدردی خود ہی انسان کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔"

(ملفوظات۔ جلد ششم ص۱۰)

اور جن کے نصیب میں ہوتا ہے اللہ تعالےٰ ان کے لئے انعام کے درجات مقرر فرما کر انعام عطا کرتا ہے۔ فرماتا ہے۔

مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت خداوندِ عالم اور اطاعت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو موجب انعام قرار دیا ہے۔ جن چار انعامات کا ذکر فرما کر خدا تعالیٰ انسانوں کو سربلندیٔ اخلاق اور حسنِ عبادت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس میں سرفہرست توحید ہی ہوتی ہے۔ توحید ہی وہ منبع ہے جس کی تمام شاخیں حقوق اللہ حقوق العباد، نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ اور حسنِ اخلاق، قربانی وحسن عبادت کی شکل میں انسان کے سامنے آتی ہیں اور اگر توحید پر پختہ ایمان انسان کو نصیب ہو جائے تو یہ سب راستے اس کو قرب الٰہی مہیا کرتے ہیں کیونکہ اس نے خدائے وحدہٗ لاشریک کو پانے کے لئے یہ راستے اختیار کئے تھے ان راہوں پر چلنے کا شوق اُسے صرف اس لئے تھا کہ وصل خدا حاصل ہو۔ وہ اپنی مانگ اور محبت میں جتنی بھی شدت پیدا کر سکی۔ یہ خدا کا فضل تھا۔ سو وہ فضل

اُس کو وصل کی منزل پر لے گیا۔ آگے اس کا نصیب کہ وہ صالح بنے یا اس سے بڑھ کر نئے انعام ملے، اور شہید بن جائے۔ یا پھر خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت کے بازو پھیلا کر اور اس سے زائد انعامات سے نواز لیا۔ یہ تو قربِ الٰہی کے مدارج ہیں اور خدا تعالیٰ کی رحمت کے بازو......

اور جب یہ رحمت کے بازو جولائی ۱۹۸۶ء میں رخسانہ پروین پر پھیلے تو وہ عید کا دن تھا۔ رخسانہ پروین نے نمازِ عید پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا مگر اس میں طارق صاحب کے بڑے بھائی نے مخالفت کی تھی اور ڈانٹ کر عید پر نمازِ عید پڑھنے کے لئے جانے سے منع کر دیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ بہت فکر مند تھی۔ اور اس روک کے نتیجہ میں اُس نے اپنے شوہر طارق سے آخری رات یعنی "شہادت" کی آخری رات یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ طارق ہم دونوں ربوہ چلے جاتے ہیں اور وہاں پر گھر بنا لیتے ہیں۔ پھر ہم پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ یہ پابندی اس پر بہت گراں تھی؛ وہ یقیناً اندر سے دکھی ہوئی ہوگی۔ اور دل نے اس نامہربانی پر آنسو بہائے ہوں گے۔ طارق صاحب (ان کے شوہر) خود لکھتے ہیں۔ "ہم بہت خوش زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ہماری شادی ۱۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو ہوئی تھی۔ خوشی خوشی ایک دوسرے کی رضا میں راضی دن گزارتے تھے کہ رمضان المبارک کا مہینہ آ گیا۔ رخسانہ نے یہ مہینہ اپنے والدین کے گھر گزارا۔ ان کے وہاں سے اس مہینے میں بہت خط آئے اور ہم وہاں نہ پہنچ سکے۔ ان کو یہ لکھتے رہے کہ ہم آج اور کل آئیں گے مگر اس میں ایک ماہ گزر گیا۔ اور پھر ہمارے والد صاحب خود اُن کو لینے آئے۔ اور جب وہ مردان شہر پہنچے تو اُن کے ساتھ ہمارا بہت اچھا دن گزرا۔ ان دنوں میں ہم ایک پل بھی علیحدہ نہ ہوئے۔ عید کی رات ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گھر والے سب سوئے ہوئے تھے۔ مگر ہم کو نیند نہیں

آرہی تھی ۔اب جب صبح ہوئی اور صبح کے سات بجے تو رخسانہ نے کہا کہ طارق!
چلو عید کی نماز پڑھ آئیں ۔ مگر دیر ہو چکی تھی ۔ اور اس سے پہلے میرے بڑے
بھائی نے ڈانٹ رکھا تھا کہ عید کی نماز گھر پر پڑھنی ہوگی ۔ اور میں نے اُس سے
کہا کہ اب اگر تیار ہوں گے تو دیر ہو جائے گی اور عید کی نماز نہیں پڑھ سکیں گے ۔
اس نے کہا کہ ہم اسی طرح عید کی نماز پڑھنے جاتے ہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ پھر ہم اسی
سے بولے کہ شادی کے بعد یہ ہماری پہلی عید ہے اور مسجد میں لوگ کیا کہیں گے ۔
مگر اس نے میری بات نہ مانی اور ہم دونوں پرانے کپڑوں میں ہی مسجد چلے گئے ۔
جب یہ بیت الذکر پہنچی تو وہاں کی عورتوں نے ہم سے بعد میں
کہا کہ جب یہ بیت الذکر میں داخل ہوئیں تو کوئی جیولری اس کے جسم پر نہیں تھی
اور نہ کوئی نیا لباس اس کے جسم پر تھا ۔ اُس نے پُرانے جوتے پہنے ہوئے
تھے اور ظاہری طور پر تو یہ بڑی خوش نظر آرہی تھی مگر یہ لڑکی لگاتار روتی رہی جب
یہ نماز سے فارغ ہوئی تو ہم گھر آرہے تھے تو یہ راستے میں بہت خوش تھی ۔ اور مسکرا
رہی تھی ۔ مگر میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود مسکرا رہی ہے اور جب
ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب سے میل ملاپ کر کے ناشتہ تیار کرنے لگی ۔ اُس
وقت امی جی گھر میں برتن صاف کر رہی تھیں ۔ برتن میں کچھ چاول پڑے تھے ۔ وہ
امی پڑوسیوں کے گھر دینے گئیں تھیں ۔ اور بڑی بھابھی اپنے والدین کے گھر جو
ہمارے گھر کے قریب ہی ہے وہاں گئی ہوئی تھیں اور بڑا بھائی اپنے دوست سے
ملنے باہر گیا ہوا تھا اور والد صاحب ابھی دکان پر تھے اور جب ہم اس وقت
دیکھتے تھے تو حیران تھے کہ یہ آج اتنی خوش کیوں ہے ۔ سب گھر والوں کے ساتھ
وہ بہت خوش خوش ملی تھیں ۔ اور جب ہم اوپر چھت پہ گئے تو چند منٹ کے بعد
ہمیں ایک گولی کی آواز سنائی دی ۔ پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر چوتھی ۔

مگر فائزہ کی آواز بہت آہستہ تھی۔ اور ان آوازوں میں ان کی آواز بھی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ تھی۔ ہم اوپر سمجھ رہے تھے کہ کوئی بچہ شرارت کر رہا ہے۔

جب ہم نیچے اترے تو وہ سیڑھیوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ اور پھر ان کی آواز ہائے، ہائے، ہائے تین مرتبہ بولیں اور ہم نے ان کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ وہ ابھی کھڑی ہی تھیں۔ جب ہم نے ان کو اندر لے کر چارپائی پر ڈالا تو ہماری نظر اپنے سینے پر پڑی تو ہمارے سینے پر خون کے نشان تھے جب ہم نے ان کے سینے کو دیکھا تو وہاں بھی نشان تھے۔ مگر اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ خون کس کا ہے؟ ان کی سانس صرف چند سیکنڈ ہی رُکی اور پھر وہ اللہ کی پیاری ہو گئی۔ اور اس کے بعد ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا جنازہ کس وقت ہوا۔ اور کہاں ہوا؟ تیسرے دن ہم کو معلوم ہوا کہ ان کو ربوہ میں دفن کر دیا گیا ہے۔" طارق صاحب یہ حالات واقعات خود لکھتے ہیں اور اسی طرح ترتیب دیتے ہیں آگے پھر کہتے ہیں کہ "ہم کو بہت کہتی تھی کہ طارق اگر ہم اللہ کو پیارے ہو جائیں تو ہم کو پہاڑوں کے قریب دفن کرنا۔ مگر جب ہم ربوہ گئے تو ان کا مزار دیکھا تو وہ واقعی پہاڑوں کے درمیان تھی۔ شہادت کی رات جب بڑے بھائی نے کہا کہ طارق تم دونوں نے صبح نماز عید پڑھنے نہیں جانا تو وہ کہنے لگی ہم دونوں ربوہ چلے جاتے ہیں۔ اور وہاں گھر بنا لیتے ہیں پھر ہم پر وہاں کوئی آدمی پابندی نہیں لگا سکتا۔ ہم نے جب بھی ان کو دیکھا مسکراتے دیکھا۔ چاہے وہ کس طرح کا لمحہ ہو۔ اگر ناراض بھی ہوتی تھیں تو بھی مسکراتی رہتی تھیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے ہم سے بے وفائی کی خود چلی گئی اور ہم کو اکیلے چھوڑ گئی ہیں۔"

شہادت عید ہے

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (خدا تعالیٰ آپ سے راضی ہو) فرماتے ہیں۔

"شہادت بھی ایک عید ہے"[۱] اور جو شخص عید کے دن شہید کر دیا جاوے تو اُس کی دو عیدیں جمع ہو جاتی ہیں۔ "نگینے لوگ" میں ہم دیکھتے ہیں کہ شہدا میں سے ایک ناصر احمد شہید اور ایک خسانہ پروین شہید دو ایسے خوش نصیب ہیں جنہیں کچھ ناعاقبت اندیش لوگوں نے عید کے دن شہادت کا جام پلا کر اپنے ہی ہاتھوں سے خدا تعالیٰ خود ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ کیونکہ "شہادت کا بدلہ خدا خود دے"[۲]

اور جب کسی کو خدا تعالیٰ ہی انعام میں مل جائے تو اُسے کیا حاجت باقی رہتی ہے؟ ہم ہر روز ہر نماز کی ہر رکعت میں دعائیں مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ انعام عطا کر جو تیرے مقرب بندوں کو نصیب ہوتا ہے ہمیں نبیوں اور ولیوں کے کمالات کی راہوں پر ڈال دے۔ اور ہمیں بزرگ ہستیوں کے رنگ میں رنگین کر دے۔

آخر کیوں؟

صرف اور صرف اس لئے کہ ہم ہر ناپاکی اور پلیدی سے پاک ہو کر انعام یافتہ لوگوں کے وارث بن جائیں۔ اور یہ کہ ہم خدا تعالیٰ کو شناخت کر لیں اور یہ کہ ہم اس کے ہو جائیں اور وہ ہمارا ہو جائے۔

پس جس امر کے حصول کے لئے انسان دعائیں مانگتا ہے اگر وہ اُسے

---

[۱] [۲] خطبات محمود صد ۱۱۹

نصیب ہو جائیں تو وہ مقرب لوگوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر رحمت باری تعالیٰ وہ عید کے دن عین نماز عید کے بعد پروردی گار عالم کی گود میں جا بیٹھتا ہے تو اس کی عید آج حقیقی عید ہے۔ کیونکہ آج اس نے حقیقی چاند کا منہ دیکھ لیا ہے۔ پس وہ مبارک وجود اپنی منزل کو پا گیا۔ الحمدللہ

لیکن

منزل کی بات یہاں ختم نہیں ہوئی کیونکہ جو لوگ قوم کے لئے سر دیتے ہیں۔ ان کی منزل ہی جدا ہوتی ہے۔ اُن کی قربانی قوم کے لئے ہوتی ہے اور قوم کی زندگی کے لئے وہ اپنی زندگیاں دیتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے اور وہ قربانیوں پر رنج نہیں کیا کرتے۔ بلکہ قوم کے نام ایک زندہ پیغام چھوڑتے ہیں جو ہمہ گیر ہوتا ہے۔ مہربان مصلح الموعود لکھتے ہیں کہ" لوگوں کی تو سال میں ایک عید ہوتی ہے لیکن حضرت مسیح موعود (خدا تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) کی جماعت میں داخل ہو کر تمہارے لئے ہر روز عید ہے۔ پس خوش ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں قربانی کے لئے چُنا ہے۔ اس لئے ان مصیبتوں تکلیفوں اذیتوں اور آفات کی قدر کرو۔ کہ یہ رتبہ بڑھانے والی چیزیں ہیں۔"

میرے پیارو! خدا کے پیاروں پر
—— دائماً بھیجتے سلام چلو

سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد قدرت ثانیہ کے مظہر رابع نے خطبہ جمعہ ۲۰ رجون ۱۹۸۶ء کو پہلی احمدی عورت کی شہادت کا ذکر ہوئے فرمایا :-

" یہ نہ مٹنے والی سعادت ہے جو اس دور کی قربانیوں میں ایک نئے دور کا اضافہ کر رہی ہے ایک نیا سنگ میل رکھ رہی ہے ۔ کیونکہ احمدی خواتین میں سے ایک پہلی خاتون ہیں جنہیں اس دور میں اللہ کی خاطر جان دینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے ۔ ان کا نام رخسانہ تھا اور اُن کے خاوند طارق احمدی تھے لیکن طارق صاحب کا بھائی بشارت احمدی نہ تھا اور حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ اور جماعت کے خلاف بدزبانی کرتا تھا اور اپنی بھابھی کو عبادت سے روکتا تھا اور احمدیہ دارالذکر میں جانے پر قتل کی دھمکیاں دیتا تھا ۔ چنانچہ ۹ رجون عید کے روز جب رخسانہ اور طارق عید کی نماز پڑھ کر واپس آئے تو بشارت نے اپنی بھابھی کے ساتھ جھگڑا کیا کہ کیوں تم احمدیوں کے ساتھ نماز پڑھنے گئی تھیں اور پھر اُسی دوران تین فائر کر کے رخسانہ کو قتل کر دیا ۔

احمدی خواتین جن کی بڑی کثرت سے اس دُعا کے لئے حضور کی خدمت میں خط آتے ہیں کہ انہیں بھی خدا کی راہ میں جانی قربانی کی سعادت نصیب ہو ۔ انہیں مخاطب کرتے ہوئے حضور نے فرمایا :-

" احمدی خواتین قربانیوں میں ہرگز اپنے مردوں سے پیچھے نہیں ۔ وہ بیوگان جو پیچھے رہ گئیں ، ان کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ قربانی کے ثواب سے محروم رہ گئیں یہ غلط خیال ہے ۔ مردوں کو خدا کی راہ میں جانی قربانی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی عظمت کے اندر ان بیواؤں کی عظمت بھی

شامل ہوتی ہے۔ اسی طرح سب مائیں جن کے بیٹے اور بہنیں جن
کے وِیر خدا کی راہ میں مارے گئے۔ یہ سب قربانیوں میں شامل ہیں
اور عورتیں ہرگز قربانیوں میں مَردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۰؍جون ۱۹۸۶ء)

محترمہ رخسانہ صاحبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل احمدی خواتین نے بھی راہِ وفا میں
جان کا نذرانہ پیش کیا۔

۱۔ محترمہ اہلیہ صاحبہ حاجی میراں بخش صاحبہ انبالہ ۱۴/۱۳؍اگست ۱۹۴۷ء
۲۔ محترمہ رشیدہ بیگم صاحبہ اہلیہ قاری عاشق حسین صاحب سانگلہ ہل،
۹؍اگست ۱۹۷۸ء
۳۔ انڈونیشیا کی دو خواتین۔ محترمہ ایڈوٹ صاحبہ اور محترمہ اولیہ صاحبہ
جماعت چیانڈرم۔ اندازاً ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء

رخسانہ ایک نظر میں

۱۹۶۴ء تا ۱۹۸۶ء

نام	رخسانہ پروین اہلیہ محمد طارق صاحب
ولدیت	محترم مرزا خاں صاحب آف سرگودھا
بیعت	پیدائشی احمدی
تاریخ شادی	نومبر ۱۹۸۵ء
شہادت	جولائی ۱۹۸۶ء
بہن بھائی	احسان اللہ خان، عفت یاسمین، عصمت طاہرہ، فرزانہ مرزا مبارکہ مرزا
مقام شہادت	مردان
آلۂ قتل	بندوق (گولی سینہ پر لگی)
تعلیم	انٹرمیڈیٹ
شمائل	پنجابی زبان بولتی تھیں۔ شمائل کے اعتبار سے وہ چھوٹی سی عمر میں بڑی سوچوں کی مالک تھی۔ ایک دردمند دل رکھنے والی بیٹی بہن اور بیوی ہمیشہ دکھوں کو بانٹتی رہی اور آخری لمحہ زندگی بھی درد کے سپرد کر کے خاموش ہو گئی۔

موت سے ڈر جائیں گے کیسے موت ہماری منزل ہے
خون کی بوندیں اپنی دولت بہتے آنسو زر ہیں بہت

غفلت میں عمر کی رات کٹی ۔ دِل میلا بال سفید ہوئے
اُٹھ چلنے کی تیاری کر ۔ سورج سر پہ چڑھ آیا ہے

بابو عبد الغفار شہید

۱۹۰۶ء سے ۱۹۸۶ء تک

محترم بابوجی ایک ماسٹر جی کی اولاد تھے ۔ اور ایک ماسٹر صاحب ہمیشہ اپنے اہل و عیال میں سے کم از کم ایک بچے کو آدابِ حیات ضرور سکھلا دیتا ہے ۔ سب سے پہلے جو چیز سامنے آتی ہے وہ بابو عبد الغفار صاحب کا خدمتِ خلق کا پہلو ہے یہ پہلو اتنا اجاگر ہے کہ اگر انہیں " ربوہ آباد کا خادم " کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ بیشک سید القوم خادمھم کے وہ حقیقی مصداق تھے ۔ اور یہ جذبہ انہیں وراثت میں اپنے والد محترم ماسٹر محمد خدا بخش سے وافر مقدار میں ملا تھا ۔

ماسٹر محمد خدا بخش صاحب کانپور میں رہائش پذیر تھے کہ خدا تعالیٰ نے بارہ ربیع الاوّل ۱۹۰۶ء میں انہیں ایک بیٹے سے نوازا ۔ جس کا نام انہوں نے محمد عبد الغفار رکھا ۔ خدا تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے انہیں وقت کے امام کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائی ۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں اپنے تمام افراد خاندان کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ آپ سے راضی ہو) کے مبارک ہاتھ پر بیعت کر لی اور سلسلہ احمدیت میں شمولیت اختیار کی جبکہ بابوجی کی عمر اس وقت دس سال تھی ۔ آٹھ ، دس افراد پر مشتمل یہ کنبہ " اپنی مدد آپ کے اصول پر کاربند " زندگی گزار رہا اگرچہ ماسٹر خدا بخش ساری عمر فوج میں رہے اور پاکستان بننے سے پہلے ہی ریٹائر

ہو گئے تھے۔ سادگی ان کا شعار تھا جو انہوں نے تاحیات اپنا یا وہ بے حد نیک اور احمدیت کے شیدائی تھے۔ ہر وقت خدمتِ خلق کے لئے کوشاں رہتے ساری ساری رات عبادت میں گزارتے اور گھر میں پانچوں وقت نماز باجماعت کا التزام کیا کرتے تھے فجر کی نماز کے بعد درس قرآن مجید ماسٹر جی دیا کرتے تھے۔ صبح کے ناشتہ کے بعد بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے۔ جب تک آپ زندہ رہے تمام خاندان کے بچوں کو خود قرآن کریم کی تعلیم سے نوازا۔ نماز با ترجمہ یاد کرواتے اور گھر سے فارغ ہوتے تو پھر محلہ اور محلہ سے باہر کے غیر از جماعت بچوں کو قرآنی تعلیمات سے مستفید کیا کرتے تھے اس طرح ہزاروں کی تعداد جن میں لڑکے اور لڑکیوں کے علاوہ عورتوں نے بھی قرآن کریم اور معمولی اردو کی تعلیم حضرت ماسٹر خدا بخش سے حاصل کی۔ خدمتِ دین سے سرشار ہمہ وقت اپنے آپ کو خدمتِ خلق پر مامور رکھتے تھے آپ ہمیشہ پیدل چلنا پسند فرماتے تھے۔ ہر ایک کو سادگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے۔ جب تک زندہ رہے ہر سال جلسہ سالانہ پر ضرور جاتے اور کوشش کرتے کہ اپنے ساتھ کسی نہ کسی غیر از جماعت کو ساتھ لے جائیں۔ اپنے گھر، محلہ، شہر در شہر میں محبت کا یہ سفیر یکساں مقبول تھا۔ بہت خوش مزاج اور دل موہ لینے والی شخصیت تھے۔ آپ کی ذات ہر لحاظ سے ایسی خوبیوں کا گلدستہ تھی جن کی جدائی پر آج بھی آنکھ اشکبار ہے

لہٰذا آپکے بیٹے بابو جی کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اور یہ جذبہ بھی اپنے والدِ محترم سے نصیب ہوا تھا۔ آپنے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ علم حاصل کیا۔ خدا تعالےٰ نے آپ کو دنیاوی علم کے ساتھ دین کا بھی بہت علم دیا ہوا تھا۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب تک صحیح علم نہ ہو دعوت الی اللہ بھی احسن رنگ میں نہیں ہو سکتی

آپ بہت بڑے داعی الی اللہ تھے۔ خود بھی بہت مطالعہ کرتے تھے اور سب کو تاکید

کرتے تھے۔ آپ نے اکثر بڑے بڑے لوگوں سے مباحثے کیے اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ قرآن وحدیث کے دلائل سے مخالف کو بولنے کا موقع نہ دیا کرتے آپ کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا جن میں زیادہ غیر از جماعت دوست بھی تھے اور لوگ بڑی عزت کرتے تھے۔ آپ کی بدولت اکثر لوگوں نے احمدیت قبول کی۔

آپ کی مادری زبان اردو تھی۔ مگر انگلش پر بھی عبور حاصل تھا۔ انگلش لٹریچر کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ ۱۹۲۹ء میں کانپور میں ہی ازدواجی زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ فضل النساء بیگم صاحبہ محترم نسیم احمد خاں صاحب کی دختر تھیں۔ مولوی عبدالاحد صاحب رفیق حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ آپ کے ہم زلف تھے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو ۹ بچے عطا کیے جن میں پانچ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے۔ خدا کی دی ہوئی توفیق سے تمام اولاد تعلیم یافتہ ہے اور بچے بھی بابو جی کی خواہش کے مطابق علم کے میدان میں ترقی پذیر رہے۔ اگرچہ تمام بیٹوں نے اپنے والد محترم کا پیشہ فوٹوگرافی ہی اپنایا اور بڑی محنت سے نیا اسلوب دریافت کیا اور زندگی کے ہر موڑ پر بابو فیملی آپ کو کیمرہ کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ ایک دفعہ میری ذاتی شنید ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ آپ سے راضی ہو) نے فرمایا تھا کہ بابو غفار کی فیملی کا بچہ کیمرہ لے کر ہی پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت میں کیمرہ کے ساتھ اس خاندان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دینی لحاظ سے خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس خاندان کے افراد نے ہمیشہ احمدیت کو امتیازی شان سے سینے سے لگائے رکھا اور ہر قربانی کے لئے تیار رہے۔ شہر میں بچہ بچہ جانتا پہچانتا تھا کہ احمدی ہیں

علم قرآن وحدیث

بابو جی کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضلوں سے نوازتے ہوئے قرآن مجید کی محبت بھی

عطا کی ہوئی تھی۔ وہ تفسیر صغیر اور تفسیر کبیر کا مطالعہ ہر روز بلا ناغہ گھنٹوں کرتے تھے۔ اور اب تو بڑھاپے میں ان کا یہی واحد شغف تھا۔ احادیث سے بھی فطری لگاؤ تھا۔ اور اور مشہور کتابوں کا مطالعہ ہمیشہ رکھتے تھے۔ اور دعوت الی اللہ میں بھی احادیث و قرآن کا حوالہ دے کر ثابت کیا کرتے تھے اور دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر وہ دعوت الی اللہ کے لئے نوٹ بک بھی رکھتے اور زبانی بھی حوالہ جات یاد رکھتے۔ اکثر لوگ اُن کے دلائل کو تسلیم بھی کرتے تھے مگر بعد میں ملائیت آڑے آجاتی تھی چونکہ بابوجی کا حلقہ غیر از جماعت احباب میں بہت وسیع تھا اس لئے لوگ ان کی ہر دعوت کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ غیر از جماعت لوگوں نے بہت وسیع پیمانہ پر میلاد شریف کروایا تھا۔ اس میں سندھی، پنجابی اور مہاجر تقریباً ۵۰۰، ۷۰۰ کے قریب خواتین تھیں۔ بہت وسیع انتظام تھا۔ ان لوگوں کی انتظامیہ سے بابوجی وعدہ لے کر آئے تھے کہ ایک میری احمدی مقررہ کو تقریر کرنے کا موقع دینا پڑے گا۔ یہ تقریباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے بابوجی امیر جماعت تھے اور میں اس وقت صدر لجنہ اماء اللہ تھی۔ چنانچہ بابوجی نے مجھے لکھ کر بھیجا کہ آپ خوب جامع تقریر کریں اور اس کی تیاری خوب محنت سے کریں۔ احمدی عورتیں وہاں نہیں تھیں میں نے "سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کے رحمت کے بازو" پر تقریر کی اور یہ ایک کامیاب موقع دعوت الی اللہ کا رہا۔ بعد میں بابوجی کے پاس کئی مردوں نے اپنی بیویوں کی گواہی پر اظہار خوشنودی کیا۔ کیونکہ تقریر صرف میری تھی باقی میلاد گا گا کر پڑھنے والی عورتیں تھیں۔ الغرض بابوجی بہت نڈر اور وسیع القلب احمدی تھے۔ ایک لمبے عرصہ تک جماعت کی امارت آپ کے سپرد رہی اور اکثر بیوت الذکر میں امامت بھی آپ ہی کو میسر رہی۔ حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نہ صرف خود ارشادات پر عمل پیرا ہوتے بلکہ ہر ملنے والے کو تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔ آپ ہمیشہ

چندہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کیونکہ گھر کے معاملہ میں آپ بے جا مصرف پسند نہ کرتے تھے اس لئے چندہ وقت پر ادا کر لیتے۔ چونکہ وہ موصی بھی تھے۔ اس لئے وصیت کے معاملہ میں بہت محتاط رہتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے وقف عارضی میں کئی بار حصہ لیا۔ اور اب تو جماعت کے لئے اپنے وجود کو مکمل طور پر وقف کر دیا ہوا تھا۔

محبت الٰہی و عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شہادت ایک ایسا انعام ہے کہ جو محبّت الٰہی کے جواب میں ملتا ہے۔ اور محبت الٰہی وہی لوگ کرتے ہیں جو ہر ایذاء کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ وہ دُکھ اور تکلیف سے اس حد تک بے پرواہ ہو جاتے ہیں کہ خود کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا نشہ ہوتا ہے اس کے استعمال سے محبت کا درجہ اوپر سے اوپر ہوتا جاتا ہے اور ایک دن وہ جان ہی نذرانہ میں اپنے محبوب کو پیش کر دیتا ہے۔ اسی طرح باپوجی عبدالغفار صاحب امیر جماعت احمدیہ حیدرآباد خدا تعالیٰ کی محبت میں سرشار تھے۔ ہر وہ کام جس میں خدا تعالیٰ کی رضا شامل ہو اپنا ایمان سمجھ کر کرتے تھے اور ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ سے محبت کرو وہ تم سے محبت اپنے فضل سے کریگا اور ہر پریشانی سے خود بچائے گا۔ ہر وقت خدا تعالیٰ کے فضل و احسان پر شکر ادا کرتے کہ اس نے خلافت احمدیّہ کو ماننے کی سعادت بخشی اور میرے علم میں اضافہ فرمایا اور ہر قدم پر میری راہ نمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت میں بھی ایک یکتا مقام رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ احمدیت یعنی دینِ حق پر اپنی جان تک قربان کر دی۔ خدا کے فضل سے یہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت کا نتیجہ تھا کہ ہمیشہ نماز، روزہ وتلاوت پر پابندی سے سختی

کے ساتھ عمل کرتے اور کرواتے بھی تھے۔

اسی طرح بانیِ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے عقیدت و محبت بھی مثالی تھی آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگوں نے ۱۹۸۴ء کے آرڈی نینس کے بعد بہت ڈرایا دھمکایا اور تکلیفیں دیں مگر آپ کے قدم ہرگز ڈگمگائے نہیں بلکہ محبت بڑھتی چلی گئی۔

اعلیٰ زندگی کا نمونہ

اپنے خاندان میں بڑے تھے اس لئے سب سے محبت و شفقت سے پیش آتے۔ کسی کو کبھی مدد کی ضرورت ہوتی تو اپنی خدمات پیش کر دیتے اپنے اہل و عیال میں بے مثال زندگی گذاری۔ تمام بچے بہت نیک اور سعادت مند تھے۔ ہمیشہ نماز با جماعت پڑھا کر خوش ہوتے بچوں کی شادیاں وقت پر کیں اور بہت جلد نانا، دادا اور پھر پرنانا، پردادا بن گئے۔ دو بیٹوں کی جوانی میں رحلت سے بہت دکھ ہوا۔ مگر اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ دونوں بیٹوں کی بیواؤں اور ان کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی اٹھائی۔ بڑے بیٹے ذوالفقار احمد قریشی کی اہلیہ آصف جہاں بنت حکیم عبدالصمد صدیقی مرحوم رفیق حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی وفات پر بہت صدمہ کیا کیونکہ بڑی بہو تھیں۔ بہت نیک، بڑی سعادت مند اور بہت خوبیوں کی مالک تھی۔ ساس، سسر کے علاوہ تمام افرادِ خاندان کی بہت چہیتی تھیں۔ آپ اطلاع ملتے ہی اپنی اہلیہ کے ساتھ لندن روانہ ہو گئے۔ اور نو ماہ لندن میں بچوں کے ساتھ قیام کیا۔ ۱۹۸۴ء میں اہلیہ بھی دو دن کی معمولی علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ اُن کی وفات کے بعد ان کی تدفین احمدیہ قبرستان میں کروائی اور روزانہ نمازِ فجر کے بعد قبرستان جایا کرتے تھے۔ اپنی تمام بیٹیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ عید یا کسی بھی موقع پر جب تمام بیٹیاں اکٹھی ہوتیں تو بہت خوش ہوتے تھے۔ تعلیم پر بچوں کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے تھے کہ اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کرو۔ دینی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش

رہو۔ بہت پیاری نصائح سے بچوں کو نوازتے تھے۔ آپ ہمیشہ خود بھی سچ بولتے اور تاکید کرتے کہ سچ پر ہمیشہ قائم رہو۔ اکثر خواب پورے ہوئے۔ خواب دیکھتے اور اس کی تعبیر سے آگاہ کرتے۔

مرکزی امتحان میں شمولیت

مرکزی امتحان میں ہمیشہ اپنے بچوں کو شرکت کے لئے کہا کرتے تھے اکثر بیٹیاں امتحان میں شریک ہوئیں اسی طرح خود بھی کئی بار مرکزی امتحان میں شمولیت کی بلکہ شہادت سے پہلے تقریباً سب امتحان دیئے تھے۔

جذبہ قربانی

قربانی پیش کرنے کا کوئی موقعہ بھی اگر آتا تو بابو عبدالغفار شہید سب سے آگے ہوتے۔ ہمیشہ وہ جماعت کے کی پرابلمز حل کرتے اور ہر گھر سے ایسے واقف تھے جیسے اپنے گھریلو مسائل سے انسان آشنا ہوتا ہے۔ چونکہ خود کو جماعت کے لئے وقف کیا ہوا تھا۔ ہر کام کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے۔ جلسہ سالانہ پر غیر از جماعت دوستوں کو اپنے ساتھ اپنے خرچہ پر لے کر جایا کرتے تھے۔ جماعت کو اندرون سندھ یا باہر کہیں بھی کسی وقت ضرورت پڑے بابو جی نے رات دن کا امتیاز ختم کرکے وہاں حاضر ہوجانا اپنا ایمان خیال کیا ہوا تھا۔ حیدرآباد میں احمدیوں کے لئے کوئی قبرستان نہیں تھا۔ بابو جی نے ہر ممکن کوشش کرکے احمدیوں کے لئے قبرستان کی زمین حاصل کی۔ اور مکمل چار دیواری خود کھڑے ہوکر تیار کروائی۔ بلکہ زمین قبرستان کو جا جا کر اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کیا اور اس کی سیڑھیاں وغیرہ بنوائیں۔ بابو جی اس بات پر بڑے خوش ہوتے کہ دارالذکر کے صدر دروازہ پر منارۃ المسیح کی تصویر لوہے کے اندر بنوائی ہے۔ پھر جہاں تک درخت پودوں کا کام ہوتا دارالذکر میں ہمیشہ بابو صاحب سرانجام دیتے اور خدام سے وقار عمل کرواتے رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد

ہیں بابو غفار صاحب جماعت کی جان تھے ۔ وہ جماعت کے لئے ہر کام وقار کے ساتھ کر گزرتے تھے ۔ بیشک ایسے لوگ نظام جماعت میں ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں ، اور اپنا وقت پورا کر کے جب وہ چلے جاتے ہیں تو ان کی یادیں ان کو زندہ رکھتی ہیں ۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

جماعت کے لئے جذبہ قربانی کا جو معیار بھی قائم کریں ۔ اگر بابو صاحب کو اس میں پرکھیں تو وہ تقریباً ہر معیار پر پورے اُترتے تھے ۔ امن ہو یا خوف کے ایام ہوں بابو عبد الغفار صاحب حسب معمول صبح سویرے نکلتے اور لوگوں کے مسائل حل کرتے چلے جاتے ۔ کہیں کہیں ان کو مشکلات کا بھی سامنا ہوا مگر چونکہ ان میں بے خوفی کی ایک طاقت تھی اس لئے کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے ۔ حق بات برملا کہہ دیتے تھے ۔ مثلاً ۱۹۸۴ء کے آرڈی نینس میں صدر ضیاء الحق نے جب یہ قرارداد پاس کی کہ مسلم نہ ہونے کی وجہ سے احمدی نہ تو سلام کر سکتے ہیں نہ کلمہ پڑھ سکتے ہیں اور آذان پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی

مگر

بابو غفار صاحب نے اپنی دلیر طبیعت کی بناء پر ہمیشہ غیر احمدیوں سے روابط رکھے اور انہیں اپنا نصب العین بتاتے رہے ۔ چونکہ وہ لوگوں کے کام آتے تھے اس لئے تمام بازار میں ان کی مخالفت کبھی نہیں ہوتی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی وفات پر تمام کاروبار ایک دن کے لئے روک دیا گیا تھا ۔ یہ ایک بہت بڑی ملنساری

اور رابطے کی علامت ہے کہ انسان جب غیر حاضر بھی ہو تو عوام اس کے لئے درد محسوس کریں اور اپنا کاروبار معطل کر کے ہڑتال کا اعلان کر دیں ۔ بلکہ ۱۹۸۴ء کے آرڈی نینس کے بعد عوام خاص طور پر حیدر آباد کا کاروباری طبقہ بیشتر گفتگو انہی پابندیوں

پر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ جوں جوں سختیاں بڑھتی گئیں لوگ احمدیت سے زیادہ آشنا ہوتے گئے۔ بہت زیادہ لوگ جاننے کی کوشش کرتے۔ اور آپ سے مباحثہ کیا کرتے۔ زیر ہو جانے کے بعد اکثر لوگ یہی کہتے بات تو بالکل صحیح کہتے ہیں مگر حکومت آپ کے حق میں نہیں۔ سندھ اور پنجاب سے اسیران کی تعداد دن بدن بڑھتی رہی۔ اور مذہبی جنونی مولویوں کو احمدیوں کے خلاف ہر قسم کے تشدد کو ہوا دینے کی کھلی چھٹی تھی۔ تمام سرکاری ایجنسیاں احمدیہ دشمنی میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ سکھر میں مسجد پر بم پھینکنے کا واقعہ ہوا اور اس کی ذمہ داری احمدیہ جماعت پر عائد کر دی۔ چیدہ چیدہ سرکردہ اشخاص کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف جگہوں پر وارداتیں کی جاتیں اور ان کا ذمہ دار احمدیہ جماعت کو قرار دیا جاتا۔ ایسے تمام واقعات کے بعد منصوبہ یہ تھا کہ پورے پاکستان میں احمدیوں کا قتل عام شروع کر دیا جائے لیکن اس بھیانک مقصد میں ضیاء حکومت کو کامیابی نہ ہو سکی۔ کیونکہ ملک کی اکثریت احمدیوں کے لئے ہمدردی اور احترام کے جذبات رکھتی تھی۔ یکم مئی ۱۹۸۴ء کو جب عبدالرحمٰن قریشی صاحب کو سکھر میں دن دیہاڑے بیت الذکر سے گھر آتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔ آپ بے حد افسردہ ہوئے کہ ضعیف آدمی تھے اور خنجروں سے سولہ کاری ضرب لگا کر انہیں چھلنی کر دیا گیا۔

یہ سب سوچے سمجھے منصوبے ہیں جن پر عمل ہو رہا ہے۔ قریب ترین دوست و احباب میں ڈاکٹر صاحب کے بھائی اور خود ڈاکٹر عقیل کی شہادت پر اطلاع ملتے ہی فوراً گھر پہنچے۔ تمام کارروائی اور تدفین تک ساتھ رہے۔ گھر پر آکر بہت روئے اور رو رو کر دعا کی خدا تعالےٰ ہمیں استقامت عطا فرما اور بشاشت کے ساتھ ہر قسم کے تشدد کو برداشت کرنے کی توفیق اور صبر عطا فرما۔

بحیثیت داعی الی اللہ

بابو عبدالغفار صاحب کی زندگی کے شب و روز پر اگر غور کیا جائے تو تقریباً ہر دن ان کا دعوتِ الی اللہ میں گزرتا تھا۔ کبھی دوکاندار کو اور کبھی راہ گیر کو کسی نہ کسی حیلے بہانے ضرور دعوتِ الی اللہ پہنچاتے تھے۔ چونکہ نماز با جماعت کا بہت التزام کرتے تھے اس لئے ہمیشہ ملاقات کا سلسلہ زندہ رکھتے تھے۔ حقیقت میں وہ ایک مجلسی، دینی و تربیتی شخصیت تھے۔ خوش مزاجی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ تہجد و صلوٰۃ التسبیح کا بھی بہت اہتمام کرتے تھے۔ ان کی زبان بھی خدا تعالیٰ کی حمد سے تر رہتی اور جماعت کے لئے تو مجسم دعا بن کر زندہ تھے اور جب اپنے حقیقی مولیٰ کو ملے تو جماعت کو ہی زندہ رکھنے کے لئے زندگی جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء کے ہنگامی حالات میں ایک مثالی حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کیا لیکن ۱۹۸۴ء میں معجزانی حوصلہ دکھایا۔ **اور ایک دن ابدی زندگی پا گئے۔**

۹ر جولائی ۱۹۸۶ء بروز بدھ تقریباً پونے ایک بجے دوپہر اپنے شوروم میں کرسی پر بیٹھے تھے۔ اس وقت دوکان میں صرف ایک ملازم موجود تھا جو ڈارک روم میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ دوسرا ملازم چائے وغیرہ کی ضرورت پر اکثر چلے جاتے تھے۔ اس دن خدام بھی اُن کے ساتھ نہ تھے۔ آپ خود بھی اکثر خدام کو واپس بھیج دیتے تھے کہ جاؤ میں ٹھیک ہوں اور دوسرا ملازم بھی میرے ساتھ ہیں اسی دوران درندہ صفت بدبخت نے بڑی بے دردی سے چھری سے پے در پے وار کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کے ہاتھوں کے نشانات سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ نے آخری وقت تک اس سے مقابلہ کیا ہے۔ آپ کا ملازم جب کسی کام

سے ڈارک روم سے باہر آیا تو اس نے عجیب سی آواز سُنی۔ اس وقت تک آپ زندہ تھے۔ اس نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کیا۔ فون کئے۔ اسی وقت ہاسپٹل لے جایا گیا۔ راستہ میں ہی آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن

تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور عقیدت رکھنے والوں نے تمام دکانیں بند کر دیں اور پورے حیدر آباد میں مکمل ہڑتال ہو گئی۔ جماعت کے تمام افراد کے علاوہ غیر از جماعت کا ایک ہجوم تھا جو شہید کی ناگہانی جدائی سے اشکبار تھے۔ اپنے محسن کے لئے اپنے اپنے طور سے تعزیت کا اظہار کر رہے تھے۔

ایک نظر میں

۱۹۰۶ء ——— ۹ر جولائی ۱۹۸۶ء

نام	محمد عبد الغفار ولد ماسٹر محمد خدا بخش
تاریخ بیعت	بمعہ خاندان ۱۹۱۶ء میں خلیفۃ المسیح الثانی (اللہ آپ سے راضی ہو) کے ہاتھ پر
قد و قامت	۶ فٹ اردو زبان بولتے تھے۔
بچپن کا دوست	مرزا صالح علی مرحوم، ڈاکٹر عبد الرحمٰن موگا، چودھری رحمت علی اور ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر
استاد المکرم	مول چند ایک ہندو استاد تھے۔ قرآن مجید اپنے والد محترم سے پڑھا

لباس وچال	چال آپ کی تیز تھی اور عموماً سادہ لباس پہنتے تھے اور زیادہ تر شیروانی زیب تن کرتے تھے ۔ کھانے میں عموماً پلاؤ اور فیرنی پسند کرتے تھے ۔ اوراوقات کوئی مقرر نہیں تھے ۔ مصروفیات کی بناء پر شام کو کھانا تناول فرماتے تھے ۔ صبح فجر سے پہلے جاگتے تھے ، بیت الذکر میں جاکر باجماعت نماز پڑھنے جاتے وقت اہل خانہ کو جگا کر جاتے تھے ۔ ایک لمبا عرصہ ریڈ کراس سوسائٹی کے انچارج بھی رہے ۔ آپ حقوق العباد میں یکتا مقام رکھتے تھے جس کا اعتراف غیر از جماعت لوگوں کو بھی کرنا پڑتا تھا ۔
نمازِ جنازہ	مربی سلسلہ حیدر آباد محترم تبسم صاحب نے پڑھائی اور بعد دعا جنازہ ربوہ لے جایا گیا ۔
تدفین	ربوہ کے خاص قبرستان شہداء میں ہوئی جبکہ لحد میں جناب عبد الباسط صاحب صدیقی ، جناب الطاف احمد مرزا صاحب اور ظہور الحسن صاحب نے اتارا ۔
موصی	موصی اور تمام چندہ جات میں حصہ لینے والے تھے ۔
آلہ قتل	چاقو یعنی چھری تھا ۔

محترم جناب نصیر احمد علوی
سنہ ۱۹۴۸ء سے لیکر سنہ ۱۹۹۰ء تک

زخموں کو سجا لینا ہی زینت ہے ہماری
یہ رسم وضع داری ہے، دستورِ وفا ہے

تقسیم ہند سے پہلے ہی محترم محمد عبد اللہ علوی صاحب اپنے مختصر خاندان کے ساتھ چک نمبر ۳۰/۱۱ تحصیل چیچہ وطنی ضلع ساہیوال میں رہائش پذیر تھے کہ خدا تعالیٰ نے سنہ ۱۹۴۸ء میں انہیں دوسرا بیٹا عطا فرمایا جس کا نام انہوں نے نصیر احمد تجویز کیا۔ نصیر احمد ابھی دو سال کا ہی تھا کہ اس خاندان کو بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر اپنا آبائی گاؤں چھوڑنا پڑا۔ اور سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ آکر سرزمین سندھ میں آباد ہو گئے۔ یہاں شاہ گوٹھ چوہدری امام بخش میں انہوں نے اپنے بیٹوں کو ابتدائی تعلیم دلوائی اور بعد میں نصیر احمد کو گوٹھ سے ۴ میل دور دریا خان مری میں حصول تعلیم کے لئے داخل کر دیا جہاں انہوں نے مڈل پاس کیا۔ اور پھر مزید تعلیم کے لئے اپنے گھر سے سینکڑوں میل دور اپنے مرکز ربوہ میں بھیج دیا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بیشک محمد عبد اللہ علوی صاحب علم و عرفان کے متلاشی و خواہش مند ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں زندگی و تندرستی عطا کرے وہ تادم تحریر سلامت ہیں (ماشاء اللہ) اس لئے انہوں نے اپنے جذبہ شوق کو زندہ رکھا اور قربانی کر کے اپنے بیچے کو گھر

سے دُور سنورنے کے لئے بھیج دینے میں تامل نہیں کیا۔

اور دوسری طرف یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ربوہ کی تربیت و ماحول دینی و دنیوی لحاظ سے باقی شہروں کی نسبت بدرجہا بہتر ہے۔ اور اگر مٹی مندار ہو اور بیج ستھرا ڈالا جائے تو زراع کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ وقتی طور پر اگر کہیں با امرِ مجبوری بعض لوگ حالات سے مغلوب ہو کر تعلیم کو ادھورا بھی چھوڑ جاتے ہیں تو بھی اُن کے اندر معلومات دینی + اخلاقی + معاشرتی کا ایک سمندر موجزن رہتا ہے۔ جو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اُمڈ آتا ہے۔ اور ہزار بند باندھنے کے باوجود وہ کہیں رکتا نہیں ہے۔ یہی حال محمد عبد اللہ علوی صاحب کے بیٹے نصیر احمد علوی کا تھا کہ جب وہ حسبِ توفیق ربوہ سے تعلیم حاصل کر کے واپس سندھ آگئے تو ان کا معمول زندگی صرف اور صرف تبلیغ تھا۔ وہ جس کسی سے ملتے دعوت الی اللہ پیش کر دیتے تھے۔ بلا امتیاز رنگ و نسل لوگوں سے ملتے اور اپنا کمایا ہوا دین لوگوں کی جھولیوں میں ڈالتے رہتے۔ وہ دیئے سے دیا جلانے کے عادی تھے۔ اور ان کی یہ خدمت ایک مثالی اور غیر فانی خدمت تھی۔ جو انہیں زندہ کر گئی ہے۔

جیسا کہ عبد الحمید طاہر صاحب مربی سلسلہ دوڑ تحریر کرتے ہیں کہ :

"نصیر احمد صاحب نے دعوت الی اللہ کی طرف بہت توجہ دی۔ روزانہ کچھ نہ کچھ وقت ضرور دعوتِ الی اللہ کے لئے نکالتے۔ خاکسار کی پہلی تقرری دوڑ میں ہوئی تو نصیر احمد علوی ہر روز دوستوں سے رابطہ کے لئے وقت نکال کر آتے اور خاکسار کا ساتھ دیتے۔ بعض اوقات رات ۱۲ بجے تک خدمتِ دین میں مشغول رہتے۔"

(الفضل ۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۱ء)

بی۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ واپس اپنے آبائی پیشہ

زمینداری کے لئے گاؤں کی طرف لوٹ آئے اور اپنے خاندان مشتمل بشیراحمد، ظہیراحمد علوی، امنہ بی بی، خدیجہ بی بی۔ بشیراں بی بی۔ منظورہ بی بی اور نصیرہ بی بی آباد ہے اور ۱۹۷۳ء میں ۲۹ر مارچ کو فہمیدہ بیگم صاحبہ دختر ریاض حسین صاحب سے شادی کر لی اور ۱۹۷۹ء میں بمعہ خاندان دوڑ نواب شاہ میں منتقل ہو گئے اور مستقل رہائش یہیں اختیار کر لی۔ کچھ بکریاں اور بھینس گائے بھی پال رکھی تھیں اور تھوڑی بہت تجارت بھی کر لیتے تھے۔ مگر بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے برابر جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا ہی شوق تھا کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ اس لئے ڈبل محنت کر کے خرچ پورا کرتے تھے۔"

قرآن و حدیث

خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے نصیر احمد صاحب قرآن مجید کے معانی پر مکمل توجہ دیتے تھے۔ انہیں باریک سے باریک مطالعہ قرآن کا شغف رہتا تھا۔ تفسیر صغیر ان کے لئے ایک تحفہ تھا۔ جو وہ ہر وقت اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ اُن کی بیگم فہمیدہ صاحبہ تحریر فرماتی ہیں کہ :

"قرآن کے مطالعہ میں آپ کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ ہر مسئلہ زبانی بتا دیتے تھے۔ حوالہ بھی دیتے تھے۔ صبح کو نماز کے بعد ضرور تلاوت کرتے تھے۔ میں نے اکثر رات کو بھی تلاوت کرتے دیکھا ہے۔ میں اکثر کہتی تھی کہ آپ تو مربی اور مبلغ لگتے ہیں۔ رمضان اور محرم کے مہینے میں نوافل اور قرآنِ کریم کثرت سے پڑھتے تھے۔ اذان بہت پیاری دیتے تھے۔ نظمیں بھی بہت پیاری آواز میں پڑھتے اور بچوں کو اُٹھتے بیٹھتے سناتے تھے۔ بچوں کو کہتے کہ تم سوال کرو میں تمہیں جواب دوں گا۔ احادیث کے علم میں بھی وہ بہت مثالی انسان تھے۔ ہر بات کا جواب احادیث کی رو سے دیتے تھے۔"

علم کا شوق

نصیر احمد علوی صاحب اپنے والدِ محترم کی طرح حصولِ علم کے دیوانے تھے۔ اپنے علم کو فروغ دینے کے لئے وہ صبح و شام مطالعہ کرتے تھے اور مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ تقریباً حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کی کتب دوبار پڑھ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے رات نیند نہیں آتی جب تک کہ میں مطالعہ نہ کرلوں۔ اور ہمیشہ مذہبی کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔ جس رات وہ شہید ہوئے اس رات بھی حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتاب پڑھتے پڑھتے سوئے تھے۔ ویسے ہی کتاب میز کے اوپر پڑی تھی۔ حضرت مسیح موعود کی کتابوں کے تو شیدائی تھے۔ گرمیوں کی دوپہر کو اگر سونے کے لئے جاتے تو کتاب کوئی نہ کوئی ضرور پڑھتے تھے۔ اگر صبح ناشتہ میں دیر ہو جاتی تو فوراً کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے اور ساتھ ساتھ بچوں کو بھی بتاتے تھے اور مجھے بھی سناتے تھے۔ اور یہی ان کا روز کا معمول تھا تعلیم کا اس حد تک شوق تھا کہ زیادہ تر حصہ کمائی کا تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا بیٹا پشاور کالج میں گھر سے دور اس لئے بھیج دیا کہ مناسب ماحول میں مناسب تعلیم حاصل کر سکے۔ اور بیٹی کو بھی علم کی شمع سے منور کرانے کیلئے میٹرک کے بعد کالج میں بھیج دیا۔ یہ روشن خیال خاندان علم کے ہر میدان میں اپنی اپنی جگہ کوشاں ہے۔ بڑی بیٹی فرحت، بیٹا احسان الحق، رفیقہ علوی، انعام الحق اور انوار الحق اپنے شہید ابو جان کی خواہش کے مطابق اپنے غریبانہ وسائل کے ساتھ علم کے جو ہر اپنی جھولی میں بھر رہے ہیں۔ یہ ننھی ننھی جانیں اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنی زندگی مکمل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے علم کا نور ہی ان کے گھر کو منور کرے گا۔ انشاء اللہ

اندازِ محبت

اولاد سے محبت کے بھی عجیب عجیب انداز ہوتے ہیں۔

اگر ایک باپ بچوں کی نفسیات کا پورا مطالعہ کرے تو وہ ان کی تربیت میں کماحقہٗ ماں کا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔ عموماً باپ تمام اخراجات کرتے ہیں مگر اولاد کو وقت کم دیتے ہیں۔ ماں اپنی طاقت و سوچ کے مطابق تربیت کرتی رہتی ہے۔ بیٹیوں پر تو وہ اپنی تربیت کا پورا رنگ چڑھا دیتی ہے مگر لڑکے عموماً صحیح ڈگر پر نہیں چلتے اور ماں سے وہ تربیت نہیں حاصل کر پاتے جو ایک احمدی نونہال کی نشانی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ باپ نے بیٹوں کو وقت کم دیا۔ اور وہ ماحول کے ہاتھوں گرفتار ہو کر زمانہ کے ساتھ چل نکلتے ہیں۔ کچھ صحیح منزل پر پہنچ جاتے ہیں اور کچھ راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ اور کچھ بے راہرو ہو کر ناہمواریٔ زمانہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مگر

ایک معلم قسم کا باپ ہمیشہ یہ دھیان رکھتا ہے کہ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا بچے کے سامنے نمونہ ہے۔ اس لئے وہ کسی وقت بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا کہ مبادا بچہ غلط روش اختیار کرے۔ بلکہ ہر لمحہ اولاد کو کسی نہ کسی ترکیب و ترغیب سے اپنے قریب تر کرتا جاتا ہے۔ مثلاً یہاں نصیر احمد صاحب کا یہ انداز کتنا پیارا ہے کہ اپنے بچوں کو عید کے دن عیدی دیتے ہوئے بھی ایک سبق دے رہے ہیں کہ جو بچہ رمضان کے مہینہ میں قرآن و نوافل زیادہ پڑھے گا وہ زیادہ عیدی کا حق دار ہو گا۔ اور اُسے عید کے روز سب سے زیادہ عیدی دی جاتی تھی۔ اور بے شک یہ ایک شفیق استاد کا قدم ہے جو وہ بطرز نصیحت اٹھاتا ہے۔ اور اس طرح بچے کے دل و دماغ پر نقوش ثبت کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی راہیں ترقی کی طرف گامزن ہوتی ہیں۔ ترقی خواہ دین کی ہو یا دنیا کی نیت پر تمام دارومدار ہے چونکہ علوی صاحب کی نیت نیک تھی اس

لئے انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو دین کی راہ میں وقف کر دیا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ
اس کا بھی ان کو اجرِ عظیم اور بیٹے کو دین کی خدمت کی توفیق عطا کرے۔ انشاءاللہ
ان کی اولاد ضائع نہیں جائے گی۔ بچے اپنے والدِ محترم کے نقش پر چل کر قرآن مجید
کی رفعتوں اور رحمتوں سے بہرہ ور ہوں گے۔ انشاءاللہ

فضلِ الٰہی

خدمتِ دین کو اک فضلِ الٰہی جانو
اس کے بدلے میں کبھی طالبِ انعام نہ ہو

(مصلح موعود)

محترم نصیر احمد علوی وہ شخص تھا جو تھکتا نہیں تھا۔ دین کا کام تو اس کی جان
تھا۔ ہر عہدہ دار سے بڑھ کر کام کرنا اپنا نصب العین خیال کرتے تھے۔ انصاراللہ
کے زعیم کی حیثیت سے جب کام سنبھالا تو کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ جو کسی کمزوری
یا کوتاہی کی نظر ہو جائے۔ بلکہ جماعت احمدیہ دوڑ کا ہر کام خود کرتے حتیٰ کہ جلسے اجلاس
کا انتظام بھی خود کرتے اور اطلاعات بھی لوگوں کے گھروں میں جا کر خود بہم پہنچاتے
تھے۔ ایک لمبا عرصہ سیکرٹری مال کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ محترم عبدالحمید
طاہر صاحب لکھتے ہیں کہ نصیر احمد علوی صاحب نے سیکرٹری مال کے عہدہ کا پورا
حق ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت احمدیہ دوڑ آج تک تمام چندہ جات وقت سے
پہلے ادا کر دیتی ہے۔ تمام جماعتی میٹنگز میں باقاعدگی کے ساتھ جاتے اور وہاں
سے ملنے والی تمام ہدایات جماعت میں آ کر بتاتے اور ان پر عمل بھی کرواتے پنجوقتہ
نمازوں میں اپنے ساتھ اپنے بچوں کو بھی لے کر جاتے اور ان کی تربیت کا خاص

خیال رکھتے تھے۔"   (مربی سلسلہ دوڑ)

اور

وہ لوگ جو خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا ہماری نسلوں کو روحانیت سے مالامال کرنا۔ روپے پیسے سے غنی ہوتے ہیں اور وہ اپنا مال و متاع اولاد کی بہتری میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ نہ صرف اولاد کی بہتری بلکہ تمام جماعت کی بہتری ان کا نصب العین تھا جیسے کہ جماعت کی ایک نمایاں خدمت تعمیر دارالذکر ہے۔

دارالذکر دوڑ کی جماعت کے لئے ازحد ضروری تھا۔ اور یہ چیز شہید نصیر احمد علوی کیلئے ازحد فکر کا موجب ہوا کرتی تھی۔" یہاں جماعت دوڑ کے پاس کوئی خاص ایسی جگہ نہیں تھی کہ جس کو بیت الذکر کا درجہ دیا جاتا۔ نصیر احمد نے رات دن کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک جگہ خریدی جس کو بیت الذکر کا نام دیا۔ جس دن یہ جگہ لی تھی بہت زیادہ خوش تھے۔ کہتے تھے کہ آج ہم بھی بیت الذکر والے بن گئے ہیں۔ یہ بھی خیال کرتے تھے کہ بڑی سی جگہ لے کر چار دیواری کروالیں۔ پھر ہماری عورتیں، بچیاں اکٹھی ہو کر ورزش اور کھیلیں کیا کریں تاکہ صحت و سلامتی کی راہ ہموار ہو۔"

عقیدت و محبت

حضرت اقدس بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ سے عقیدت و محبت کا جائزہ اگر لیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ شخص جو کسی سے محبتِ حقیقی کرتا ہے تو اس کی سچی اتباع بھی کرتا ہے۔ نہ صرف خود پیروی کرتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کی ہر بات کو اتنی اہمیت دوں کہ گھر گھر گلی گلی اور کوچے کوچے عام کر دوں اس لئے وہ بے چین رہتا ہے کہ یہ پیغام جو میرے پیارے نے دیا ہے بے مقصد نہ جائے اس لئے وہ اُسے

اپنے پرائے ہر شخص تک پہنچا دیتا ہے۔ اور یہی سچے پیار کی علامت ہے کہ محبوب کے اقوالِ زرّیں کو روشن کر کے پھیلا دیا جائے۔ یہ پھیلانے کا عمل عقیدت کی سچی نشانی ہے۔ چنانچہ نصیر احمد علوی صاحب اپنے اس جذبہ عشق و عقیدت میں اتنے پکے تھے کہ کہا کرتے تھے کہ "جو رات قبر میں آنی ہے وہ باہر نہیں آسکتی۔ وہ تو آکر ہی رہتی ہے اس لئے خوف کس چیز کا ؟ بیشک !

" آپ خدا کے سامنے جب روزِ محشر جائیں گے
آپ کے ایمان کی گواہی دیں گے خود سرکار بھی

(فرحت)

اسی طرح ۱۹۷۴ء کے آرڈیننس کی وجہ سے بہت رنجیدہ اور فکرمند تھے مگر کہتے تھے کہ جتنی مشکلیں انسان پر آتی ہیں اس کا ایمان تازہ کرتی ہیں۔ شادی کے بعد کچھ سسرال کے حالات پریشان کُن ہو گئے تو کمزور لوگوں نے عافیت اسی میں خیال کی کہ جماعت سے علیحدہ ہو جائیں اور بدنصیبی یہ تھی کہ علوی صاحب کے سسرال کا گھرانہ بھی جماعت چھوڑ گیا۔ محترمہ فہمیدہ صاحبہ بہت دکھی تھیں تو علوی صاحب نے چند جملوں میں ان کی ڈھارس بندھوا دی اور کہا کہ فہمیدہ سوکھے پتّے جھڑ گئے ہیں یہ تو حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی پیشگوئی پوری ہوئی اگر ایسا نہ ہوتا تو پیشگوئی کیسے پوری ہوتی جو ہر صورت میں مقدر تھی۔ ہاں تمہارے

والدین کی صورت حال پر تشویش ہے۔ دعائیں جاری رکھو۔

حُسنِ خلق اخلاق کی خوبصورتی بھی ایک انعام ہے جو خدا تعالیٰ اپنے بندے کو عطا کرتا ہے۔ خدا کے فضل سے علوی صاحب اس انعام سے بھی وافر حصّہ رکھتے تھے۔ مثلاً مہمان نوازی۔ خدمتِ خلق

غربا پروری اور توکل وغیرہ وغیرہ ۔

" توکل کا یہ عالم تھا کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہوتے بلکہ ہمیشہ کہتے کہ ہر کام خدا کا نام لے کر کرو ۔ نتیجہ خدا پر چھوڑ دو ۔ اگر ہمارا کوئی جانور، بکری یا بھینس مر جائے تو مجھے دُکھ ہوتا تو کہتے خدا کی یہی مرضی تھی ۔ خدا کو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہوتی ۔ خدا تعالیٰ وہی کرتا ہے جو انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے ۔ یہ تو ہماری ناشکری ہے کہ ہم آہ و بکا شروع کر دیتے ہیں ۔"

مہمان نواز

آپ مہمان نواز بھی بہت تھے ۔ وہی کرتے تھے جو خدا اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہو ۔ اکثر کہتے تھے کہ رسولِ خدا کا فرمان ہے کہ غریب مہمان کی خدمت ادھار لے کر بھی کر دو ۔ اسی طرح ہر مہمان کی خدمت بہت لگن سے کرتے اور ہمیں بھی بہت تاکید کرتے اپنی

خدمت والدین

والدہ محترمہ کی خدمت میں وہ ایسے منہمک ہوتے کہ انہیں رات کا احساس بھی نہ ہوتا ۔ ان کی ٹانگیں خود دباتے ۔ ان کی دلجوئی کرتے اور اگر بیمار ہو جاتی تھیں تو فوراً ڈاکٹر کو لے آتے تھے ۔ مکمل علاج معالجہ میں لگے رہتے اور اپنے ہاتھ سے دوائی وغیرہ دیتے تھے بہنوں اور اُنکے بچوں سے بھی بہت پیار تھا ۔ ان کی بڑی بہن ۱۸ سال سے بیوہ ہو گئی تھی اُس کو اور اس کے بچوں کو اپنے پاس لے آتے تھے ۔ ان کو پڑھایا اور بڑی بیٹی کی شادی بھی خود اپنے ہاتھوں سے کی اور انہیں مناسب تدابیر کر کے گھر میں آباد کیا ۔"

غربا پروری

غربا کا تو خاص طور پر خیال رکھنا اپنا فرض خیال کرتے تھے ۔ غریبوں کے دکھ و تکلیف کو دیکھ کر فوراً ان کی مدد کیا کرتے تاکہ اُن کی تکلیف دُور کر سکیں ۔ حتیٰ کہ بعض اوقات نیا سوئیٹر اور کپڑے بھی اتار کر دے آتے تھے ۔ غریب اگر کبھی قرضہ لینے آتا تو بلا دریغ قرضہ دے دیا کرتے

تھے۔ پانچ سو تک قرضہ دینے کی مجھے اجازت تھی اور اس سے اوپر قرضہ دینے کے لئے ہدایت کرتے تھے کہ مجھ سے پوچھ کر دے دیا کرو۔ ضرورت مند کی ضرورت کو روکنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ مجھ سے مشورہ کر کے قرضہ دے دیا کرو۔"

امن وسلامتی کا گھرانہ

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نصیر احمد علوی صاحب کے گھریلو اخلاق کیسے تھے؟ یہ گھرانہ خَیرُکُم خَیرُکُم لِاَھلِہٖ کے مطابق بہت خوشگوار زندگی گزارنے والا تھا۔ خدا کے فضل سے دونوں میاں بیوی اپنی اپنی جگہ خوش اور پُرامن زندگی گزار رہے تھے۔ محبت کے تمام دریچے جو کوئی نیک شوہر بیوی کی زندگی کو پُرامن بنانے کے لئے کھول سکتا ہے وہ تمام ترعلوی صاحب نے اپنی اہلی زندگی میں کھول رکھے تھے۔

فہمیدہ صاحبہ خود اپنی زندگی کے متعلق گواہی دیتی ہیں کہتی ہیں کہ" ہماری اہلی زندگی بھی خدا کے فضل سے بہت اچھی تھی لوگ فخر سے ہم کو دیکھتے تھے۔ بچوں کے ساتھ پیار محبت بہت زیادہ تھا۔ باہر سے گھر آتے تو سب بچوں کو گلے لگاتے تھے۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ بھی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ میرے ساتھ ہاتھ ملاتے تھے۔ میں خود کئی دفعہ حیران ہوتی کہ اتنی زیادہ محبت کیوں؟ میرے ساتھ خاص توجہ اور محبت کا سلوک مجھے حیران کر دیتا تھا اور مجھے بھی اُن کے ساتھ عشق کی حد تک محبت تھی اور ہے میں انہیں کبھی بھی ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولی۔ کیونکہ وہ بھولنے والی ہستی نہیں تھے۔ وہ سراپا محبت و شفقت تھے۔

آپ وفا کی انتہاء آپ عشق کا معیار بھی
کاروانِ شوق آپ کارواں سالار بھی

(فرحت نصیر احمد)

اگر وہ رات کبھی دیر سے آتے تو مجھے چین نہیں آتا تھا۔ اگر میں بیمار ہو جاتی تو وہ بیمار ہو جاتے اور اگر ان کو کوئی تکلیف ہوتی تو یقین کریں کہ میں اور میرے بچے سخت بے چین و پریشان ہو جاتے تھے۔ میں تو ہر وقت روتی رہتی ہوں کہ میں تو ان کی ذراسی تکلیف سے بے چین ہو جاتی تھی اُس رات کیوں مجھے نیند آ گئی اب ساری عمر روتی رہوں گی اُس وقت کی نیند کو کہ اگر میں پہلے جاگ اُٹھتی تو خدا کی قسم میں خود مر جاتی ان کو کبھی کچھ ہونے نہ دیتی۔ وہ میری زندگی کا بدترین لمحہ تھا۔ جس وقت وہ ظالم میرے گھر آ کر یہ کام کر گیا۔ اب پتہ نہیں کب یہ وقت آئے گا کہ میں اُن سے جا ملوں؟ اُن کے ساتھ گزارہ ہوا وقت بہت اچھا اور مسرتوں سے بھرپور تھا۔ وہ بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر طرح پیارا انسان تھا پیارا شوہر، پیارا بیٹا اور پیارا باپ کہ اپنے بہن بھائیوں سے اتنا پیارا سلوک کرنے والا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اکثر کہتے تھے کہ میں تمہارے جیسی بیوی خدا سے مانگتا تھا۔ شکر ہے ویسی ہی مل گئی۔ خدا کا خاص فضل ہے کہ اُس نے مجھے نوازتے ہوئے میری دعا سن لی اور تمہارے جیسی طبیعت و عادات والی بیوی مجھے عطا کر دی۔ شکر الحمدللہ۔"

میں بھی ہمیشہ ان کی اطاعت کرتی اور ہر بات میں کہنا مانتی تھی مثلاً اکثر مجھے تاکید کرتے کہ غریب رشتہ داروں اور ہاریوں کا خیال ہر بات پر مقدم رکھو تو میں بہت توجہ دیتی تھی۔ ہمارے ہاری بہت غریب تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے کہتے کہ بچوں کے پرانے کپڑے سنبھال کر رکھا کرو غریب ہاریوں کو دے دیں گے۔ لہٰذا بازار سے جرسیاں اور سویٹر خرید کر غریبوں کو سردیوں میں دیتے تھے۔ خود بہت قناعت پسند تھے۔ میانہ روی سے خرچ کرتے تھے۔ مگر ہمارے رشتہ دار ہاری یا ہمسائے اگر دُکھ میں ہوتے تو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے خود ان کی مدد

کرتے اور ہم سے کرنے کی تاکید کرتے تھے۔

درود شریف درود شریف کا ورد ایک ایسا معجزاتی ذکر ہے کہ تمام شہدا کی زندگی میں یہ عمل زیادہ تر مشترک نظر آتا ہے۔ جب میں نے غور کیا کہ آخر کون سا عمل ہے جو ہر شہید نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اطاعتِ امام کے بعد اہمیت و استقامت سے کرتا ہے۔ کہ اُسے خدا تعالیٰ نواز کر شہادت کا انعام عطا کر دیتا ہے؟ تو میری سوچ کے مطابق یہی عمل واحد و مشترک نظر آیا جو بہت زیادہ التزام کے ساتھ وہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اگر طوالت گراں نہ ہو تو اس جگہ ایک حدیث درج کرتی ہوں تاکہ قارئین کے لئے دلچسپی و تقلید کا موقع بن جائے۔ جامع ترمذی کی حدیث کے مطابق میری سوچ کا جواب بھی میسر آ جائے گا اور ثابت بھی ہو جائے گا۔ انشاءاللہ

حضرت اُبی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ" میں نے ایک رات عرض کی کہ یارسولؐ اللہ کہ میں اپنی دُعا کا ایک بہت بڑا حصہ حضورؐ کے لئے مخصوص کر دیا کرتا ہوں بسو بہتر ہے کہ حضور خود ارشاد فرمائیں کہ میں اپنی دُعا کا کتنا حصہ حضور کے لئے مخصوص کر دوں۔ فرمایا جتنا چاہو۔ میں نے عرض کیا ایک چوتھائی۔ فرمایا جتنا چاہو اور اگر اس سے زیادہ کر دو تو بہتر ہو گا میں نے عرض کیا نصف حصہ۔ فرمایا جتنا چاہو۔ اور اگر اس سے زیادہ کر دو تو بہتر ہو گا۔ عرض کیا کہ دو تہائی کر دوں۔ حضورؐ نے نے فرمایا جتنا چاہو اور اگر اس سے زیادہ پڑھ لیا کرو تو بہتر ہو گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں آئندہ اپنی دعا کا تمام حصہ حضورؐ کے لئے مخصوص کرونگا۔ فرمایا" اس میں تمہاری تمام ضرورتیں اور حاجتیں آ جائیں گی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام کام سنوار دے گا۔ اور تمہاری ساری مرادیں پوری کرے گا۔"

یاد رہے کہ تمام دعاؤں کی بجائے درود شریف ہی پڑھتے رہنا قبولیت دعا کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ (حضرت مفتی محمد صادق صاحب)

چنانچہ نصیر احمد کی زندگی میں بھی یہ اہم ترین عمل بہت پابندی سے داخل تھا۔" وہ تقریباً رات کو عشاء کی نماز کے بعد سینکڑوں بار درود شریف باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔" وہ ہر کام درود شریف کی برکت سے شروع کرتے تھے اور آخر تک درود شریف پڑھتے رہتے تھے اور اس پر تا حیات مداومت بھی کرتے رہے۔

قبولیتِ دُعا

جناب نصیر احمد صاحب اپنی زندگی میں بہت زیادہ دعوتِ الی اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ اور ایسا شخص جو نمونہ بن کر سامنے آئے۔ اس کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ جو کہے وہ کر کے دکھلائے اور جو کر رہا ہو وہی کہے تو قابلِ قبول ہوتا ہے۔ وہ عملی زندگی میں بہت نیک اور با اخلاص جماعت کے عہدہ دار کی حیثیت رکھتے تھے اور ایک تڑپ تھی کہ میری جماعت کے پاس بیت الذکر نہیں ہے اس لئے وہ بیت الذکر کے لئے بہت دعا کرتے تھے۔ وہ دُعا خدا نے ایسی پوری کی کہ ساتھ والے ہمسائے گھر بیچ کر پنجاب جانا چاہتے تھے۔ فوری انہوں نے خرید کر لیا اور میں خود حیران تھی کہ کوئی مکان قریب دیتا ہی نہیں تھا اچانک ہماری ہی گلی میں ہمارے گھر کے بالکل قریب خدا نے خود سامان کر دیا اور جگہ مل گئی۔ اسی طرح داخلہ پشاور میں بڑے بیٹے احسان الحق کو خدا نے دے دیا۔ الحمدللہ۔ اور اسی طرح ایک میری بہن بے اولاد تھی بہت دعائیں کیں اور خدا تعالیٰ نے علوی صاحب کی دُعا سے بیٹا عطا کیا جواب ۱۲ سال کا ہے۔ پھر زندگی میں ایک معجزہ نما دعا میں نے علوی صاحب سے یہ بھی دیکھی کہ ہمارا ایک ہاری ہمیں بہت تنگ کرتا تھا اور طبیعت کا بہت کمینہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ

چلا جائے ۔لیکن وہ جاتا ہی نہیں تھا۔ ایک دن زمین سے آئے تو بہت پریشان تھے۔ پھر عصر کی نماز پڑھ کر خوب دُعا کی کہ اے اللہ اس سے پیچھا چھوڑا دے۔ دوسرے تیسرے دن وہ ہاری کہنے لگا کہ چوہدری میں تو جا رہا ہوں۔ سنبھال اپنی زمین لوگوں نے خاص طور پر نصیر احمد صاحب کو مبارک باد دی۔ کہ اتنا کینہ آدمی خود زمین چھوڑ کر چلا جائے۔ یہ دعاؤں کی قبولیت کا اثر تھا۔ الحمدللہ

پیغام زندگی

۱۶ر نومبر ۱۹۹۰ء بروز جمعہ بوقت رات کسی ناعاقبت اندیش نے ان کو ابدی زندگی کا پیغام دے دیا اور اس طرح وہ ایک رات آخری ذکر درود شریف ۲۰۰۰ بار پڑھ کر وہ بچوں سے رخصت ہوئے جمعہ کا دن تھا۔ لجنہ کا اجلاس نماز کے بعد ہوا کرتا تھا۔ بڑی بیٹی وہیں اجلاس پر رہیں اور خود بچوں کو واپس لیکر گھر آ گئے۔ خوش بخوش دن گزرا۔ رات اپنے بیٹے کے ساتھ سو گئے۔

محترمہ فہمیدہ علوی صاحبہ اپنی داستانِ غم یوں بیان کرتی ہیں ہ

نماز جنازہ ددڑ جہاں ہم رہتے ہیں مربی کرامت اللہ صاحب جو کہ نوابشاہ سے آئے تھے انہوں نے پڑھائی اور ربوہ میں مولانا سلطان محمود انور صاحب ناظر اصلاح وارشاد نے جنازہ کیا تھا۔ سپرد لحد میں بشیر احمد، ظہیر احمد، عبدالحمید طاہر مربی سلسلہ، داؤد احمد اور احسان الحق (بیٹے) نے اتارا۔

رات ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔ نماز کے بعد حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی کتاب "روحانی خزائن" جلد سوم دیر تک پڑھتے رہے میں بستر پر لیٹ گئی تھی تو وہ ابھی پڑھ رہے تھے۔ میں سو گئی پھر چارپائی ہلنے کی آواز آئی تو میں نے دیکھا نصیر احمد صاحب چارپائی پر لیٹ رہے تھے۔ ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا ضد کرکے اس رات اپنے پاپا کے ساتھ سویا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ لیٹ رہے ہیں تو میں

نے کہا کہ انوارالحق (چھوٹے بیٹے کا نام ہے) کو میرے ساتھ لٹا دیں کہنے لگے کوئی بات نہیں سویا رہنے دو پھر ہم سب سو گئے۔ رات کے ۲ بجے دشمن نے حملہ کیا تو دھماکے کی آواز میرے کان میں پڑی تو میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بھاگ کر نصیر احمد صاحب کی چارپائی کے پاس گئی تو ایک آدمی ان کے اُوپر جھکا ہوا تھا اُس نے تکیہ نصیر احمد صاحب کے منہ کے اوپر رکھ کر دبایا ہوا تھا میں بھاگ کر گئی تو وہ چھوڑ کر بھاگ کر دیوار کود گیا۔ دوسرا آدمی سیڑھیوں کی طرف بھاگ گیا۔ ایک باہر گلی میں تھا یہ خوفناک منظر دیکھ کر میری اتنی زور سے چیخیں نکلیں کہ سارا محلہ اُٹھ گیا میں نے جلدی سے دیکھا تو گولی ان کے دل پر لگی تھی اور تھوڑا تھوڑا ہل رہے تھے بس ایک منٹ تک ہلنے کے بعد . . . . . میں سمجھی تھی کہ بے ہوش ہو گئے میرے شور کرنے پر ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے اس نے کہا کہ ختم ہو گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون یہ لکھنے میں تو آپ کو شاید سمجھ نہ آئے یہ واقعہ ہم سے کوئی آکر زبانی سُنے اس وقت رات کے ٹھیک ۲ بجے تھے اس واقعہ کے بعد نہ میرا دل یہاں رہنے کے لئے تیار ہے اور نہ بچے یہاں رہتے ہیں۔ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں ہر وقت اس گھر سے ڈر لگتا ہے شام کے وقت بچے اور میں سہم کر ایک جگہ کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں اور جب تک دن نہیں چڑھتا باہر نہیں نکلتے

سلیقہ نہیں تجھ کو رونے کا ورنہ
بڑے کام کا ہے یہ آنکھوں کا پانی

کاش آپ آئیں

کاش آپ آئیں اور آ کے دیکھیں
میری تمنا میری اُمیدیں
تڑپ رہی ہیں سسک رہی ہیں
میرے دل کی یہ دھڑکنیں بھی
آپ کی خاطر دھڑک رہی ہیں
کاش آپ آئیں اور آ کے دیکھیں
جو آپ کے دم سے مہک رہا تھا
وہ باغِ الفت اُجڑ چکا ہے
کہ میری روشن حیات کا اب
نظام سارا بگڑ چکا ہے
کاش آپ آئیں اور آ کے دیکھیں

(اپنے پیارے پپا جانی کی یاد میں)

فرحت نصیر علوی بنت نصیر احمد علوی (شہید)

ایک نظر میں

نام	نصیر احمد علوی ولد محمد عبداللہ علوی
پیشہ	تجارت
تعلیم	انٹر
عمر	۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۰ء تک
جائے پیدائش	چک نمبر ۳۰/۱۱ ضلع ساہی وال
جائے شہادت	نواب شاہ
آلہ شہادت	گولی
لواحقین	۳ بیٹے، ۲ بیٹیاں، بیوہ
نمازِ جنازہ	مربی کرامت اللہ صاحب نواب شاہ ربوہ میں سلطان محمود انور صاحب
سپردِ لحد	بشیر احمد، ظہیر، عبدالحمید طاہر اور داؤد احمد، احسان الحق
عہدہ بروقت شہادت	جنرل سیکرٹری + سیکرٹری مال
آخری آرام گاہ	قبرستان ربوہ۔

حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے ارشاد کی روشنی میں

ایک درخواست!!

"چاہیے کہ ایسے آدمی منتخب ہوں جو تلخ زندگی کو گوارہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور اُن کو باہر متفرق جگہوں پر بھیجا جاوے۔ بشرطیکہ ان کی اخلاقی حالت اچھی ہو۔ اور تقویٰ اور طہارت میں نمونہ بننے کے لائق ہو۔ مستقل، راست قدم اور بردبار ہوں اور ساتھ ہی قانع بھی ہوں اور ہماری باتوں کو فصاحت سے بیان کر سکتے ہوں۔ مسائل سے واقف اور متقی ہوں۔ کیونکہ متقی میں ایک قوت جذب ہوتی ہے۔ وہ آپ جاذب ہوتا ہے۔ وہ اکیلا رہتا ہی نہیں .... اور جو اس راہ میں مرجائیں گے وہ شہادت کا درجہ پائیں گے۔"

(ملفوظات جلد نمبر ۹ صفحہ ۴۱۵، ۴۱۶)

شہدائے کرام کے ورثاء اور عزیز رشتہ داروں کے لئے الٰہی وعدہ اور خوشخبری

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

(آیات کریمہ نمبر ۱۵۶، ۱۵۷ البقرہ)

ترجمہ: اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی (کے ذریعہ) ضرور آزمائیں گے اور (اے رسولؐ!) تو (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سُنا دے جن پر جب (بھی) کوئی مصیبت آئے (گھبراتے نہیں بلکہ یہ) کہتے ہیں کہ ہم (تو) اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں (نازل ہوتی) ہیں اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے بندوں شہدائے کرام

کا تذکرہ محبت بھرے الفاظ میں فرمایا تھا کہ ....

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کے متعلق (یہ) مت کہو کہ وہ مردہ ہیں (وہ مُردہ) نہیں بلکہ زندہ ہیں مگر تم نہیں سمجھتے۔"

(ترجمہ آیت کریمہ نمبر ۱۵۵/ البقرہ)

اب اُن ابتلاؤں کا ذکر فرماتا ہے جو خُدائے قدوس کے قُرب کے حصول کے لئے اُن شُہدائے کرام پر وارد ہوئے اور انہوں نے صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ کی محبّت کا رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ کا عارفانہ نعرہ لگاتے ہوئے رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ کے حضور جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔

اِن آیاتِ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مُصلح موعود (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) تحریر فرماتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قسم کے ابتلاؤں کا ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ان ابتلاؤں میں سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل نہیں کر سکتے .... یہاں حضور نے ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر اور اعلیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلا آتے ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں ۔۔

"ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلا آتے ہیں وہ تو اس لئے آتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی ایمانی حالت کیسی ہے؟ اور جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں پر آتے ہیں وہ اس لئے آتے ہیں کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی کیا حالت ہے؟ عام طور پر لوگ اپنے متعلق خیال کرتے ہیں کہ انہیں ایمان میں ثباتِ قدم حاصل ہے مگر موقعہ آنے پر ان سے کمزوری آجاتی ہے۔ اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر یہ کمزوری ہے۔ اور وہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر ابتلاء اس لئے لائے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو معلوم ہو جائے

کہ یہ کیسے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کرتی۔ غرض بتایا کہ ہم تمہارے اندرونہ کو ظاہر کرنے کے لئے پانچ قسم کے ابتلاء تم پر وارد کریں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(آیت ۱۵۶ سورۃ البقرہ صہ ۲۹۴ تفسیر کبیر)

اس آیت کریمہ کے بارہ میں حضرت مسیح موعود (اللہ تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) فرماتے ہیں :۔

"یعنی اے مومنوں ہم تمہیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہوگی اور کبھی فقر و فاقہ تمہارے شاملِ حال ہوگا اور کبھی تمہارا مالی نقصان ہوگا اور کبھی جانوں پر آفت آئے گی اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہو گے اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلیں گے اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مرے گی پس ان لوگوں کو خوشخبری ہو کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اُس کی طرف رجوع کرے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے"۔

(تفسیر سورۃ البقرہ از حضرت مسیح موعود صہ ۲۱۹)

اسی طرح حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں :۔

"۔ ۔ ۔ ۔ جیسے شہداء کو دیکھو کہ جنگ کے بیچ میں لڑتے لڑتے مارے جاتے ہیں تو خدا کے نزدیک کس قدر اجر کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ درجات قرب بھی اُن کو قضاء و قدر سے ہی ملتے ہیں۔ دگرنہ اگر تنہائی میں اُن کو اپنی گردنیں کاٹنی پڑیں تو شاید بہت تھوڑے ایسے نکلیں جو شہید ہوں۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ غربا کو بشارت دیتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الآیۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا یہی مطلب

ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے اُن کو ہر ایک قسم کے نقصان پہنچتے ہیں اور پھر وہ جو صبر کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی عنایتیں اور رحمتیں اُن کے شامل حال ہوتی ہیں۔ کیونکہ تلخ زندگی کا حصہ اُن کو بہت ملتا ہے لیکن اُمراء کو یہ کہاں نصیب۔

(تفسیر سورۃ البقرہ صفحہ نمبر ۲۲۲، ۲۲۳ از حضرت مسیح موعود)

نیز حضور فرماتے ہیں :۔

"جب میں آپ کی ان تکلیفوں کو دیکھتا ہوں اور دُوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ان کریمانہ قدرتوں کو جن کو میں نے بذاتِ خود آزمایا ہے اور جو میرے پر وارد ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خداوند کریم قادر مُطلق ہے اور بڑے بڑے مصائب شدائد سے مخلصی بخشتا ہے اور جس کی معرفت زیادہ کرنا چاہتا ہے ضرور اُس پر مصائب نازل کرتا ہے تا اُسے معلوم ہو جائے کیونکہ وہ نومیدی سے امید پیدا کر سکتا ہے غرض فی الحقیقت وہ نہایت ہی قادر و کریم و رحیم ہے۔

(از مکتوبات جلد پنجم بنام حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل بحوالہ صفحہ ۲۲۸ تفسیر سورۃ البقرہ از حضرت مسیح موعود)

معزز قارئین کرام حضرت مسیح موعود (اللہ تعالیٰ کی آپ پر سلامتی ہو) کی آیاتِ کریمہ نمبر ۱۵۶/۱۵۷ کی رُوح پر ور تشریحات اور تفسیر سورۃ البقرہ اور حضرت مُصلح موعود (اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو) کی تفسیر اور تشریح سُورۃ البقرہ جلد دوم میں ملاحظہ کریں تو یہ ایمان افروز تفسیریں یقیناً آپ کو رُوحانیت اور معرفت الٰہی کے بلند مقام پر پہنچانے کا موجب ہوں گی۔ اِس ضمن میں ہم اپنے پیارے شہید بزرگوں کے تمام اعزہ و اقربا کو نہایت ادب سے خدائی بشارات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ہمارے جن بزرگوں کے پیارے بیٹے شہید ہوئے۔ ہماری جن بزرگ ماؤں کے بیٹے شہید ہوئے

ہماری جن پیاری بہنوں کے خاوند شہید ہوئے۔ ہمارے جن معزز بہن بھائیوں کے بھائی شہید ہوئے۔ ہمارے جن پیارے بچوں کے والد شہید ہوئے اور سب سے بڑھ کر پیار کرنے والے امام جماعت احمدیہ کی جماعت کے معزز افراد شہید ہوئے۔ (کیونکہ ہمارے پیارے خدائے رحیم و کریم کے مقرّب بندے جو اُس کی راہ میں شہید کئے گئے وہ ہم سب کے ہی پیارے ہیں)

اُن سب کو

الٰہی بشارت ہے أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ○ (۱۵۸/ البقرہ)

یہ خدائی وعدہ ہے اور خدائی بشارت ہے کہ جو لوگ اپنے پیاروں کی جدائی پر صبر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں ہوں گی۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر جو حضرت مُصلح موعود نے فرمائی اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ارضی اور سماوی آفات پر سچے دل سے إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہتے ہیں اللہ تعالےٰ انہیں اپنی مغفرت سے حصّہ دیتا ہے۔ یعنی وہ ان کے نقصانات کا ازالہ کرتا اور اُن کی ناکامی کو کامیابی میں اور تکلیف کو راحت میں بدل دیتا ہے اسی طرح اُن پر اللہ تعالےٰ کا فضل حُسنِ ثناء کی صورت میں نازل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اُن کی نیک شہرت دُنیا میں قائم کر دیتا ہے۔ اور لوگوں کی زبانوں پر اُن کا ذکرِ خیر جاری ہو جاتا ہے چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں اور اولادوں کو بے دریغ قربان کر دیا اور کسی بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دشمنانِ اسلام تک بھی ان کی تعریف کئے

بغیر نہیں رہ سکتے . . . . .

(تفسیر کبیر جلد اوّل جز دوم صد ۳۰۳)

قرآن حکیم میں ربُّ العزت نے واضح ارشاد فرمایا ہے ۔

. . . . كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ

(آیت کریمہ نمبر ۳۲/ المائدہ ۵)

ترجمہ :۔ " . . . . ہم نے بنی اسرائیل پر فرض کر دیا تھا کہ (وہ خیال رکھیں کہ) جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے قتل کیا ہو یا مُلک میں فساد پھیلایا ہو، قتل کرڈے تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا . . . . "

اور

چودھویں صدی کے عُلماء . . . . فتوے جاری کرتے ہیں کہ جو شخص کسی قادیانی/مرزائی کو قتل کرے تو سیدھا بہشت بریں میں جائے گا۔

جبکہ

ہادیٔ برحق حضرت محمّد مصطفٰے احمد مجتبٰے خاتم النبیین (فداہ ابی وامّی) صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ میں مسلمانوں کو اپنے عظیم خطاب میں جس پر تاقیامت عمل کرنا ہم پر فرض ہے ارشاد فرمایا :۔

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسُول کریم صلی صلی علیہ وسلّم حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدان میں تشریف لائے اور آپؐ نے ایک تقریر کی جس میں فرمایا۔ اے دوستو

سن لو! تمہاری ایک دُوسرے کی جانیں۔ تمہارے ایک دُوسرے کے اموال۔ تمہاری ایک دُوسرے کی عزّتیں خدا تعالےٰ نے تم پر حرام کر دی ہیں اور تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں کہ تم اپنے کسی بھائی کی جان کو تکلیف دو یا اُس کے مال پر حملہ کرو یا اس کی عزّت پر حملہ کرو جس طرح حج کا دن اللہ تعالےٰ نے عزّت والا بنایا ہے ویسے ہی ادنیٰ سے ادنیٰ مُسلمان کے خون اُس کے مال اور اُس کی عزّت کی توقیر اُس نے تم پر واجب کی ہے اور جس طرح ذوالحجہ کو عزّت حاصل ہے اُسی طرح خدا تعالیٰ نے ادنیٰ سے ادنیٰ مُسلمان کے خون۔ اُس کے مال اور اس کی عزّت کو مقام بخشا ہے اور جو عزّت خدُا تعالیٰ نے مکّہ مکرمہ کو دی ہے۔ وہی عزت اُس نے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے خون مال اور عزّت کو دی ہے۔

پس اے ورثاء شہداء کرام آپ کے لئے خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ان بزرگوں کی قربانی کے نتیجہ میں آپ کے دروازہ پر آئیں گی اور اللہ تعالیٰ کا فضل حسن ثنا کی صورت میں آپ کو دنیا میں نیک شہرت عطا کرے گا۔ انشاء اللہ

خوں شہیدانِ اُمّت کا اے کم نظر
رائیگاں کب گیا ہے کہ اب جائے گا

ہر شہادت تیرے دیکھتے دیکھتے
پھُول پھَل لائے گی پھُول پھَل جائے گی

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

(آیت کریمہ نمبر ۱۶۶/ البقرہ)

معراجِ محبّت

عموماً انسان محبّت سے ہی اسیر ہوتا ہے۔ محبت خواہ منفی ہو یا مثبت اسیری ہی صرف اس کا معراج ہے۔ محبت مال سے بھی ہو سکتی ہے۔ محبّت اولاد سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی مرد و عورت سے بھی ہو سکتی ہے اور علم و ہُنر سے بھی عین ممکن ہے، مگر وہ محبّت جو مولیٰ کریم خداوندِ عالم، خالقِ کُل سے ہوگی اس کا تو مقام ہی زالا ہے اور ایسی زالی محبّت کرنے والا بھی خوش بخت اور قابلِ رشک ہے اور مثالی طور پر خوش نصیب ہے کہ وہ اپنے پیارے خالق کی محبّت میں اسیر ہو گیا۔

ہاں تو

جب محبّت نے اپنے بازو پھیلا کر اس کو جکڑا تو وہ تلملایا ہرگز نہیں اور پریشان نہیں ہوا بلکہ اس محبّت یکتا میں وہ سمٹ گیا اور اس کی اسیری کا جوا اپنی گردن میں ڈال کر تفخر سے زندگی بسر کرنے لگا۔ کیونکہ زندہ رہنا اس کا متمع حیات نہیں تھا۔ وہ تو اپنے مولیٰ کے لئے پیدا ہوا تھا اور مولیٰ کے لئے ہی زندہ ہے اور مولیٰ کے لئے مر جائے گا۔ وہ محبّت الٰہی کا جنون لئے ہوئے اپنوں میں سے نکل کر بیگانوں میں جا پہنچا اور اب اُس کے لئے باہر رہنا یا اندر رہنا ایک ہی بات ہے

کیونکہ آج اس کی اسیری الہٰی محبت کی ہے کسی احاطہ یا زنجیر کی نہیں ہے کیونکہ آج اسیر راہِ مولیٰ تمام محبّت و عشق کے راستے طے کر کے منزل پر جا پہنچا ہے اور خدا تعالیٰ

اس کا محبوب ہے اور محبوب کے لئے تو دُنیا میں سُنتے ہیں کہ کسی نے دُودھ کی نہر بھی کھودی تھی اور کسی نے اپنے جسم کے گوشت سے کباب بھی پکائے تھے۔ حالانکہ یہ تو مجازی عشق تھا مگر یہاں تو حقیقی عشق ہے۔ اس میں کیا نہیں ہو سکتا؟ سب ممکن اور سب درست ہے نا؟ اور یہی وجہ ہے آج ہم ایسے اسیروں سے ملنے کی خواہش لے کر نکلے ہیں جو ہمارے ایمان کو مضبوط اور تازہ کرتے ہیں ایک مثالی مقام رکھتے ہیں تو آیئے۔

میں ہوں پابند سلاسل تو کوئی بات نہیں

اہلِ زنداں کو یونہی جذبِ دروں ملتا ہے

محمد الیاس منیر

(اسیرِ راہِ مولیٰ)

آپ نے دیکھا ہوگا جب کبھی کہیں بھی قوم کے ہیرے لوگوں کا ذکر ہو رہا ہو تو عموماً تراشیدہ ہیروں کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ تراشنے کا عمل خصوصاً گھروں سے بلکہ ماں کی گود سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ماں اگر اپنے بچے کو ہر پہلو سے نکھارتی ہے تراشتی ہے۔ سنوارتی ہے تو وہ بچہ بڑا ہو کر قوم کا ایک چنیدہ شخص بن جاتا ہے۔ جو قوم کی پیشانی کو مزیّن کرتا ہے اس کے ہر رُوپ کو اجاگر کرکے دُنیا کے سامنے موثر کر دیتا ہے۔ قوم کی صفات اور خوبیاں جو اُس کے وجود سے نمایاں ہوتی ہیں وہ روزِ روشن کی طرح لوگوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ سنگِ میل بن جاتا ہے اور اس کی روشنی پر شاہراہیں ہموار ہوتی ہیں، منزلیں متعین ہوتی ہیں۔ اور نسلیں آگے بڑھتی ہیں . . . . .

اپنی ناچیز سوچ میں یہ حقیقتیں سمیٹے میں حدیقۃ المبشرین کی جانب مڑ گئی ۱۴؍۱۶ کے ایک کمرے میں کچھ کتابیں، فائلز اور سامان سلیقے سے رکھنے والے شخص کو دیکھ کر مجھے چنداں حیرت نہ ہوئی بلکہ میرے اندازے یقین میں بدل گئے۔ کہ بیشک یہ ایک محترم شخصیت جناب محمد اسماعیل منیر حدیقۃ المبشرین کی تربیت کا حاصل ہی اور کچھ اسی قسم کا شخص تھا جو ایک فرض شناس، خوش اسلوب اور اطاعت میں مثالی انسان

کے زیرِ سایہ پروان چڑھا ہو۔ میں نے باپ میں بیٹے کا عکس دیکھ کر جو بھی رائے قائم کی تھی وہ آپ کے سامنے حروف کی شکل میں آج لے آئی ہوں آئیے محمد الیاس منیر صاحب سے ملتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مولیٰ کا ایک دیوانہ کس طرح رات اور دن اسیری میں بسر کرتا ہے۔ کتنا رضائے الٰہی پہ راضی ہے؟ کتنا صابر و شاکر ہے؟ اور کتنا سخت جان ہے؟

آج تا وقتِ تحریر ساہیوال کی بیرکس میں جس جوان سال امیر کو ملنے کے لئے ہم آگے بڑھ رہے ہیں وہ محترم اسماعیل منیرؔ کے بڑے بیٹے ہیں۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ اسماعیل صاحب خود اپنے بیٹے کو صاحب لکھتے ہیں۔

آپ سری لنکا کے شہر کولمبو میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ کے والد محترم واقفِ زندگی تھے اور اسی وقف کے سلسلے میں وہ اپنے شہر ربوہ سے ہزاروں میل دُور سمندر پار حقِ تبلیغ ادا کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے کہ خدا تعالیٰ نے اس خاندان کو ایک ننھے بیٹے الیاس منیر سے نواز لیا۔ الحمدللہ۔

جب وہ طفل تھے تو سیکرٹری اطفال الاحمدیہ بنے اور جب حلقہ کے زعیم کے فرائض ان کے سپرد کئے گئے تو انہوں نے نہایت محنت و لگن سے سر انجام دیئے چھوٹے سے اس خاندان کا ہر بچہ اپنی اپنی جگہ اطاعت و فرمانبرداری، محنت و لگن اور دینداری کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ ناصرہ پروین صاحبہ، محمد داؤد منیر صاحب اور ڈاکٹر محمد اویس منیرؔ کے ساتھ کھیلنے کُودنے والا یہ بھائی بھی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ ربوہ کی گلیوں میں یعنی مرکز علم و ہنر میں پڑھے اور جوان ہوئے اور آپ کی والدہ محترمہ مبارکہ نسرین صاحبہ نے سچی لگن اور حقیقی محنت سے بچے کی دیکھ بھال میں اپنے شب و روز بسر کئے۔ تعلیم الاسلام اسکول ربوہ سے فارغ ہو کر الیاس منیر صاحب شاہد کی کلاسز کے لئے جامعہ احمدیہ ربوہ میں داخل ہوئے اور مربیانہ زندگی کا آغاز کیا

کہتے ہیں

کہ جب کوئی خدا تعالیٰ کے دروازہ پر دستک دیتا ہے تو واپس بے نیل و مرام شاذ ہی لوٹایا جاتا ہے مگر خدا کو خدا سے مانگتا ہے تو کبھی نا امید واپس لوٹایا نہیں جاتا یعنی کوئی اور دعا خدا تعالیٰ ملنے یا نہ ماننے اپنی محبت و عشق کی دعا ضرور قبول فرمالیتا ہے۔ سو الیاس منیرؔ صاحب بھی جب درِ مولیٰ پر اپنی سچی محبت پیش کرنے گئے تو اپنی زندگی ہی پیش کر دی اور اس طرح بحیثیت واقف زندگی مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے اپنے پیار کا ثبوت دیا۔ اب خدا کی شان ہے وہ بے نیاز ہے ۔ چاہے تو ساری زندگی اپنی اسیری میں قبول کرے اور چاہے تو اپنے محبوب آقا کی چاہتوں کا مرکز بنا دے۔ اُس کی دین ہے جسے چاہے نواز دے ۔

اُن کی چاہت میرا مدعا بن گیا
میرا پیار ان کی خاطر دُعا بن گیا
بخدا اُن کا ساتھی خُدا بن گیا
وہ بنائے گئے آسماں کے لئے

اب جن کا امام اور مظہر قدرتِ ثانیہ ہی گواہی دے کہ وہ خدا کے ساتھی بن گئے ہیں ان کے لئے میں کیا لکھوں ؟ خیر جب وہ ۲۴، ۲۵ سال کی عمر میں داخل ہوئے تو محترمہ طاہرہ پروین صاحبہ بنت محمد شفیق صاحب کو اپنی ہم رکاب منتخب کیا۔ اور اس طرح یہ ازدواجی زندگی میں داخل ہو گئے اور دونوں نے نہایت عمدگی اور دعاؤں کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کی۔ گھریلو سکینت سے مالا مال محمد الیاس منیرؔ صاحب سلسلے کے کاموں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اور وہ دارالذکر ساہیوال میں مقیم تھے کہ

ایک دن

(نوٹ) طرزِ تحریر کا تقاضہ یہی ہے کہ جیل میں سلاخوں کے پیچھے جس شخص سے ملنے جا رہے ہیں اُس کے متعلق یہ تو جان لیں کہ وہ بیرکس میں کیوں ہیں؟ اور کس لئے گئے ہیں؟ اور کس طرح گئے ہیں؟

پولیس کی حراست

۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کی ایک صبح کا ذکر محمد الیاس صاحب کچھ اس طرح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"۲۵ر اکتوبر رات میں مطالعہ کُتب حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کر کے سویا اور صبح ۴ بجے کے بعد اٹھا اور وضو کر کے نفل پڑھنے لگا۔ قریباً پونے پانچ بجے فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میں نفل ختم کر کے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ اور بیگم کو کہا کہ طارق مجھے دے دو اور خود نماز پڑھ لو چنانچہ طارق کو میں نے اپنے ساتھ لٹا لیا اور بیگم وُضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ میں نیم نیند کی حالت میں تھا۔ اور بیگم سلام پھیرنے والی تھی کہ یک لخت دھماکہ کی آواز آئی ......

میں نے کہا بیت الذکر پر حملہ ہُوا اور ساتھ ہی جوتی پہن کر دروازوں کو اندھا دھند کھولتا ہوا مسجد کے صحن میں پہنچا۔ جہاں رانا صاحب بندوق لئے بڑے جلال سے للکار رہے تھے۔ کون ہو تم کلمہ مٹانے والے۔ کہاں ہو تم کلمہ مٹانے والے وغیرہ وغیرہ۔ دو دھماکوں کی آواز مجھے اپنے گھر کے اندر ہی آئی اور تیسرے فائر کا مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ وہ کب ہوا۔ بہر حال میں باہر آیا تو خدام رانا صاحب کے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ اور رانا صاحب للکارتے ہوئے بیت الذکر کے ہال میں داخل ہوئے اس کے ساتھ ہی چند "مجاہدین" جو وُضو والی جگہ میں چھپے ہوئے تھے نکل کر بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ اُن کے پیچھے خدام بھی باہر نکلے اور

میں نے بھی انہیں مشن چوک کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اور ہوٹلوں کے قریب پہنچ کر وہ پہلے ہی سے اسٹارٹ رکشوں میں غائب ہو گئے۔ پھر جو اپنے سامنے دیکھا تو دروازے کے بالکل سامنے، سڑک کے عین کنارہ پر ایک "مجاہد" کراہ رہا تھا۔ دروازہ کے اُوپر دیکھا تو کلمہ مٹا ہوا تھا۔ وہاں صرف تین خدام رہ گئے۔ انہیں میں نے امیر صاحب کے گھر فوری بھیجا تاکہ اطلاع دیں بذریعہ فون۔ اور عزیزم عبدالقدیر کو حسین بخش کالونی بھجوا دیا۔ میں اکیلا وہاں رہ گیا۔ رانا صاحب اپنے مکان میں چلے گئے۔ میں نے بیت الذکر کا دروازہ اندر سے بند کیا اور بیگم کو جا کر واقعہ بتایا۔ اور انہیں فوراً پروفیسر طفیل صاحب کے گھر بھجوا دیا اور خود اس کی طرف سے بے فکر ہو کر مسجد کے صحن میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھٹکا اور پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ملک منصور صاحب نماز کے لئے آئے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا اور انہیں واپس بھجوا دیا کہ قریب کے گھروں میں جا کر اطلاع دیں۔ اس دوران میری عجیب کیفیت تھی میں بیت الذکر کے صحن میں دعائیں کرتے ٹہلنے لگا ......

اس وقت میں نے اھدنا الصراط المستقیم کی دعا بڑی کثرت سے کی۔

پولیس کو واقعہ کی اطلاع دے دی گئی۔ اس کے بعد ایس۔ایچ او نے مجھ سے تفصیلات پوچھیں تو میں نے کہا کہ میں تو واقعہ کے وقت موجود نہ تھا۔ اتنے میں عزیزم حاذق وہاں آ گئے۔ ایس۔ایچ۔ او نے انہیں اس انداز میں پوچھا کہ رات ڈیوٹی پر کون کون تھا۔ ڈیوٹی پر موجود خدام کے نام لکھ کر ابتدائی رپورٹ ایس۔ایچ۔ او نے مہمان خانہ کے دروازہ میں کھڑے ہو کر ڈی۔ایس پی کی موجودگی میں لکھی .... انہوں نے کہا کہ جو جوان ڈیوٹی پر تھے ان کی گواہیاں لینے کی ضرورت ہے۔ ایس۔ایچ۔او صاحب آ گئے اور انہوں نے عبدالقدیر اور عزیزم نثار احمد کو ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن جب جانے لگے تو دروازہ کے قریب نہ معلوم کیا بات

ہوئی کہ انہوں نے حاذق رفیق صاحب اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا میں نے امیر صاحب سے اجازت لی۔ آپ نے فرمایا جاؤ جاؤ۔ وہاں لطف الرحمٰن صاحب بھی تھے۔ انہوں نے کہا تھوڑی دیر کی بات ہے جائیں ابھی آپ آجائیں گے۔ چنانچہ میں باہر آکر سرخ رنگ کی ڈاٹسن میں بیٹھ گیا۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہی ہماری گرفتاری ہے۔

جذبہ قربانی

بیشک قربانی کے جذبے سے ہی راستے وضع کئے جاتے ہیں۔ اور محمد الیاس منیر جذبوں کے اس سمندر کی اتھاہ گہرائی میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء سے اترے ہوئے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ سلاخوں کے پیچھے و سال کا لمبا عرصہ ان اسیروں کو کتنا طویل معلوم ہوتا ہوگا۔ ہر رات شب ہجر ہوگی اور ہر صبح یوم عاشور ہوگا۔

ڈائری باقاعدگی سے لکھنے والے محمد الیاس جیل میں بھی ڈائری لکھتے ہیں۔ تلوار اگرچہ ہر وقت ان کے سر پر لٹکتی ہے۔ کس گھڑی کیا فیصلہ ہو؟ اور کون سی ساعت کیا پیغام لائے۔ قطع نظر اس کے ہر روز صبح ہوتے ہی سورج وہی اداسی لے آدھمکتا ہے اور جب سورج جاتا ہے تو وہی پیغام چھوڑ جاتا ہے

۲۱ اپریل ۱۹۸۷ء کا سورج کیسے نکلا . . . . وہ لکھتے ہیں کہ:

"ابھی اندھیرا کافی تھا کہ میں نماز سے فارغ ہو چکا تھا اور گنتی کھل گئی۔ باہر چلا گیا۔ پھر واپس آکر وضو کیا اور تلاوتِ قرآن مجید کی۔ آج رانا صاحب کی ٹہلائی دوسری تھی۔ اور اس میں کافی دیر لگتی تھی۔ اس لئے میں نے مشفقی سے کہا کہ ذرا دیر سے چائے بنانا اور خود سو گیا۔ جب اٹھا تو پہلی ٹہلائی ختم ہو رہی تھی۔ اور چائے بھی قریباً تیار تھی۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ناشتہ کر کے فارغ ہو گیا۔"

ایک رات ۲۲ اپریل ۱۹۸۷ء

جب سورج پہاڑیوں کے پیچھے اتر گیا تو میں نے ایک تفصیلی نظارہ دیکھا

ایک لمبا سا کمرہ ہے ۔ اور اس میں تھوڑے فاصلے پر جالی دار کھڑکیاں ہیں بظاہر تو ایسا ہے جیسا کوئی لنگر ہو یا ٹکٹ گھر، مگر اس وقت ماحول ہائی کورٹ کا ہے میں اس کے اندر کچھ کر رہا ہوں ۔ ایک صاحب کچھ کاغذات اتھل پتھل کر رہے ہیں. میرا ذہن انہی کی طرف ہے کہ وہ جج ہیں اور ہماری اپیل کا فیصلہ کر رہے ہیں ۔ میرا ذہن انہی کی طرف ہے کہ وہ جج ہیں اور ہماری اپیل کا فیصلہ کر رہے ہیں ۔ چند لمحوں بعد فیصلہ ہوتا ہے ۔ وہ چھوٹے قد کے ہلکے پھلکے جسم کے مالک جج ہائی کورٹ ہماری اپیل کو خارج کر دیتے ہیں پھر کورٹ برخواست ہو جاتی ہے ۔ باقی لوگ تو باہر ہوتے ہیں ۔ مجھے اُن کا پتہ نہیں کہاں چلے جاتے ہیں ۔ تاہم میں وہاں سے ربوہ میں بکڈپو کے سامنے، انصار اللہ کے دفاتر کی طرف جانے والے راستے پر جا رہا ہوں ۔ مغرب کے بعد کا اندھیرا ہوتا ہے ۔ میرے ساتھ وہی جج صاحب جا رہے ہوتے ہیں ۔ مجھے اپنے قریب پا کر پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو ۔ میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ وہی جس کی ابھی آپ نے اپیل خارج کی ہے ۔ اس پر وہ اچھا کہہ کر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں ۔ اور میں اپنا سلسلہ گفتگو ۔ میں انہیں اپنے کیس کے موٹے موٹے حالات بتاتا ہوں ۔ ضروری دلائل ان کے سامنے رکھتا ہوں اور وہ حیرانی کے ساتھ سنتے چلے جاتے ہیں اتنے میں ہم انصار اللہ کے دفاتر میں پہنچ جاتے ہیں ۔ میں ان کا میلان دیکھ کر آخری فقرہ بڑے زور سے چست کرتا ہوں کہ آپ کیا لکھتے ہیں ۔ اس ہمارے کیس کو تو گورنر نے ۴۰ ، ۲ کا کیس قرار دیا اور وہ بھی صرف ایک کے خلاف ۔ اس پر وہ جج صاحب کہتے ہیں کہ یار کسی طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کیس دوبارہ لگ جائے ساتھ ہی اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ نہ ہو کہ دوبارہ لگنے کی صورت میں کسی اور کے پاس

چلا جائے۔ میں تو بڑی غلط فہمی میں رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ معین الفاظ یاد نہیں رہے۔ بہرحال وہ پوری طرح قائل ہو جاتے ہیں۔ اور مجھے اپیل خارج ہونے کی قطعاً فکر نہیں ہوتی۔

یہ صعوبتیں کیا کیا رنگ لاتی ہیں اور کس کس طرح متاثر کرتی ہیں۔ یہ صرف اور صرف جن پر گزرے وہی جان سکتے ہیں۔ ابتلا ہو یا عذاب چکی کے پاٹ ہیں۔ پسنے والا ہی اُس کی تکلیف کو سمجھ سکتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کا فضل جب شامل حال ہو اور صبر و استقامت کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت کی دُعائیں میسر ہوں تو طوفان بھی رُخ پھیر لیتے ہیں۔ اور آندھیاں بھی ٹھنڈی ہوائیں معلوم ہوتی ہیں۔

الٰہی محبت اور عشقِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم

عشق وہی سچّا ہوتا ہے جو سَر چڑھ کر بولتا ہے اور الیاس منیر صاحب کا عشق تو ایسا نظارہ پیش کرتا ہے کہ از خود بولتا ہے تو اس کا بیّن ثبوت تو جیل کی کوٹھڑی ہے جو پکار پکار کر کہتی ہے کہ اے عشق الٰہی والو اِدھر بھی ایک نظر! اسے بھی آزما کر دیکھ لو۔ یہ بھی ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ لٰہذا ہر اسیر راہِ مولیٰ کی محبت از خود روزِ روشن کی طرح ایک دلیل ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اور محبت و عشق کی یہ ۱۱۱۱۱۱ یعنی زنجیر جو خالقِ کل سے چل کر حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلام ابن غلام ابن غلام اور والدین و اساتذہ تک چلتی ہے ہمیشہ قائم و دائم رہی ہے۔ بلکہ راستے متعین کرتی چلی گئی ہے۔ اور اسی طرح خدا تعالےٰ اپنے پیاروں کے لئے کبھی کبھی دکھوں کی چادر کو لپیٹ کر رحمت میں بھی تبدیل کر دیا کرتا ہے۔ خوش کن لمحات بھی پیش آ جاتے ہیں۔ اور یہ بھی خدا تعالیٰ کی شان امتحان ہے کہ وہ اپنے بندوں کی طاقت صبر و استقامت کو آزماتا ہے

پرکھتا ہے تاکہ انعام کے لئے انہیں تیار کر دے۔ اور پرکھ کے زاویے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔

مثلاً ایسے

کہ ایک دن ۶ اپریل ۱۹۸۷ء کو محمد الیاس منیر کتنے خوش تھے کیونکہ آج انہیں پیارے امام نے کچھ تحائف سے نوازا تھا۔

آج کے واقعات کا ایک خاص واقعہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کا ارسال کردہ خوبصورت ٹافیوں کا خوبصورت اور شفقت بھرا تحفہ ہے۔ اس کے ساتھ شربت کی ایک بوتل بھی حضور کی محبتوں اور چاہتوں کا پیغام بن کر آئی۔ الحمد للہ فجزاھم اللہ جب حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے یہ الطافات اور عنایات دیکھتے ہیں اور پیارے آقا کے خطوط پڑھتے ہیں تو ایک طرف احساس ہوتا ہے کہ واقعی کوئی قربانی پیش کرتے ہیں اور حیرانگی کے ساتھ یہ سوالیہ کیفیت اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ ہم پہلے ہی بے تحاشا گناہگار۔ پرتقصیر اور پرغفلت بندے تھے۔ ایسے میں ہماری کیا حیثیت اور حقیقت!! پھر خیال آتا ہے کہ ایسے میں خدا کے خلیفہ کے یہ الفاظ آپ کے یہ تاثرات اور پیار بھرے جذبات ہم پہ دوہری تہری ذمہ داری عائد کر دیتے ہیں۔ ہم ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ذہنی پستی اور نفسانی زنجیروں اور گناہوں کے خول میں بالکل بے حس ہوتے ہیں۔ اس حال میں میرے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اے رب کریم تو ہمارا انجام بخیر کر دیجیو۔ ہم آخری لحہ تک ایمان کے مضبوط کڑے کو تھامے رکھیں۔ آمین

اصل میں یہ سارا کھیل جذبۂ قربانی کا ہوتا ہے۔ ورنہ دن کے ۲۴ گھنٹے گزارنے مشکل ترین عمل ہے۔ مگر یہاں اسیری میں سال کے ۳۶۵ دن ہی صبح و شام چکی کے سے عمل سے گزرتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ عمل، یہ انتظار، یہ

صعوبت اتنی جان لیوا ہے کہ کوئی بیل سے پوچھے۔ مگر کنویں یا کولہو پر چلنے والے بیل کی آنکھیں تو بند کر دی جاتی ہیں کہ وہ یکسانیت سے اکتا نہ جائے اور اندھیروں میں ہی چلتا رہے۔ حالانکہ وہ کولہو کا بیل ہوتا ہے

مگر

یہاں برعکس میں ایک ہی طرح کا PROCESS چلتا رہتا ہے۔ مثلاً صبح سویرے اُٹھ کر نماز فجر ادا کی اور دن کو بھرپور انداز میں گزارنے کا عزم لے کر میز کرسی پر آبیٹھا۔ تلاوت قرآن کریم کی پھر سیر کی اور واپس آکر پھر کام شروع کر دیا۔ چنانچہ تلاوت قرآن کریم کا ریکارڈ سُنا۔ لکھائی پڑھائی کی۔ اتنے میں ناشتہ کا وقت ہوگیا۔ پھر نہا دھو کر چکی کی سیٹنگ کی اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ درمیان میں ملک صاحب بھی آگئے۔ ان کے ساتھ آدھ پون گھنٹے کی نشست ہوئی۔ ملاقات کا آج ناغہ ہوا۔ چنانچہ اس دوران مجھے سونے کا موقع مل گیا۔ ظہر کے بعد قرآن کریم پڑھا۔ آج میرے شاگردوں میں ایک کا اضافہ ہوگیا یعنی دو ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی صحیح راہنمائی کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

آج تاریخ احمدیت کا بھی مطالعہ کیا۔ تاہم کسی نہ کسی وجہ سے مطالعہ کے عین بیچ اس کا سلسلہ منقطع ہوجاتا رہا۔ میں تو پورے خلوص اور سنجیدگی سے وقت کو مصرف میں لانا چاہتا ہوں۔ مگر کسی کو سختی سے ردّ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ اخلاقی قدروں کے بھی خلاف ہے اور ویسے بھی جیل کا ماحول ہے! اچھا اللہ تعالیٰ میرے تھوڑے کام میں زیادہ برکت ڈال کر ساری کمی کو دور کردے۔ ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین۔

لیکن کبھی کبھی

ملاقات کی امید اور پھر ایسی ملاقات عید کا سا سماں ہی پیدا کر دیتی ہے کیسے ؟

ملاقات کی عید

میں نے مطالعہ کے ماحول سے باہر نکلتے ہوئے اُسے کہا کہ آج ملاقات آنی چاہیئے تھی۔ معلوم نہیں کیوں نہیں آئی۔ یہ بات یونہی کہہ دی۔ حالانکہ کوئی اطلاع وغیرہ نہ تھی۔ مگر صرف چھٹی حس میرے ذہن کے تاروں کو چھیڑے ہوئے تھی۔ اس پر وہ کہنے لگا، فکر نہ کر ملاقات آجائے گی۔ اتنے میں باہر کا دروازہ کھٹکا۔ فیض محمد نے پیچھے ہو کر اندر آنے والے ملاقاتیوں کو دیکھا تو مجھے کہنے لگا کہ تمہاری ملاقات بھی لگتی ہے۔ ذرا پردہ اٹھا کر دیکھو میں لیٹا ہوا تھا۔ اُٹھ کر جنگلے میں آیا اور پردہ ہٹا کر دیکھنے لگا۔ بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد گزرے جا رہے تھے۔ میں نے احتیاط کی۔ مگر اتنے میں سامنے طارق اور حمامہ نمودار ہوئے ان کے ساتھ باجی تھیں۔ اتنے میں میرا دروازہ کھول دیا گیا۔ پھر جو دیکھا تو امی جان بھی چلی آرہی تھیں۔ میں بے اختیار اُن سے ملا اور انہیں بٹھا کر جو دیکھا تو تینوں خالائیں بھی تھیں اور ان کے ساتھ ماموں عابد تھے۔ سب سے ملا اور اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات نے تو گویا میری عید کر دی تھی۔ سب سے ملا اور خوب ملا۔ سب بچے اپنی اپنی کلاسوں میں پاس ہو گئے تھے۔ الحمدللہ۔ امی جان کی صحت کافی حد تک پہلے کی نسبت بہتر محسوس ہوئی۔ الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ امی جان کو صحت و عافیت والی فعال عمرِ دراز عطا فرمائے اور ان کا پُر شفقت اور پُر محبت سایہ تادیر ہم سب پر سلامت رہے۔ آمین۔ ملاقات چلی گئی۔ خوشی بھی تھی اور تھوڑی سی دیر میں یہ سب فسانہ بن جانے والا واقعہ اداس بھی کر گیا۔ خیر اس کے بعد دوست احباب آتے گئے اور اس طرح کسی حد تک وقت کے گزرنے کا احساس نہ ہوا۔

دوپہر کو سونے کی کوشش کی مگر وقت گزر چکا تھا۔ پھر اُٹھ کر باہر آگیا اور دل نے کہا چلو ملک صاحب سے مل کر آؤ۔ چنانچہ اللہ نے سامان بھی کر دیا اور میں ملک صاحب کے پاس چلا گیا۔ وہاں گیا تو ملک صاحب اپنے سیل میں بیٹھے آنسوؤں سے دل بہلا رہے تھے۔ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئے اور رونے لگے۔ خیر ان سے تھوڑی دیر نشست ہوئی۔ پھر واپس آکر کھانا جو گھر سے آیا تھا گرم کیا اور رانا صاحب کو کھلایا۔ ہیڈ وارڈ کی دعوت کی۔ اور اپنے لئے اپنے سیل میں رکھوایا اور ساڑھے پانچ بجے گنتی لاک اپ ہوگئی۔ گویا ہم لاک اپ ہو گئے۔

مگر مجھے LOCKED کرنے والے کیا جانیں کہ میں یہاں بھی خدا تعالیٰ کی راہیں تلاش کرتا رہتا ہوں۔ میں ایک سالک ہوں اور تلاش معرفت میرا مدعا ہے۔ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی استقامت کے ساتھ میں کوُ بہ کوُ اُس کے فضلوں کو تلاش کرتا رہتا ہوں۔

اور پھر کبھی کبھی

ساڑھے تین بجے کا عمل تھا جب آنکھ کھلی۔ ذرا سستانے کو لیٹا۔ وتر پڑھنے کا بھی وقت بچا۔ فجر کے بعد تلاوتِ قرآنِ پاک کی۔ ناشتے کے بعد صبح ہی صبح تیار ہو کر کام کرنے بیٹھ گیا۔ اور پہلے "مرزا غلام احمد قادیانی" کا مطالعہ کیا۔ اور پھر تاریخ احمدیت جلد دوم ختم کی۔

تاریخ احمدیت کے یہ اوراق پڑھ کر بے پناہ لطف آیا۔ ایمان غیر معمولی طور پر تازہ ہوا۔ ربنا اللہ کہہ کر استقامت کا جذبہ موجزن ہوا۔ سیدنا حضرت مسیح موعود کی حیاتِ طیبہ کے ایسے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں کہ آپ کی صداقت پر واضح مہر ہیں۔ کہیں حضور پر گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے تو کہیں پتھروں کی۔ کہیں حضور کے توکل کے واقعات ہیں تو کہیں عظیم الشان صبر کے روح پرور نظارے

ایسے ایسے حالات آپ کی زندگی میں پیش آئے کہ عام آدمی کے ڈگمگا جانے کے کافی اور معقول سامان موجود تھے مگر آپ کمال ثباتِ قدم سے مردِ میدان ثابت ہوتے رہے۔ خاص طور پر پادری مارٹن کلارک کی طرف سے حضور پر دائر کردہ مقدمہ اقدام قتل کے واقعات ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں۔ مقدمہ کے حالات اور اس کا انداز اتنا خطرناک تھا کہ آج بھی اس کو پڑھتے ہوئے شدید خوف محسوس ہوا۔ حالانکہ میں خود اس سے کہیں بڑے مقدمے سے دوچار ہوں۔ اور ایسے میں ۳۰۷ تو معمولی کیس ہے۔ مگر اس وقت کے زمانے اور حالات اور سیدنا حضرت مسیح موعود (آپ پر سلامتی ہو) کی پاکیزہ شخصیت اور ہستی کے مقابلہ اس قدر بھیانک انداز میں کئے گئے۔ مقدمہ کی شروعات کپکپی طاری کر دیتی ہیں۔ مگر یہ اسی پاک ہستی کا جگرا تھا کہ سب کچھ نہ صرف پورے حوصلہ سے سُنا بلکہ پوری بشاشت سے پورے اعتماد سے اور کامل توکل کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ ہمارے لئے اپنی صداقت کے بے شمار نشانات تاریخ کے صفحات پر نقش کر گئے۔ اس واقعہ میں ہمارے لئے حوصلہ، ہمت، برداشت، کامل توکل، استقامت اور اپنے رب سے رضا کا عظیم درس ہے۔ یہ واقعہ بلاشبہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

یاد رہے کہ انہی مشعلوں سے تو ہم راستے منور کرتے ہیں اور انہی روشن نقوش پر چل پڑتے ہیں پھر ایک دن قربتِ خداوند عالم پر ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

تہجد کے وقت ہر روز جاگنے والا مجاہد پھر ایک دن میدانِ سلاسل میں بھی جا نکلا۔ جہاں اُن کا جہاد طویل تر ہوتا گیا۔ اور بالآخر خلیفہ وقت، بزرگانِ قوم۔ اور اپنے پرائے سب کی دعائیں سمیٹے ہوئے آزادی کا منتظر ہے۔ جبکہ طارق الیاس اور خالد الیاس صبح و شام اپنی امی طاہرہ پروین صاحبہ کی طرح ہر دستک پر چونک

جاتے ہیں۔ اور منتظر آنکھوں سے اپنے محبوب مجاہد کا انتظار کرتے ہیں۔

باقی

اسیرانِ راہِ مولیٰ کی کیا کیفیات ہوں گی۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ اب تو وقت ٹھہر کر باہر والوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر رہا ہے کیسے عمدہ احساسات کا اظہار چند جامع الفاظ میں مسندِ خلافت سے ان کے نام آیا ہے۔ فرماتے ہیں سے

ہیں کس کے بدن دیس میں پابندِ سلاسل
پردیس میں اک روح گرفتارِ بلا ہے
سینے سے لگا لینے کی حسرت نہیں مٹتی
پہلو میں بٹھانے کی تڑپ حد سے سوا ہے

حقیقت قبولیت دُعا

اگر دعا کی حقیقت کو مستند نمونے سے بیان کر دوں تو قارئین کے لئے آسانی ہوگی۔ کیونکہ کسی کی قبولیت یا پرکھ کو جاننے کے لئے اُس کی حقیقت وضاحت سے سامنے آ جائے تو چنداں آسانی ہوتی ہے۔

حقیقت دعا کے متعلق حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ بچہ کو جو مناسبت ماں سے ہے۔ اُس تعلق اور رشتہ کو انسان اپنے ذہن میں رکھے۔ بچہ دُعا کا نام نہیں جانتا لیکن اُس کی چیخیں دودھ کو کیونکر کھینچ کر لاتی ہیں۔ ہر ایک کو اس کا تجربہ ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ مائیں دودھ کو محسوس بھی نہیں کرتیں مگر بچے کی چلاہٹ ہے کہ دودھ کو کھینچ لاتی ہے تو کیا ہماری چیخیں جب اللہ تعالیٰ کے حضور ہوں گی تو وہ کچھ نہیں کھینچ کر لائیں گی؟ (ملفوظات جلد اوّل)

اسی طرح

حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل فرماتے ہیں کہ اب تمہارا کام یہ ہے کہ ہتھیار بند ہو جاؤ۔ کمریں کس لو اور مضبوط ہو جاؤ۔ وہ ہتھیار کیا ہیں؟ یہی کہ دعائیں کرو۔ استغفار لاحول، درود، اور الحمد شریف کا ورد کثرت سے کرو۔ ان ہتھیاروں کو اپنے قبضہ میں کر لو۔ اور کثرت سے ان کو استعمال کرو۔

(الحکم جلد ۱۲، جون ۱۹۰۸ء)

دُعا کی حقیقت کے متعلق قدرتِ ثانیہ کے مظہر ثانی بھی فرماتے ہیں کہ

میں نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دُعا کرنے سے پہلے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھیں پھر درود شریف پڑھیں .... پس دعائیں کرو کہ اللہ تعالیٰ کا جلال زیادہ سے زیادہ تمہارے دلوں پر نازل ہو۔ اس کی محبت زیادہ سے زیادہ قائم ہو۔ اس کا نور آگے سے بڑھ کر تم پر جلوہ فگن ہو۔ تمہارے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف نور ہی نور ہو۔ وہ نور تمہارے دلوں میں داخل ہو جائے اور تم نور بن جاؤ۔

(خطبہ عید الفطر الفضل ۵، فروری ۱۹۳۲ء)

پس حقیقت میں دُعا کی قبولیت کا یہی معراج ہے کہ دُعا مانگنے والا نور میں تبدیل ہو جائے۔ یہ ماں بہتر جانتی ہے کہ بچہ کے لئے کیا مفید ہے اور کب مفید ہے؟ ہمارا کام تو خدا تعالیٰ کی جناب میں جھکنا ہے۔ اور مانگنا ہے۔ وہ کیسے نوازتا ہے یہ ایک عارف ہی جان سکتا ہے۔

" درحقیقت عارف کی زندگی میں دُعا کے بغیر کوئی مزہ ہی نہیں۔ پس دعائیں کرو۔ اتنی دعائیں کرو کہ خدا کی رحمت کی چادر تمہیں لپیٹ لے۔ اور تم اُس کے نیتجہ میں غیر اللہ کے ہر وار سے محفوظ ہو جاؤ۔"

(خطبہ جمعہ الفضل ۲۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

پس اپنے پیارے امام کی صدا کو صدلئے عافیت مانتے ہوئے خود کو دعا کے ہتھیار سے لیس کرنے میں ہی عافیت جان کر اسیران راہ مولیٰ نے رحمت کی چادر لپیٹ لی اور ایک دن سزائے موت کا پروانہ سننے والے غیر اللہ کے ہر وار سے محفوظ ہو گئے۔ فَسْتَجِيْبُوْنِيْ کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہر میدان میں بڑھتے چلے گئے

اور

آخر ان کے لئے دُعا کے ابواب کُھل گئے۔ جس کی مثال اس وقت صرف محمد الیاس منیر کی زندگی سے ہی پیش کرتی ہوں۔ گو باقی اپنے اپنے وقت پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ خدا مجھے توفیق عطا کرے۔ آمین۔ سردست ایک صاحب ہی ملتے ہیں۔

اے تنگی زنداں کے ستائے ہوئے مہماں
وا چشم ہے۔ دل باز در سینہ کھلا ہے

دعائے امام | امید ہے کہ قارئین کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ محترم محمد اسماعیل منیر صاحب کے لئے حضور پُرنور خلیفۃ المسیح الرابع نے بڑے محبت بھرے الفاظ استعمال فرما کر ان کو ہمیشہ کے لئے زندہ نشان بنا دیا۔

آپ نے ماریشس میں خطبہ جمعہ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء میں نصیحت فرمائی کہ "قرآنی حکم کے مطابق ہمیشہ تم اس پر نگران رہو کہ تم آنے والے لوگوں کے لئے کیا نشان چھوڑ رہے ہو۔ اگر اچھے نشان چھوڑ و گے تو خدا سے اچھا اجر ملے گا اور اگر بُرے اثرات چھوڑو گے تو ان کے بارے میں بھی پوچھے گا۔"

اس ضمن میں حضور نے فرمایا کہ

یہاں مدبرین اور مفکرین سے ملاقات کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ سب سے اچھا تاثر اسمٰعیل منیر صاحب نے چھوڑا ہے۔ کوئی نہیں ملا جو ان کے وقت میں تھا اور اس نے محبت سے ان کا ذکر نہ کیا ہو۔ عیسائیوں اور ہندوؤں نے بھی ان کا ذکر کیا۔ سیاسی لیڈروں، عدلیہ کے ججوں نے بھی ذکر کیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر قسم کے ماحول میں کوشش کرتے رہے اور اچھے تاثرات چھوڑ گئے ہیں۔ اس لئے خصوصیت سے مولانا اسماعیل منیر صاحب کو دیگر مخلصین کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے۔ فرمایا ہمارے اسیرانِ راہ مولیٰ میں ان کا بیٹا بھی شامل ہے۔ الیاس منیر واقفِ زندگی ہے۔ بہت نیک صفات مخلص، وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا نوجوان ہے۔ ان میں اخلاص ایمان (اور استقامت) کی ایسی دلکشی پائی جاتی ہے کہ ان کے خطوط کو دیکھ کر انسان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر درود بھیجنے لگتا ہے کہ کس طرح ان کو زندہ ایمان بخش دیا ہے کہ جس کو موت کے خطرات کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ مزید چمکتا اور دمکتا نظر آتا ہے۔ ایسے اور بھی راہِ مولیٰ کے اسیر ہیں اس ذکر میں ان سب کا ذکر بھی شامل سمجھیں اور ان بزرگوں کے لئے دعائیں کرتے رہیں

اور جب ان بزرگوں کے لئے دعائیں کریں تو اِن کی اولادوں کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ فرمایا آپ میں سے بہت سے نوجوان ایسے ہیں کہ اللہ نے جو انہیں خوبیاں

عطا کی ہیں وہ انہیں احمدیت میں صرف نہیں کرے ہے مگر ان دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ ان خوبیوں کو اعمال میں ڈھال دے گا۔ پس سابق بزرگوں کے لئے دعا کریں اور اپنے لئے بھی دعا کریں کہ خدا وہ شعور بخشے جن کی شناخت کے بغیر بنی نوع انسان کی خدمت کا انسان اہل نہیں بن سکتا۔

آخر میں حضور نے فرمایا: میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ سب نے اس سفر کو کامیاب بنانے میں بڑے خلوص، محبت، محنت اور نیک نیتی کے ساتھ حصہ لیا۔ اس سلسلہ کو ہمیشہ جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔

پس ایسے عظیم المرتبت باپ کی گواہی بہت اعلیٰ معیار ہے کہ وہ اپنے بیٹے محمد الیاس منیر کے لئے کیا تاثر دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

کہ

اگر اطاعت کو مدّنظر رکھ لوں تو ۔ اطاعت کا جذبہ اتم تھا۔ واقعہ کے بعد انسپکٹر پولیس نے کہا کہ تم دوڑ جاؤ۔ تمہارا یہاں کیا کام؟ مگر آپ نے امیر صاحب کی اجازت کے بغیر نکلنا گوارہ نہ کیا۔ اور امیر صاحب کے حکم پر ہی تین خدام کو گواہی دلوانے کے لئے تھانے لے گئے اور اس طرح خود بھی پکڑے گئے۔

صاحب رویا۔ صاحب الہام بالخصوص قید کے دوران جن کی کاپیاں لندن مشن کے پاس موجود ہیں۔

سزائے موت

محمد الیاس منیر صاحب نے بحیثیت مربی ضلع ساہیوال سے بھرپور تمونہ سے اپنی دینی خدمات کا آغاز ۱۹۸۳ء میں کیا تھا کہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو یہ واقعہ پیش آیا۔ جس کا ذکر شروع کے صفحات میں ہو چکا ہے۔ پھر ۱۵ فروری ۱۹۸۶ء کو ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر نے جیل میں آکر خود سزائے موت کا حکم سنایا اور حسب قانون اس کے خلاف نظر ثانی کی

درخواست کی گئی جسے جنرل ضیاء الحق نے

MEREY PETITION CONSIDERED AND REJECTED

لکھ کر رد کر دیا۔ مگر

مگر

خدا تعالیٰ REJECT نہ کرے تو کون ہے جو جھٹکے؟

گو کہ جیل والوں نے اس کی تعمیل کی پوری تیاری شروع کر دی اور پھر ۱۸ فروری ۱۹۸۷ء کو ہائی کورٹ نے STAY آرڈر دیا جو کہ STAY ہی رہا۔ اور بالآخر خدا کی حکمت آڑے آگئی اور دسمبر ۱۹۸۸ء کو پی۔پی۔پی گورنمنٹ نے پھانسی کو عمر قید میں بدل دیا۔ اور آج اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کی طرح مچھلی کے پیٹ میں تین سال رہ کر الیاس منیر صاحب بھی کال کوٹھڑی سے باہر آ گئے۔ گو کہ آج تک تادم تحریر وہ جیل میں ہی ہیں مگر یہ بھی ایک دیوانے کی شان ہے کیونکہ

سراست زیر تبر صادقاں مخلص را
کہ ناز ند سر قومے کہ در بلا باشد

چنانچہ

وہ سر ابھی تک سلاخوں کے پیچھے ہی دعاؤں میں مشغول ہے۔ تا وقتیکہ قوم کو ابتلاؤں سے رہائی نصیب ہو۔ خدا تعالےٰ ایسے صابر اور عظیم لوگوں کو اجر عظیم عطا کرے۔

جس رہ پر وہ کھوئے گئے اُس رہ پہ گداگر ایک کشکول لئے چلتا ہے
لب پہ یہ صدا ہے۔

خیرات کر اب اُن کی رہائی میرے آقا !!
کشکول میں بھر دے جو میرے دل میں بھرا ہے
آمین یارب العالمین

محمد الیاس منیر

ایک نظر میں

پیدائش	سری لنکا ۱۹۵۷ء
والد محترم	محمد اسماعیل منیر صاحب
استاد محترم	ماسٹر محمد ابراہیم ہیڈ ماسٹر، بشارت احمد صاحب
قرآن مجید	محترمہ والدہ صاحبہ مبارکہ نسرین صاحبہ نے پڑھایا۔
تعلیم و عہدہ	بی اے۔ واقفِ زندگی، مربی سلسلہ
قد و قامت	۴' ۵" درمیانہ جسم، ٹوپی پہنتے ہیں۔
مادری زبان	پنجابی، ربوہ میں رہائش مستقل ہے چال تیز ہے۔ دایاں قدم پہلے اُٹھاتے ہیں۔ کھانے میں گاجر کا حلوہ مرغوب تر ہے۔ دوپہر کو کم سوتے ہیں۔ رات کو اپنے تمام کام سنوار کر بستر پر جاتے ہیں۔ ڈائری سے تمام کام ترتیب دیتے ہیں
عہدہ بوقت جوانی	"خالد" کے مدیر تھے اور اہم جماعتی عہدوں پر فائز رہے
بیوی	محترمہ طاہرہ پروین
اولاد	طارق و خالد بیٹے ہیں
واقفِ عارضی	وقف عارضی میں متعدد بار حصّہ لیا۔ سرکاری امتحانات میں شمولیت پر ہمیشہ نمایاں نتیجہ ملا۔ تہجد گزار، چندہ دہندہ۔ تلاوت باقاعدہ کرتے تھے۔ جیل میں زیادہ باقاعدگی سے تلاوت کرتے ہیں۔

حضرت قریشی ناصر احمد
(اسیر راہِ مولیٰ)

دو دن پیشتر مجھے ناصر احمد قریشی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا اور دو دن بعد میں نے سنا کہ وہ انتقال فرما گئے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے اُن پیاروں کو دیکھنے کا بہت شوق تھا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ خدا تعالیٰ کی محبت میں گرفتار ہو کر کس طرح اور کیونکر وہ گرفتار بلا ہو گئے۔ اِس سے زیادہ اس جذبہ محبت الہٰی کو سمجھنے کا شوق تھا جس کے سمجھنے کے لئے کئی بار سکھر کا سفر اختیار کرنے کی کوشش کی مگر گھر والے کبھی بھی رضامند نہ ہوئے۔ بالآخر میں اُن کو خطوط لکھتی اور اپنی مرضی کے سوال پوچھتی رہی۔ ساٹھ سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ میں نے کئی بار جیل میں ارسال کیا۔ کبھی قائد خدام الاحمدیہ اور کبھی دوسرے آنے جانے والوں کے ذریعے مگر مجھے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ یہ باب تشنگی کے سپرد کر کے میں اپنے کام میں مشغول رہی۔ اور جب اسیر سکھر آزاد ہوئے تو میں نے تالپور صاحب کے ہاتھ مبارکباد و خوش آمدید ارسال کر دی۔ اور بس

ایک دن

میں حسنِ اتفاق سے گیسٹ ہاؤس کراچی اپنے ذاتی کام کے لئے گئی تو مجھے دونوں بھائی محترم رفیع احمد قریشی اور ناصر احمد قریشی مل گئے۔ کہتے ہیں کہ جذبہ سچّا ہو تو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کامیابی ہو جاتی ہے۔ یہاں میں نے ناصر احمد قریشی صاحب سے وہ تمام سوال کر ڈالے جن کا مجھے جواب درکار تھا۔ گھنٹہ پون گھنٹہ وہ مجھے جواب دیتے رہے جو میں انشاء اللہ نقشِ ثانی میں قارئین کی خدمت میں پیش کرونگی

پہلا سوال تو یہی تھا کہ میرے سوالنامہ کا جواب آپ نے کیوں نہیں دیا۔ وہ حیران ہوئے کہ یہ کیسے ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ "میں نے ۶۰ صفحات پرمشتمل جوابات بہت محنت سے مکمل کر کے آپ کو بھجوائے تھے۔ جو مجھے امید تھی کہ آپ کو مل گئے ہوں گے۔ خیر جو بھی باتیں میں نے سات سال سلاخوں کے پیچھے رہنے والے ذہن سے پوچھیں ان کے جواب سن کر میں حیرت میں گم ہو گئی۔ اور جان گئی کہ کس چیز نے ان کو لافانی اسیری عطا کی ہوئی تھی۔ اور یہ کہ وہ آج بھی ایک پیاری ہستی کی یاد میں آزاد ہو کر بھی اسیر تھے۔ وہ آنسوؤں سے رو رہے تھے جو میرے اور ان کے لئے داستانِ اسیری رقم کر رہے تھے۔

دعاؤں کی محتاج ہوں

دکھ سہے تم نے رہِ مولیٰ میں پاؤ گے فلاح
تم سے پہلے بھی فلاح والے ہوئے ذی احتشام

درخواستِ دعا و شکریہ

وہ مہربان جنہوں نے بھرپور تعاون کر کے میرے سوالنامے کے جواب دیئے اور مجھے شہداء کے حالات سے اپنی اپنی بساط کے مطابق آگاہ کیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنا قطعی واجب اور لازم ہے۔ محبت بھرے جذبات کو میں لفظوں میں کیسے ادا کروں۔ فقط جزاہم اللہ احسن الجزاء ہی سچا اظہارِ تشکر کر سکتا ہے۔ دُعا کے لئے میں ان کے اسمائے گرامی درج کرتی ہوں جنہوں نے تصدیق شدہ مواد مہیا کیا۔

۱۔ محترم ریاض احمد ناصر مربی سلسلہ ابن عبد الحکیم ایڈوو صاحب وارہ، نوابشاہ
۲۔ محترمہ آسیہ احمد صاحبہ زوجہ ڈاکٹر مظفر احمد صاحب ڈیٹرایٹ امریکہ
۳۔ محترم ڈاکٹر عامر محمود صاحب شیخ ناصر احمد صاحب اوکاڑہ
۴۔ محترم چوہدری منور احمد صاحب امیر جماعت ابن چوہدری عبد الحمید صاحب محراب پور
۵۔ محترم قریشی عبد الرحمٰن ماخوذ الفضل و انصار اللہ کے ایڈیٹر صاحبان
۶۔ محترمہ امۃ اللہ صاحبہ بنت ڈاکٹر عبد القدیر صاحب قاضی احمد نوابشاہ
۷۔ محترمہ امۃ الحفیظ شوکت صاحبہ زوجہ محترم ڈاکٹر انعام الرحمٰن صاحب سکھر حال ربوہ
۸۔ محترمہ امامہ صاحبہ ہمشیرہ محترم ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر صاحب حیدر آباد
۹۔ محترمہ عطیہ قمر صاحبہ بنت قمر الحق صاحب و ہمشیرہ محترمہ صاحبہ قمر الحق صاحب کراچی
۱۰۔ محترم طارق احمد صاحب شوہر محترمہ رخسانہ پروین صاحبہ مردان
۱۱۔ محترمہ مبارکہ صاحبہ بنت بابو عبد الغفار حال کراچی
محترمہ بشریٰ صاحبہ بنت بابو عبد الغفار حال لنڈن

۱۲۔ محترمہ فہمیدہ بیگم صاحبہ زوجہ نصیر احمد علوی صاحب نواب شاہ
۱۳۔ محترم محمد اسمعیل منیر صاحب والد محترم محمد الیاس منیر صاحب

اور سب سے زیادہ میں محترم مسعود خورشید صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے نظرِ ثانی کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور میر مبارک احمد تالپور تو ہیں ہی قابلِ احترام و شکریہ کے مستحق کہ وہ میرے کام از خود کر کے مجھے لکھنے پڑھنے کے لئے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان تمام ہستیوں کو عمر دراز سے نوازے۔ فضل حسنِ ثنار عطا کرے۔ اور قربتِ خداوندی اِن کا مقدر ہو جائے۔ آمین یارب العالمین!

حفیظۃ الرحمٰن
بیگم میر مبارک احمد تالپور

جماعت نمونے کی محتاج تھی

شہزادہ لطیف شہید نے مقتل میں شہادت سے چند ساعت قبل یہ خوشخبری دی تھی کہ
"میں بعد قتل چھ روز تک پھر زندہ ہو جاؤں گا۔"

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ "یہ قول وحی کی بنا پر ہو گا جو اس وقت ہوئی ہو گی کیونکہ اس وقت شہید مرحوم منقطعین میں داخل ہو چکا تھا اور فرشتے اس سے مصافحہ کرتے تھے۔ تب فرشتوں سے یہ خبر پاکر ایسا اُس نے کہا۔ اور اس قول کے یہ معنی تھے۔ کہ وہ زندگی جو اولیاء اور ابدال کو دی جاتی ہے چھ روز تک مجھے مل جائیگی۔ اور قبل اس کے جو خدا کا دن آوے یعنے ساتواں دن میں زندہ ہو جاؤں گا۔ اور یاد رہے کہ اولیاء اللہ اور وہ خاص لوگ جو خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں۔ وہ چند دنوں کے بعد پھر زندہ کئے جاتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء یعنے تم ان کو مردے مت خیال کرو جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں وہ تو زندے ہیں پس شہید مرحوم کا اسی مقام کی طرف اشارہ تھا۔ اور میں نے ایک کشفی نظر میں دیکھا۔ کہ ایک درخت سرو کی ایک بڑی لمبی شاخ .... جو نہایت خوبصورت اور سرسبز تھی ہمارے باغ میں سے کاٹی گئی ہے اور وہ ایک شخص کے ہاتھ میں ہے تو کسی نے کہا کہ اس شاخ کو اس زمین میں جو میرے مکان کے قریب ہے۔ اُس بیری کے پاس لگا دو جو اس سے پہلے کاٹی گئی تھی اور پھر دوبارہ اُگے گی اور ساتھ ہی مجھے یہ وحی ہوئی کہ کابل سے کاٹا گیا اور سیدھا ہماری طرف آیا۔ اسکی میں نے یہ تعبیر کی کہ تخم کی طرح شہید مرحوم کا خون زمین پر پڑا ہے۔ اور وہ بہت بارور ہو کر جماعت کو بڑھا دیگا۔ اس طرف میں نے یہ خواب دیکھی اور اس طرف شہید مرحوم نے کہا کہ چھ روز تک میں زندہ کیا جاؤں گا۔ میری خواب اور شہید مرحوم کے اس قول کا مآل ایک ہی ہے۔ شہید مرحوم نے مرکر میری جماعت کو ایک نمونہ دیا ہے۔ اور درحقیقت میری جماعت ایک بڑے نمونہ کی محتاج تھی۔" (تذکرۃ الشہادتین صہ ۵۷)

جو مر گئے انہیں کے نصیبوں میں ہے حیات
اِس راہ میں زندگی نہیں ملتی بجز ممات
جو خاک میں ملے اُسے ملتا ہے آشنا
اے آزمانے والے یہ نسخہ بھی آزما

(حضرت مسیح موعود)

میری چند تصنیفات جو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے مطابق اپنے لوگوں کی نذر کر چکی ہوں۔

۱۔ تخلیق الاوّل

۲۔ قرۃ العین

۳۔ دستک

۴۔ کلمہ توحید کا سفر

۵۔ محبوبات

۶۔ ازالۃ القید

۷۔ نگینے لوگ

چند صداقتیں

سر سے لے کر پاؤں تک وہ یار مجھ میں ہے نہاں
اے میرے بدخواہ کرنا ہوش کر کے مجھ پہ وار

(درِّ ثمین)

شہیدانِ محبّت سے ہی میخانے کی رونق ہے
چھلکتا ہے ترے پیمانہ میں ان کا ہی خوں ساقی

(کلام محمود)

آقا تمہارے باغ میں داخل ہوئے عدو
گلزار احمدی کے نہالوں کو ستا گئے
جائے گرفت ہاتھ نہ آئی تو بے سبب
دھبّہ لگا کے نیک خصالوں کو لے گئے

(درِّ عدن)